

آتش زاد



ناصر مملک

آگ چولھے میں بھڑکتی ہے تو شکم کی بھڑکتی ہوئی آگ کو نگل لیتی ہے۔ چولھے سے نکل کر جہنم تک کے سفر میں آگ کا نظارہ کرنے والوں کو بھی جلاتی جاتی ہے۔ بے وفا ہوتی ہے۔ آگ لگانے والے کو بھی معاف نہیں کرتی۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں زردی مائل عکس بن کر ٹھہر جاتی ہے۔ اُس کی آنکھیں بھی آئینہ بنی ہوئی تھیں۔ تاجہ نگاہ پھیلے ہوئے دھوئیں سے جھانکتے ہوئے شعلوں کو بہ آسانی اُس کی آنکھوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ بلند آواز میں قہقہے لگا رہا تھا۔ اُس کے ساتھی بندوقیں لہراتے ہوئے اُس کی ہنسیانی خوشی میں شریک تھے۔

اچانک اُس کا قہقہوں کی وحشیانہ تال پر کھلتا بند ہوتا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ دھوئیں میں اُسے کچے گھر کے شعلوں میں سے سفید لباس میں ملبوس ایک جوان سال عورت اپنے چہرہ سات سالہ بچے کو گھسیٹتے ہوئے باہر گلی میں نکلی۔ دونوں کی آنکھوں سے موت کا خوف جھلک رہا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ یقین نہ آیا۔ آنکھوں کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سہلا کر دیکھا۔ منظر جوں کا توں رہا۔ عورت اُس سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ کر ساکت ہو گئی۔ اُس کا معصوم بچہ بھی قدم روکے کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے چلتی ہوئی ڈسک کو ریوٹ کے ذریعے باز کر دیا گیا ہو۔ اُس کے ساتھی اُس کی حالت سے بے خبر جشن آتشزدگی منا رہے تھے۔ وہ گن زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ زور سے آنکھیں میچتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا ہوا؟ میں نے تو پالتو بکریوں تک کو گھر سے نکال کر آگ لگائی تھی۔ یہ دونوں کہاں سے نکل آئے؟“

عورت کا ساکت وجود متحرک ہوا۔ اُس پر انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”ساری عمر چولھے میں آگ دہکا کر میں تین نسلوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ تمہاری دہکائی ہوئی آگ نے تین نسلوں کے بنائے ہوئے گھونسلے کو آن کی آن میں بھسم کر کے رکھ دیا ہے۔“

یکبارگی اُس کا گن کے دستے پر نکا ہوا وجود لرز اٹھا۔ یہ آواز اُس کیلئے اجنبی نہیں تھی۔ سر جھٹک کر سوچنے لگا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جسے اپنے ہاتھوں سے زمین میں برسوں قبل دفن کیا تھا، وہ کیسے لہاس آگ میں سے نکل کر سامنے آ سکتی ہے؟“

اندھیرے میں آدھے میل کے فاصلے پر واقع کچی بستی سے اس ڈیرے تک آنے والے راستے پر لوگوں کے بھاگنے دوڑنے اور شور مچانے کی صدا کیں گونج اٹھیں۔ اُس کے ایک ساتھی نے چیخ کر کہا۔ ”گاڑی میں بیٹھو اور نکل چلو۔ بستی والے آگ بجھانے کیلئے آرہے ہیں۔“

لطف کشیدگی کا کھوکھلا مگر نہایت سفاکانہ جشن رک گیا۔ سب بھاگ کر ڈبل کیمبن ڈالے میں بیٹھ گئے۔ بشیر خان نے کوئی وقت ضائع کئے بغیر یوٹرن لیتے ہوئے بستی کی مخالف سمت میں گاڑی دوڑا دی۔

اُس نے بے ساختگی سے ادھر دیکھا جہاں چند لمحے پہلے سفید پیر، بن میں ملبوس عورت اپنے بچے کے ساتھ کھڑی تھی۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ادھر ادھر نظر دوڑانے سے بھی وہ نظر نہیں آئی تو سوچنے لگا کہ اُسے زمین کھا گئی، آگ نکل گئی یا آسمان نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک طویل سانس لے کر وہ گردن موڑ کر بستی کی طرف دیکھنے لگا۔ لوگ جلتے ہوئے گھر کے قریب پہنچنے والے تھے۔ وہ نہایت سفاکی سے زیر لب مسکرانے لگا۔ آگ بجھانے کیلئے آنے والوں کے ہاتھ خالی تھے۔ خالی ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے نہ تو دریا کے سامنے بند باندھا جاسکتا ہے اور نہ ہی آگ کی طوفانی لپٹوں کو روکا جاسکتا ہے۔

اونچے نیچے نیم پختہ راستے پر فوراً ہیل ڈالا غیر معمولی رفتار سے دوڑتا ہوا مین روڈ پر چڑھ گیا۔ رفتار میں بے حد تیزی آ گئی۔ دس منٹ کے بعد پھر ایک لنک روڈ پر مڑ گیا۔ اُس کی منزل دریائی کنارے والے کچے علاقے میں واقع سردار فضل خان کی متروک حویلی تھی۔

نصف گھنٹے بعد وہ بانچوں بڑے پائیوں والی چارپائیوں پر ٹانگیں پسار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ بشیر خان نے مونچھوں کو تیل دیتے ہوئے کہا۔ ”عالمگیر! کیا خیال ہے لوگوں نے آگ پر قابو پا لیا ہوگا؟“

وہ دائیں سائیڈ پاکیٹ سے مہنگے برائڈ کی سگریٹ نکالتے ہوئے بولا۔ ”حکومت کی چولی میں آگ لگ جائے تو مہینوں بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ غریب کے جھوپڑے کی آگ

کیسے ایک رات میں بجھ سکتی ہے۔“

لائین کی روشنی کے پیدا کردہ ملگجے ماحول میں بے ساختہ ستائشی قہقہہ ابل پڑا۔ عالمگیر ایسی باتیں ہی کرتا تھا۔ سمجھ میں آتی تھیں تو سمجھ جاتی رہتی تھی۔ سر کے اوپر سے گزرتیں تو سر سلامت نہیں رہتا تھا۔

بشیر خان نے اُس کے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”گولی چلانے اور تیلی جلانے تک تم بہت دلیر ہوتے ہو۔ موت اور شعلوں کو دیکھ کر پسینے میں بھیک جاتے ہو۔ تین سالوں میں تمہیں سمجھ نہیں پایا۔ کیا ہو تم؟“

وہ زیر لب مسکرانے لگا۔ گہرا کش لے کر بولا۔ ”بشیر خان! اس بات کی سمجھ مجھے آج تک نہیں آئی، تمہیں خاک سمجھا سکوں گا۔“

فقیر محمد چائے پکا لایا۔ بڑے بڑے پیالوں میں ڈال کر ایک ایک کے ہاتھ میں تھمانے لگا۔ عالمگیر کو سب سے پہلے سرو کیا جاتا تھا۔ چائے کا پیالہ پکڑ کر سوچ میں پڑ گیا۔ ”میرے ایک ہاتھ میں سگریٹ ہے جو انگلیوں میں دبک کر سینے میں دھواں بھرتی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں چائے ہے۔ آگ پر پک کر کوزے میں بند ہو کر منہ تک آتی ہے اور جہنم جیسے پیٹ میں اتر جاتی ہے۔ اٹھائیس برسوں سے میرے اندر باہر، ہر سو، آگ ہی آگ ہے۔ آگ پر بدن جلتا ہے، روح جل کیوں نہیں جاتی؟“

وہ چائے پی نہیں رہا تھا۔ پیالے میں سانس کی زنجیر پر چائے ننھے ننھے ہلکورے لے رہی تھی۔ چائے پر مرکوز اُس کی نظر بھی لرز رہی تھی۔ بشیر خان بغور اُسے دیکھ رہا تھا۔ لمبا گھونٹ بھر کر بولا۔ ”عالمگیر! تمہاری زندگی میں کوئی عورت بھی آئی ہے؟“

وہ چونک کر بولا۔ ”نہیں تو.....“

”پھر ایسے گم کیوں ہو جایا کرتے ہو؟“ بشیر خان نے پوچھا۔ ”تمہارا دنیا میں کوئی نہیں، کسی عورت نے تمہیں چاہا نہیں اور نہ ہی تم نے کسی کو چاہا ہے۔ پھر؟ تمہاری نظر ٹھہر کیوں جاتی ہے؟“

وہ طویل سانس لے کر چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ حلق میں اتارنے لگا۔ بشیر خان کو جواب نہیں ملا، کبھی بھی نہیں ملا تھا۔ خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی کہ اگر اُس نے اُس کے ہاتھوں کے کرتب دیکھ نہ رکھے ہوتے تو کبھی یقین

نہ کرتا کہ وہ غیر معمولی اور ناقابل یقین حد تک سرچ، پر تشدد اور سفاک زندگی گزار رہا ہے۔ شبر علی نے ٹوٹی ہوئی تاروں کے ٹانگے جوڑ کر اپنا ایف ایم بیڈ والا ریڈیو آن کر لیا تھا۔ کمرے کے پُر ہیبت سکوت میں کسی خوش گلو فنکارہ کا پُر انجام عشق گیت بن کر گونجنے لگا۔ یوں لگا جیسے ریل گاڑی کی چھک چھک میں کوئی نوزائیدہ بچہ ہمک ہمک کر رونے لگ گیا ہو۔ عالمگیر چونک کر گیت کی طرف متوجہ ہوا۔ دل میں سوچنے لگا۔ ”گولیوں کی سماعت شکن جھنکار زندگی پر چھائی ہوئی ہے۔ دل پھر بھی کہیں نہ کہیں نرمی کی راہیں تلاش کر لیتا ہے۔ گانے والی جس تعلق کا رونارور رہی ہے، وہ تعلق تو میری زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں۔ پھر کیوں اس رام کہانی کو سنتے رہنے کو جی کرتا ہے؟“

لحافوں میں دُک کر رات گزارنے والوں کے بے ہنگم خزانے کمرے میں گونجنے لگے۔ اُس نے لیتے ہوئے باری باری سب پر نگاہ ڈالی۔ وہ سب تھکاوٹ کی وجہ سے آن کی آن میں سو چکے تھے۔ وہ بھی لیٹ گیا مگر سونہ سکا۔ لالٹین کے لرزتے ہوئے ننھے سے شعلے نے میز پر پڑے پانی کے گلاس کا سایہ دیوار پر بنا رکھا تھا۔ سایہ سینے کی طرح لگی بندھی رفتار سے بڑھ گھٹ رہا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ صبح ہونے پر اس سائے نے مرجانا تھا۔ گھٹنا بڑھتا دل معدوم ہو جانا تھا۔ اس کی طرح اُس نے بھی ایک نہ ایک دن بچھ جانا تھا۔ کیا زندگی اسی کا نام ہے؟

نیند نہ آنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ چار پائی کا سرہانے والا حصہ نیچا تھا اور پانکٹی نسبتاً اونچی تھی۔ وہ اٹھ کر پانکٹی کی طرف سر کر کے لیٹ گیا۔ اب لالٹین اُس کی نظروں کے سامنے تھی۔ وہ شعلے کو گھٹنا بڑھتا دیکھنے لگا۔ اچانک ننھا سا شعلہ بڑھنے لگا۔ بڑھتے بڑھتے قد آدم سے بھی نکلتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ وہ ایک ٹک اُسے دیکھتا رہا۔

شعلے کے سرخ حصے میں سفید کپڑے پہنے وہی عورت نظر آنے لگی جسے وہ آغاز شب کی واردات کے دوران دیکھ چکا تھا۔ اب اُس کے ساتھ اُس کا بچہ نہیں تھا۔ وہ اُسے مخاطب کر کے بولی۔ ”اے قاتل ٹولے کے سردار! بتلا کیا میں نے تمہارا نام عالمگیر رکھا تھا؟“

وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ”نہیں۔ میرا نام پہلے علم دین تھا، اب عالمگیر ہے۔“ وہ خنگی بھری نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ ”میں نے تمہیں جن کر علم دین بناتے ہوئے سوچا تھا کہ تم دین کے علم کا چراغ لے کر دنیا میں نکلو گے تو دنیا امن و آشتی کا گہوارہ بن

جائے گی۔ تم نے عالمگیر بن کر میرے ارادوں کی توہین کیوں کی؟“ وہ بولا۔ ”مجھے علم دین کا نام دیتے ہوئے تم بھول گئی تھیں کہ چراغ آگ کی ننھی سی لو دیتا ہے۔ زمانہ ہوا دے کر ننھی سی لو کو شعلوں میں بدل دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اب شعلے میرے وجود سے نکل کر دنیا کو جلانے لگے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ شعلے میں کھڑی عورت کا چہرہ دھندلایا ہوا تھا۔ پچپانی نہیں جاتی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ وہ کون تھی؟ وہ اُسے جننے والی رَجوتھی، اُس کی ماں تھی۔ اُس کے لبوں سے سسکی کی طرح ماں کا لفظ نکلتا تو وہ ناگن کی طرح بل کھا گئی۔ پھنکارتے ہوئے بولی۔ ”تف ہو تم پر! تمہیں بیٹا کہتے ہوئے میری زبان ناپاک ہو جاتی ہے۔ تمہیں جس آگ سے بچانے کیلئے میں زندگی بھر انگاروں پر چلتی رہی، تم نے اُسی آگ کا بازار گرم کر رکھا ہے۔“

وہ صفائی میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کھڑکی سے داخل ہونے والے ہوا کے خنک جھونکے نے لالٹین کی لو کو بجھا دیا۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ اندھیروں میں رہنے والا سکھی رہتا ہے۔ وہ بھی چند منٹوں میں ہی سکھی ہو کر دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔

صبح دیر سے اٹھا۔ شبر علی بارہ دولٹ کی بیٹری پر کنورٹر لگائے سارے موبائل فون چارج کر رہا تھا۔ اُس نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”شبر! سردار کا فون تو نہیں آیا؟“ وہ فنی میں سر ہلا کر اپنے کام میں رُجھ گیا۔

وہ چار پائی سے اٹھ کر صحن میں چلا گیا۔ منہ اندھیرے اٹھ کر ورزش کرنے کا عادی تھا۔ رات دیر سے سونے کی وجہ سے دیر سے اٹھا تھا جس کی وجہ سے آج کسرت نہیں کر سکا تھا۔ جسم پر کسکند سی سوار تھی۔ موڑھے پر بیٹھ کر دھوپ سینکنے لگا۔ بشیر خان چولھے پر دیگچی پڑھائے بیٹھا بلند سروں میں کوئی بھونڈا سا گیت گنگنا رہا تھا۔ ایسے میں شبر علی نے اُسے موبائل تھماتے ہوئے کہا۔ ”لومیرے قصائی سے بات کرو۔“

وہ موبائل فون کان سے لگا کر بولا۔ ”بول میرے جگر کے ٹکڑے! کیا کہنا چاہتا ہے؟“ دوسری جانب کی بات سننے کے بعد ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ”یار! تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ اور ہاں! یہ دھیان میں رکھنا کہ سردار یا ملک فرید کو تمہاری میری ساز باز کا پتہ نہ چلے ورنہ کیا دھرا خاک میں مل جائے گا۔“

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اُس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ بشیر خان متفکرانہ انداز میں

تھے۔ پورے علاقے میں کشت و خون کا دریا بہاتے ہوئے انہیں کوئی خوف لاحق نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سردار فضل خان اولاً تو ان پر کوئی مقدمہ درج ہونے ہی نہیں دے گا۔ اگر کسی نے گستاخی کرتے ہوئے اعلیٰ افسران تک رپورٹ پہنچا بھی دی تو وہ خود سنبھال لے گا۔ اُس کی اوپر تک پہنچتی تھی۔ اپنے اقتدار کی لمبی بانہوں کو مضبوط رکھنے کیلئے وہ اپنے ہاتھوں پیروں کو بھی محفوظ کر لیتے تھے۔ اوپر والے اس حقیقت سے روشناس تھے کہ اُن کے تخت سے جڑے کارندوں کو زندہ رہنے کیلئے مسلسل تنور دھکائے رکھنا پڑتا ہے۔ چند انگارے اُن کے دامن تک بھی پہنچ جاتے تھے جنہیں وہ بے نیازی سے جھٹک دیتے تھے۔

شوکت علی نور پور بستی کا چھوٹا زمیندار تھا۔ بد قسمتی سے اُس کی زمین بربل سڑک واقع ہونے کے ساتھ ساتھ بستی کے زرعی رقبے میں دل کی حیثیت رکھتی تھی۔ بہت زرخیز مانی جاتی تھی۔ سردار فضل خان نے اُس سے زمین خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر دست بستہ عرض کیا۔ ”سردار جی! شمال سے جنوب تک آپ کی زمینیں پھیلی ہوئی ہیں۔ میرے چھ ایکڑ خریدنے سے کیا فرق پڑے گا۔ ہم غریب لوگ ہی آپ کی سرداری قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ہم نہ رہے تو خالی رقبے قبرستان کی طرح دکھائی دیے لگیں گے۔ مُردے قبروں سے نکل کر ہاتھ باندھ کر حضور کے دربار میں سلامی نہیں دیتے۔“

سردار کو بات بہت بری لگی۔ بدقت تمام خود پر قابو پا کر رعونت سے بولا۔ ”میں وہاں پٹرول پمپ لگانا چاہتا ہوں۔ نور پور کیلئے ایک خوبصورت مارکیٹ تعمیر کرانا چاہتا ہوں۔ اس میں تم لوگوں کا ہی فائدہ ہے۔ روزگار بن جائے گا، بستی خوبصورت دکھائی دے گی۔“

وہ سر جھکا کر بولا۔ ”پُر ہم کہاں جائیں گے سردار جی؟“

اُس کا کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”ہمیں نکال کر گاؤں کو جنت بنانے والے! ہمیں تمہاری جنت کا کیا فائدہ پہنچے گا؟“

سردار نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے رقبے پر آ جاؤ۔ چھ کی بجائے دس ایکڑ کاشت کرو۔“

شوکت علی اچھی طرح جانتا تھا کہ اپنی زمین چھوڑ کر سردار کی زمین پر مزارع بن کر جانے میں کیا قباحیت ہے۔ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں سردار! سڑک کی دوسری سمت آپ کا مریعوں رقبہ پڑا ہے۔ مارکیٹ اور پٹرول پمپ اُس جانب بنالیں۔ میں اپنی زمین بیچنا

اُسے دیکھ رہا تھا۔ چائے پیالیوں میں اٹل پلتے ہوئے بولا۔ ”تم ہر بار سردار کو چکر دے جاتے ہو۔ ہر بار پانی ایک رخ پر کٹاؤ کرنے لگے تو لوگ بند باندھ کر اُس کا راستہ کاٹ دیتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ ہمارا پتہ کاٹ دیا جائے۔“

وہ مصنوعی بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”زندگی پہلے ہی خنجر کی تیز دھار پر چلتے گزر رہی ہے۔ یہ تو ایک نہ ایک دن ہوتا ہی ہے کہ ایک ٹانگ ادھر، دوسری ادھر اور ہمارا کام تمام..... بشیر خان! پھر ڈرنا کیسا؟“

”کتے چوروں سے یارا نہ گانٹھ لیں تو مالک زہر آلود روٹی کھلا کر مار دیتا ہے۔“ بشیر خان نے اُسے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ ”کتنی بار ایسا ہوگا کہ ہم سردار کو دھوکہ دے کر غریبوں کو جان بچا کر بھاگنے کا موقع دے سکیں گے۔ اک نہ اک دن پردہ اٹھ جائے گا۔ پھر ہم اٹھ جائیں گے یا ہمارا دانہ پانی یہاں سے اٹھ جائے گا۔“

وہ بولا۔ ”اندیشوں میں مبتلا ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم پر کوئی آج نہیں آنے دوں گا۔ تمہیں سردار کوئی الزام نہیں دے سکے گا۔“

باوجود تسلی دینے کے بشیر خان متردد دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”تمہیں کیا ضرورت پڑی تھی انہیں بھاگنے کا موقع دینے کی۔ اگر سردار کو پتہ چل گیا تو وہ ہمیں الٹا لٹکوا دے گا۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”کیا کر سکتا ہے وہ؟ اس کے کہنے پر ہمارے علاوہ کوئی بھی خون کے کھیل میں ہاتھ ڈالنے والا نہیں ہے۔ ہم سے بگاڑ کر وہ چند قدم اکڑ کر چلنے کے قابل نہیں رہے گا۔“

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ سردار فضل خان مقامی سیاست کا اڑیل گھوڑا تھا۔ اُس پر شرطیں باندھنے والے پہلے سے طے کر لیتے تھے کہ اُن کا گھوڑا ریس جیت کر مالا مال کر دے گا۔ اب تک صوبائی اسمبلی کا کوئی بھی الیکشن نہیں ہارا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ جیتنے کیلئے ہی پیدا ہوا ہے۔ لاکھوں کروڑوں روپے انتخابی موسم میں بوکر آربوں کی فصل کاٹا تھا۔ حالیہ انتخابات میں اُس کے مد مقابل کسی نے کھڑے ہونے کی جرأت ہی نہیں کی تھی۔ اُس کے کروڑوں روپے بچ گئے تھے۔ فصل تازہ دم رفتار سے پھل پھول رہی تھی۔

اُس کی طاقت کا سرچشمہ عالمگیر تھا۔ عالمگیر کی ماتحتی میں پلنے والے قتل و ڈکیتی کے سز یافتہ مجرم جیلیں توڑ کر سردار فضل خان کے حریفوں کی ٹانگیں توڑنے میں مصروف رہتے

”نہیں چاہتا۔“

اپنی عادت کے مطابق سردار سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ سر ہلا کر بولا۔ ”اچھا شوکت! جیسے تمہاری مرضی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ تمہارا فائدہ بھی ہو جائے اور بستی کا بھی۔ مگر سیا نے سچ کہہ گئے ہیں کہ پیٹ کی طرح بھگے کا سر بھی خالی ہوتا ہے۔“

وہ سردار کی بڑی حویلی سے سر جھکائے نکلا۔ متفکر تھا۔ اُسے بخوبی احساس تھا کہ معاملہ ختم نہیں ہوا بلکہ شروع ہوا ہے۔ ہر آدمی کی طرح اُسے بھی علم تھا کہ سردار بہت متمم مزاج اور خالم شخص ہے۔ اُس کی کینہ دہی کی وجہ سے کوئی بھی اُس کے سامنے کھڑا ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ گھر پہنچ کر بیوی سے مخاطب ہوا۔ ”زرینہ! لگتا ہے کہ نور پور سے ہمارا دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔ سردار کی نظروں میں ہماری زمین رڑکنے لگی ہے۔ آج یا کل، اس فصل پر یا اگلی پر..... ہمیں یہاں سے کوچ کرنا ہوگا۔“

”پڑ ہم کہاں جائیں گے؟“

دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اُن کے تین بچے تھے۔ دونوں بیٹے سکول میں ساتویں اور پانچویں کلاسوں میں پڑھتے تھے۔ بیٹی اُن سے بڑی تھی۔ پانچ جماعتیں پاس کر کے گھر میں بیٹھادی گئی تھی۔ بستی میں لڑکیوں کیلئے مڈل سکول نہیں تھا۔ بچے بھی متفکر ہو گئے۔

سردار نے عالمگیر کو شوکت کی زمین حاصل کرنے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”ایک ماہ کا وقت ہے۔ اگلے مہینے میں وہاں پر تعمیر شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ سمجھ گئے ہونا؟“

وہ سردار کے بولنے سے پہلے ہی سمجھ جایا کرتا تھا۔ گزشتہ کئی سالوں سے اُس کی انگلیوں پر ناچتا آ رہا تھا۔ کس انگلی کی کس حرکت پر اُسے کیا کرنا تھا؟..... بخوبی جانتا تھا۔ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تم فکر نہ کرو سردار! شوکت علی کے اچھے کیا، بُرے بھی زمین بیچنے پر تیار ہو جائیں گے۔“

آنے والے جمعہ کے دن چار بجے کے قریب وہ شوکت علی کے گھر میں بیٹھا اُسے سمجھا رہا تھا۔ ”دیکھ شوکت علی! زندگی ایسی چیز نہیں ہے جسے کسی ضد یا اکڑ کی نذر کر دیا جائے۔ زمین کیلئے لڑنا دین کیلئے لڑنے کے برابر نہیں ہے۔ تم ضد چھوڑ دو اور زمین سردار کے ہاتھ بیچ دو۔“

وہ بولا۔ ”مجھے علم ہے کہ میں اُس کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا۔ مگر کیا کروں؟ جتنے

پیسے وہ لگاتا ہے اتنے میں تو مجھے تین ایکڑ رقبہ بھی نہیں مل سکے گا۔ اُسے سمجھاؤ کہ مارکیٹ ریٹ پر خریدے، میں بیچتا ہوں۔“

”میرے سمجھانے سے وہ الو کا پٹھا نہیں سمجھے گا۔“ عالمگیر نے کہا۔ ”میں اُس کا حکم ماننے پر مجبور ہوں۔ تمہیں میری گن مجبور کر دے گی۔ پھر؟“

وہ لاچارگی سے بولا۔ ”تو کیا میں بچوں کو بھوکا مارنے کیلئے خود کو تیار کر لوں؟“

”ایسی بات نہیں ہے شیر علی!“ وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”ابھی کسی کو اس بات کا علم نہیں۔ تم ایسا کرو کہ ملک غلام فرید کے ہاتھ پر آندرو آندری رقیہ فروخت کر دو۔ میرے پاس ایک ماہ کا وقت ہے۔ اس دوران تم مارکیٹ کے بھاؤ پر رقم حاصل کر کے یہاں سے نکل سکتے ہو۔ ملک سے سردار فضل خان نکل نہیں لینا چاہے گا۔ تم بڑی آسانی سے اس علاقے سے بہت دور نکل کر محفوظ ہو جاؤ گے۔“

شوکت علی سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سردار اُس سے مفت رقبہ تھیاتا چاہتا تھا، اُس کا کتا اُسے جان بچانے اور رقبہ ملک کے ہاتھوں بیچ کر نکلنے کا مشورہ دیتا تھا۔ یہ کیا معاملہ تھا؟ پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ”جو تم کہہ رہے ہو وہ کہاں تک قابل عمل ہے؟..... میں ملک فرید کے پاس پہنچوں گا، اس سے پہلے ہی خبر سردار تک پہنچ جائے گی۔ میرے گھر واپس آنے سے پہلے ہی تم یہاں پہنچ کر بندو قوں کے منہ کھول دو گے۔ سچ بتاؤ۔ یار بن کر پیٹھ میں وار کرنے آئے ہو؟“

وہ مسکرانے لگا۔ شوکت علی کا رویہ اُس کیلئے غیر متوقع نہیں تھا۔ منہ نزدیک کر کے بولا۔ ”شوکت! یہ کام میں اب بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک آپشن دیتا ہوں۔ مزیدے قصائی سے کسی کی نظر میں آئے بغیر ملو۔ اُسے ساری صورت حال بتلاتے ہوئے رازداری کی شرط پر ملک فرید سے بات کرنے کا کہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟ مزید اقصائی اُس کا خاص بندہ ہے۔ وہ کسی کے علم میں لائے بغیر تمہارا سودا کر وادے گا۔ چوری چھپے بیان بھی ہو جائیں گے اور تمہارے یہاں سے بھاگ نکلنے کے بعد وہ قبضہ بھی لے لے گا۔“

وہ سمجھا تھا یا نہیں..... اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ پا کر رضامند ہو گیا۔ عالمگیر اُس کے ہاتھ پر سنہری ٹوکن رکھ آیا تھا۔ اب اُس پر موقوف تھا کہ وہ کاؤنٹر پر جا کر ٹوکن کیش کراتا تھا

یاد امن جھاڑ کر بینک سے باہر نکل آتا تھا۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر منیر نے قصائی سے رابطہ کرنے لگا۔ نصف گھنٹے بعد رابطہ ہوا۔ بولا۔ ”یار منیر! تمہارے پاس شوکت علی آئے گا۔ وہی شوکت علی جس کے بیٹے نے پانچویں میں وظیفہ لیا تھا۔ اُس کا کام رازداری سے کروادینا۔“

منیر نے کی بات سننے کے بعد ہنسنے لگا۔ ”ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ سردار کے ہاتھ کو پھر کھلی ہوئی ہے۔ کھلی کرتے ہوئے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ہتھیلی پر کوئی چھر، کوئی کبھی تو نہیں بیٹھی۔ اپنی کھلی میں اُن کی جان لے لیتا ہے۔“

منیر نے حامی بھری تو وہ مطمئن ہو کر گنگنا نے لگا۔

منیر ملک غلام فرید کا خاص بندہ تھا۔ دلیر آدمی تھا۔ اُسی کی وجہ سے کبھی سردار نے ملک پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ جہاں ملک اُس کی ہر بات آنکھیں بند کر کے مان لیتا تھا وہاں منیر ابھی وفاداری میں حد سے گزر جاتا تھا۔ وہ عالمگیر سے یاری کا دعویٰ رکھتا تھا۔ کبھی اُس کی مان لیتا، کبھی اپنی منوا کر فائدہ اٹھا لیتا تھا۔ دریا میں رہنے والے دونوں مگر چھوٹوں نے ایک دوسرے سے مفاہمت کر لی تھی۔ ملک فرید کی کوشی بستی کے عین وسط میں واقع تھی۔ وہ سیاست میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ غریب پرورد آدمی تھا مگر اُسے شدت سے یہ احساس تھا کہ کسی مار دھاڑ والے بندے کے بغیر اُس کا سردار فضل خان کے علاقے میں رہنا محال ہے۔ چونکہ وہ سردار کا سیاسی حریف نہیں تھا اور نہ ہی اُس کے معاملے میں ٹانگ اڑاتا تھا، اس لئے آج تک دونوں کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ ملک فرید کا ایک بیٹا سول جج تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس کے بیٹے ملک امجد فرید کے وسیع اختیارات سے سردار خائف رہتا ہو۔ بہر حال جو وجہ بھی رہی ہو، وہ ملک فرید سے دشمنی لینا پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ عالمگیر کے سامنے اُس نے کبھی اپنی اس کمزوری کا اعتراف نہیں کیا تھا۔

تین چار دنوں کے بعد وہ نور پور کی طرف نکلا۔ آج بشیر خان بھی اُس کے ساتھ تھا۔ توقع کے مطابق شوکت علی گھر پر مل گیا۔ اُس نے پوچھا۔ ”سناؤ بھی شوکت میاں! کہاں تک پہنچے ہو؟“

شوکت نے ہاتھ میں حقہ تھام رکھا تھا۔ لباش لے کر بولا۔ ”میرے رقبے اور مکان کی قیمت تیرہ لاکھ سے کچھ اوپر نیچے بنتی ہے۔ وہ گیارہ لاکھ دے رہا ہے۔ سوچتا ہوں کہ مجھے

سودا کر لینا چاہیے۔“

بشیر خان نے دبے لفظوں میں کہا۔ ”اتنی آدمی! دیکھتا کیا ہے؟ پیسے پکڑ اور یہاں سے بھاگنے کی سوچ۔ سردار کو پتہ چل گیا تو مفت میں زمین گنوا بیٹھو گے۔“

وہ دونوں کی خوشامد کرنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے واسطے دیتے ہوئے دعائیں دینے لگا۔

آنے والے ہفتے میں شوکت علی کو رقم مل گئی۔ چپکے سے حلقے کے ریونیو آفیسر کو گھر میں بلوا کر ملک فرید نے بیان حاصل کر لئے اور اُسے فارغ کرتے ہوئے کہا۔ ”لے بھائی شوکت! تیری جان تو گئی چھوٹ۔ اب دعا کرنا کہ میں اُس مگر مجھ کے جبروں میں آنے سے بچا رہوں۔“

وہ سر نہ ہواڑائے بستی کی گلیوں میں کبیدہ خاطر چلتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ بیوی اور بچوں کو رازداری سے سامان باندھنے کا حکم دیا اور خود کمرے میں چھپ کر رونے لگا۔ اس گاؤں میں زندگی گزری تھی۔ رشتہ داری کا سائیکل گاؤں والوں کے ساتھ پیدا ہو چکا تھا۔ چوروں کی طرح بنا کسی جرم کے رات کے اندھیرے میں بھاگنے پر کبیدہ خاطر تھا۔ سامان سمیٹ چکا تو عالمگیر کا خیال آیا۔ برسوں سردار فضل خان کو وٹ نہ دینے کے ارادے کا اعادہ کرنے والے اُس کی ایک جھلک دیکھ کر صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے تھے۔ پورا گاؤں اُسے ظالم کہتا تھا۔ عجیب ظالم تھا کہ اُسے جان بچا کر بھاگنے کا موقع دے گیا تھا۔ سیانے بچ کہتے ہیں کہ انسانی دماغ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ مشین کی مانند نہیں ہے کہ ایک ہی رفتار سے ایک ہی جانب چلتا رہے۔ یہ کبھی کبھی الٹی چال بھی چلنے لگتا ہے۔

عالمگیر نے اگلے دس دن تک مختلف کہانیوں کے ذریعے سردار کو ٹالا۔ سردار کا صبر جواب دے گیا تو گرم ہو کر بولا۔ ”عالمگیر! مجھ سے اتنا صبر نہیں ہوتا۔ تم ہر روز مجھے نئی کہانی سنانے کیلئے آ جاتے ہو۔ مجھے دو دنوں کے اندر اندر رقبے کا قبضہ ملنا چاہیے ورنہ تمہاری خیر نہیں ہے۔“

بشیر خان بھی اُس کے ساتھ ہی تھا۔ خوشامد نہ لہجے میں بولا۔ ”سردار جی! غصے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کل ہی جا کر اُس کا سر کچل دیں گے۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری!“

سردار کا پارہ بدستور چڑھا رہا۔ دونوں بڑی حویلی سے نکل کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ بشیر خان بولا۔ ”عالگیر! پھر بے وجہ مروادیا تم نے۔ اب کے سردار معاف کرنے والا نہیں ہے۔“

وہ بھی فکر مند ہو گیا۔ حویلی سے سیدھا شوکت علی کے گھر پہنچا۔ اُسے سامان باندھتے دیکھ کر غصے سے بولا۔ ”تمہیں ان کچے بھروں کی پڑی ہے۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ جتنا جلد ہو سکے، یہاں سے نکل بھاگو۔ اب تمہیں یہ کہنے کیلئے آیا ہوں کہ آج رات کو یہاں سے نکل جاؤ ورنہ پھر کبھی بھی مجھے الزام نہ دینا۔“

اُس کے لہجے کی درشتی نے شوکت علی کو دہلا دیا۔ وہ اُس کے قدموں میں جھکتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنے بیوی بچوں کو سندھ میں چھوڑ آیا ہوں۔ گاؤں میں شادی کا بہانہ بنایا تھا میں نے۔ آج رات یہ سامان لے کر چلا جاؤں گا۔“

خالی کمروں کو آگ نہیں لگتی۔ شعلے مٹی کی دیواروں سے ٹکرا کر بجھ جاتے ہیں۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ ”شوکت! اب بہت ہوگئی۔ قیمتی چیزیں تم لے جا چکے ہو۔ کچرا سمیٹنے کیلئے موت کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کیلئے آئے ہو۔ بس! بہت ہو چکا۔ اب جان بچانا چاہتے ہو تو اس علاقے سے نکل جاؤ۔ یہاں سے کچھ بھی لے کر نہ جانا۔ یہ میرا حکم ہے۔“

وہ دندنا تا ہوا بشیر خان کی معیت میں پلٹ آیا۔ آتے ہی اپنے ساتھیوں کو حملہ کرنے کی تیاری کا حکم دیتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے گھر کو آگ لگاتا ہے۔ وہ کم بخت کافی سارا سامان اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ تم چار پانچ کین مٹی کا تیل ساتھ لے لینا۔ جلنے کیلئے کوئی چیز تو ہو۔“

رات کو جب وہ وہاں پہنچے تو تالے اُن کا منہ چڑا رہے تھے۔ انہوں نے پورے مکان میں لکڑی کا ایندھن پھیلادیا۔ ہر طرف مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی اور باہر کھڑے ہو کر جشن منانے لگے۔ سوائے چار پائیوں کے کچے گھر میں جلنے کیلئے کچھ بھی نہیں تھا۔

تمام دن اُس کا دل دھڑکتا رہا۔ اُسے اندازہ تھا کہ جونہی سردار کو پتہ چلے گا کہ شوکت علی زمین ملک فرید کے ہاتھ بچ کر نکل گیا ہے تو وہ باؤ لے کتے کی طرح اُس پر پل پڑے گا۔ بارہا تجربہ ہوا تھا کہ وہ غصے میں تنگی گالیاں دینے اور ہاتھ چلانے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ بشیر خان اور اُس کے ساتھی بے فکر تھے۔ چونکہ سردار کا تمام تر نزلہ عالگیر پر ہی گرتا تھا

اس لئے انہیں یقین تھا کہ آج بھی ہمیشہ کی طرح وہ بال بال بچ جائیں گے اور عالگیر بے بھاؤ کی سنے گا۔

شام کا دھندلا اندھیرے میں تبدیل ہوا تو سردار کی نئی نویلی لینڈ کروزر شکستہ حال حویلی کے صحن میں داخل ہوئی۔ عالگیر کے اعصاب تن گئے۔ ڈرائیور اور باڈی گارڈ کی معیت میں سردار اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ شعلہ بارنگا ہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں بتلایا تھا کہ شوکت کی زمین مجھے ہر صورت میں چاہیے۔“

وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ سردار کی سفاک آواز ساعت میں زہرا نڈیلنے لگی۔ ”تم نے آگ لگائی، جلے ہوئے بلے سے کوئی لاش برآمد نہیں ہوئی۔ کیا سمجھوں؟ تمہارے ہاتھ میں دبی ہوئی ماچس گیلی ہوگئی ہے یا ہاتھوں کی گرفت نے بڑھا پاؤں لیا ہے؟“

وہ بشیر خان کی طرف کن اکھیں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے خاندان سمیت آگ میں جل مرے مگر قسمت اُس کا ساتھ دے گئی۔ ہمارے پیچھے سے پہلے ہی وہ اپنے خاندان کو لے کر نکل چکا تھا۔ تلاش کرنے پر بھی ہاتھ نہیں لگا۔“

سردار کی تاؤ سف بھری آواز سنائی دی۔ ”عالگیر! تمہاری لا پرواہی سے سارا کھیل ہی چوٹ ہو گیا ہے۔ تمہیں پتہ ہی نہیں چلا اور وہ چالاک بڈھا ملک فرید کو رقبہ بچ کر نور پور سے نکل گیا۔ تم سب نکلے ہوتے جا رہے ہو۔“

وہ بولا۔ ”تم فکر نہ کرو سردار! میں ملک فرید سے مل کر زمین خریدنے کی کوشش کروں گا۔“

سردار پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔ ”فکر کرنے کی بات ہے عالگیر! ملک زمین میرے ہاتھ نہیں بیچے گا اور اگر بیچنے پر رضامند ہو بھی گیا تو پوری قیمت مع منافع مانگے گا۔“ ٹپکتے ہوئے سوچنے لگا۔ ایک عرصہ سے سیاسی میدان میں گھاتیں لگاتا آیا تھا۔ ایک چچان کے ناکارہ ہونے پر دوسری فی الفور بنا لیتا تھا۔ اُس کے سامنے چھاتی پھلا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے سینے پر انگلی کی ضرب لگاتے ہوئے بولا۔ ”عالگیر! مجھے وہ رقبہ چاہئے۔ ملک فرید سے بات کرو۔ وہ جتنے میں سودا کرے، کر کے خرید لو۔ تمہاری لا پرواہی کی یہی سزا دیتا ہوں کہ رقبے کی قیمت تم ادا کرو گے۔ کہاں سے اور کیسے؟ یہ میں نہیں جانتا۔“

وہ کچھ نہیں بولا۔ سوچنے لگا کہ سردار ایک امتحان کے بعد دوسرے امتحان میں ڈال دیتا

ہے۔ انکار کر کے اُس کی شبہ کھوتا نہیں چاہتا تھا۔ نیم دلی سے بولا۔ ”سردار! تمہارا حکم ماننا آیا ہوں۔ اب بھی مانوں گا مگر یہ ضرور خیال رکھا کر کہ بندے کے ہاتھ چاہے جتنے لمبے ہو جائیں، وہ قسمت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

سردار گہری سردنگاہوں سے اُسے گھورنے لگا۔ وہ اُس کے سچ کو نگھالنا چاہتا تھا۔ توقف کے بعد بولا۔ ”ملک فرید سے بات کرتے ہوئے یہ دھیان رکھنا کہ میں اُسے ناراض کرنا نہیں چاہتا۔“

عالمگیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سردار غصے میں تھا اس لئے بغیر چائے پئے ہی رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد بشیر خان نے کہا۔ ”عالمگیر! سردار کا رویہ بتاتا ہے کہ اُس نے ہمیں آخری چانس دیا ہے۔“

عالمگیر کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو بشیر خان! ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنے کیلئے وہ ہم پر لاکھوں روپے حرام نہیں کرتا۔ سیاست جیسے بل صراط پر کامیابی سے چلنے والا ہمیں بار بار گرتے ہوئے دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتا۔ کسی دن رسالہ بدلنے پر ٹل جائے گا۔“

صحن کے وسط میں کھڑے ہو کر اُس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے دھند پڑے گی۔“

دریا بالکل نزدیک تھا۔ سردیوں کی اکثر راتیں کھراؤ ڈھ کر بہت گہری ہو جایا کرتی ہیں۔ دھند کے باعث موسم سردی بھی پکڑ لیتا تھا۔ وہ کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے شوکت علی کو بچا کر سردار سے غدار کی چھٹی مرتبہ ارتکاب کیا تھا۔ وہ کسی کو آگ میں جلاتا نہیں چاہتا تھا۔ بندوق اور بازو کے زور پر دنیا سے نکرانے کا حوصلہ رکھتا تھا مگر غریب زادوں کی پیٹھ کو دیا سلائی دکھانے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کے ہاتھ کاپٹنے لگتے تھے۔

اُس نے اپنے تئیں اندازہ لگایا کہ ملک فرید پندرہ لاکھ روپے میں سودے پر رضامند ہو جائے گا۔ وہ منیرے قصائی کے کندھے پر چڑھ کر ملک کی گردن تک پہنچ سکتا تھا۔ سردار کی ہٹ دھرمی کا بھی بخوبی علم تھا۔ فکر دامن گیر ہو گیا کہ پندرہ لاکھ روپے کا بندوبست کہاں سے

کرے گا؟ شب گردی کے نتیجے میں پورے گروپ کو ماہ بھر میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے حاصل ہو جاتے تھے جن پر سردار نے کبھی قبضہ نہیں جمایا تھا۔ اُس نے آزادی دے رکھی تھی کہ وہ اپنا گزارا چلانے کیلئے چھوٹی موٹی وارداتیں قانون کی نظر میں آئے بغیر کرتے رہیں۔ ہر ماہ ایک لگی بندھی رقم بھی انہیں دیتا تھا۔ اس رقم سے اُن کے خفیہ ڈیرے کا خرچہ چلتا تھا۔

وہ تین ماہ پہلے اس حویلی میں منتقل ہوئے تھے۔ یہاں وہ نسبتاً محفوظ اور عام لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ تھے۔ حویلی سے دو فرلانگ کے فاصلے پر دریا بہہ رہا تھا۔ دریا تک جانے کا راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ جنگلی گھاس اور جھاڑیوں کی بدولت پانچ منٹ کا فاصلہ آدھے گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔ یہ گھاس اور جھاڑیوں کا گھنا جنگل دریا کے ساتھ ساتھ پندرہ بیس میل تک پھیلا ہوا تھا۔ حویلی سے کھیتوں تک یہ جنگل ڈیڑھ کلومیٹر تک چلا گیا تھا۔ آگے دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع بڑی شاہراہ تک گھنے کماد نے ماحول کو خاصا پر اسرار بنا دیا تھا۔ لنک روڈ تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے سے گزرتی تھی۔ لنک روڈ پر چڑھنے کیلئے کماد کے کھیتوں کے بیچ میں موڑ درموڑ کچا دشوار گزار راستہ عبور کرنا پڑتا تھا۔ حویلی کے اطراف میں لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ مہینوں کسی کی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ قانون کی نگاہوں سے اُن کا یہ اڈہ اب تک اوجھل ہی رہا تھا۔ تھانہ دور ہونے کی وجہ سے کبھی کوئی تھانیدار یا اہلکار یہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ اگر پہنچ بھی جاتا تو ڈیرے کی حالت زار دیکھ کر یہی سمجھتا کہ یہ نوکروں چاکروں کیلئے بنایا ہوا ڈیرہ ہے۔

اُن کے زیر استعمال عمومی طور پر چوری شدہ گاڑیاں ہی رہتی تھیں۔ واردات کے دوران انہیں نمبر پلیٹوں یا گاڑی کی شناخت کو چھپانے کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں آتا تھا۔ پرانی ایف ایکس سردار کی ذاتی گاڑی تھی۔ اس گاڑی کو وہ صرف اور صرف عام حالات میں سودا سلف لانے کیلئے استعمال کرتے تھے۔

انہیں پوری طرح باور تھا کہ سردار ہر آنے والے تھانیدار سے ذاتی مراسم قائم کر لیتا ہے۔ سیاست کی سیڑھی پر چڑھنے کیلئے قانون کی ریلنگ کو گرفت میں رکھنا پڑتا ہے۔ گرفت ڈھیلی پڑنے پر زینے قدموں تلے سے کھسک جاتے ہیں۔

اگلے دن اکیلا ہی بستی میں منیرے قصائی کے گھر پہنچ گیا۔ اُس کی بیوی نے اُسے

بیٹھک میں بیٹھایا اور اپنے بیٹے کو ملک فرید کے ڈیرے پر بھیج کر منیرے کو بلوالیا۔ وہ عالمگیر سے بغل گیر ہو کر بولا۔ ”بغیر مطلب کے بستی میں نہ آنے والا آج بھگ کر میرے گھر تک کیسے پہنچ گیا؟“

وہ اُس کے شانے پر ہاتھ مار کر چار پائی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ منیرے نے تیزی والی چائے بنوالی۔ گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے بولا۔ ”عالمگیر! میرے جانی، اب کہو، کیسے آتا ہوا؟“

وہ بولا۔ ”مصیبت میں پھنس گیا ہوں شوکت علی کی چوری چھپے مدد کر کے۔ اب سردار وہ رقبہ مانگتا ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ ملک کی ناراضی بھی مول نہیں لینا چاہتا۔ تم ہی بتاؤ، کیا کروں؟“

منیر اسوج میں پڑ گیا۔ وہ خود بھی دونوں بڑوں کو لڑانا نہیں چاہتا تھا۔ بھینسوں کی جنگ میں بکریاں پس جاتی ہیں۔ وہ بولا۔ ”سردار فضل خان بڑا کایاں بندہ ہے۔ وہ ملک کی اُس طاقت سے بھی آگاہ ہے جس کا آج تک ملک نے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ ملک کے سول جج بیٹے کی وجہ سے کئی کتر اتا ہے۔ نہیں! وہ ملک فرید کے بھائی ملک ظہور اور اُس کے بیٹوں کو جانتا ہے۔ یہ بھی جانتا ہے اگر ملک ظہور شیخوپورہ سے اپنے بھائی کی مدد کیلئے یہاں پہنچ گیا تو اُس کی خیر نہیں ہوگی۔ بہر حال! میں ملک سے بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مان جائے۔ ایک بات دھیان میں رکھنا کہ ماننے کی صورت میں بھی وہ متلاف ضرور لے گا۔“

عالمگیر کو پتہ تھا۔ ہاتھ آئی دولت کوئی بھی نہیں چھوڑتا۔ اُس نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے فون کر کے جلد ہی بتلاؤ گے۔ میں سردار سے پیسے لے کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

بیٹھک سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یہ بستی اُس کی بارہا کی دیکھی بھائی تھی۔ اُسے ذاتی خریداری کیلئے شہر میں بھی جانا تھا۔ سوچا کہ سردار کی حویلی کا چکر لگا کر بازار کی طرف نکلے گا۔ حویلی کے گیٹ پر گاڑی روک کر ہارن بجانے لگا۔ دل میں سوچنے لگا۔ ”ہم جیسے مہروں پر سیاست کی بازی کھیل کر سردار جیسے آدمی کتنا اوپر چلے جاتے ہیں۔ میں نے پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ سے سول انجینئرنگ کا ڈپلومہ حاصل کر رکھا ہے، دو وقت کی روٹی

کیلئے چند ٹکوں کی نوکری نہیں ملی۔ اس بھیڑیا صفت اُن پڑھ شخص کی قسمت نے اسے کروڑوں میں کھلا رکھا ہے۔ بی اے کی جعلی سند پر کتنے ٹھاٹھ سے ایکشن لڑ کر ہر بار اسمبلی میں پہنچ جاتا تھا۔“

گیٹ کھلنے میں دیر ہو رہی تھی۔ ہارن بجا کر پھر سوچوں میں گم ہو گیا۔ ”سیاسی وڈیروں نے کبھی بھی مملکت کو ٹھٹھ مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ دستخطوں کے علاوہ ایک لفظ بھی نہ لکھ سکے والے سردار فضل خان کو صوبائی پارلیمانی سیکرٹری برائے تعلیم تعینات کر کے پندرہ کروڑ لوگوں کے ساتھ مذاق ہی تو کیا گیا ہے۔“

سوچوں میں دُور تک بھٹک جاتا مگر وایج مین نے گیٹ کھول کر اُسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ گاڑی اندر پورچ تک لے گیا۔ وایج مین سے پوچھنے لگا۔ ”بخت علی! سردار بیٹھا ہے؟“

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہاتھ کے اشارے سے اُسے دائیں ہاتھ پر واقع سردار کے مہمان خانے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ٹہلنے کے سے انداز میں مہمان خانے میں داخل ہوا۔ صوفوں اور کرسیوں پر دس بارہ اشخاص براجمان تھے۔ اندرونی دیوار کے ساتھ سردار اپنے تخت نما صوفے پر براجمان تھا۔ گردن غرور سے تکی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کر بولا۔ ”تم اُس کمرے میں بیٹھو۔ میں مہمانوں سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔“

وہ وی آئی پی گیسٹ روم میں آ بیٹھا۔ سردار اکثر یہیں اُس سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ بہترین آراستہ کمرے میں از فریضہ کی بھینی بھینی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ وڈو کا پردہ ہٹا کر بیٹھ گیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد میز پر بخت علی نے چائے اور لوازمات پُجن دیے۔ اُس نے پوچھا۔ ”آج خلقت کم دکھائی دے رہی ہے۔“

بخت علی اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ ”خلقت بھی کبھی کم ہوئی ہے کیا؟ یہ جائیں گے، اور آ جائیں گے۔ کسی کا کام ہو جاتا ہے، کوئی جھڑکیاں سن کر رخصت ہو جاتا ہے۔ سردار کا ڈیرہ لگا رہتا ہے۔“

وہ چائے پیتے ہوئے سوچنے لگا۔ بخت علی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہاں آنے والوں میں کبھی کمی نہیں ہوتی تھی۔ ہر آدمی سیدھے راستے سے حق رسی کیلئے جانے کی بجائے سردار کے ڈیرے کا شارٹ کٹ اختیار کرنا چاہتا تھا۔ سردار کے قدموں میں تحفوں کے نام پر رشوت

دھر کر کامیابی کا تعویذ حاصل کرتا اور خوشی خوشی چلا جاتا۔ کسی نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اپنے چھوٹے سے مفاد کو تحفظ دینے کیلئے وہ بھیڑیے کے ہونٹوں پر خون مل رہا ہے۔ خونی بھیڑیا خون پینے کا عادی ہو کر بنا تمیز کے بھیڑیوں مارنے پر مثل جاتا تھا۔ سردار کو اُس کی عدم موجودگی میں فرعونیت کا طعنہ دینے والوں نے ہی اُسے انسان سے فرعون بنایا تھا۔

سردار نے ایک گھنٹے بعد وی آئی پی کمرے میں قدم رنج فرمایا۔ اپنے مخصوص شاہانہ انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”عالمگیر! بغیر اطلاع کے آئے ہو۔ خاص وجہ ہے؟“

وہ بولا۔ ”نہیں سردار! فون کے پری پیڈ کارڈ اور کچھ دوسری اشیاء خریدنے کیلئے شہر آیا تھا۔ سوچا تم سے بھی ملتا چلوں۔“

”کوئی چاء شاء پی ہے؟“

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”عملے کا کیا حال ہے؟“ سردار کا اشارہ اُس کے گروپ میں شامل بشیر خان اور شہر وغیرہ کی طرف تھا۔

”سب ایک دم فٹ ہیں۔“ عالمگیر نے کہا۔ ”ہم سب تمہارا حکم سن کر پریشان ہیں۔ رات بھر سوچا۔ اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ ہم سب مل کر بھی شوکت علی والے رقبے کی قیمت نہیں چکا سکتے۔ رقم تمہیں ہی دینا پڑے گی سردار!“

سردار تہقہہ لگا کر فٹ پڑا۔ ہاتھ لہرا کر بولا۔ ”کوئی حال نہیں عالمگیر تمہارا بھی۔ بھلے آدمی! وہ تو میں نے غصے میں کہا تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ پندرہ بیس لاکھ روپے تم کہاں سے دو گے۔ چھوٹی چھوٹی وارداتیں کر کے اپنا پیٹ پالتے ہو۔ اتنی بڑی واردات کرو گے تو قانون کی نظر میں آ جاؤ گے۔“

اُس نے سردار کے بدلے ہوئے رویے پر غور کیا۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ پل میں رتی پل میں ماشا بننے والا فرعون اُس کی پذیرائی کر رہا تھا۔ بولا۔ ”تم اگر دو چار بار ناکام ہوئے تو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرا شاہ زور گھوڑا لنگڑا ہو گیا ہے۔ ابھی میں نے تم سے بڑے کام لینا ہیں۔ تمہیں فضول کاموں میں الجھا کر میں تمہاری طاقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔“

وہ استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ انتخابات میں حریف کو

پچھاڑنے سے بھی بڑا کوئی کام اُس سے یا اُس کے گروپ سے لیا جاسکتا تھا؟ بولا۔ ”سردار! میں سمجھا نہیں۔ تم جو کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔“

سردار ہنسنے لگ گیا۔ ہنستے ہنستے بولا۔ ”جب موقع آئے گا، کھل کر ہی کہوں گا۔ اشارہ کئے دیتا ہوں تاکہ تم قبل از وقت ذہنی طور پر تیار رہو۔ لوکل باڈیز کے انتخابات ہونے والے ہیں۔ اوپر سے حکم آیا ہے کہ اپنی پارٹی کے امیدواروں کو جتنا ہے۔ ابھی تو کینڈیڈیٹ ہی کھل کر سامنے نہیں آئے، جب دشمن اور ججن اپنی اپنی بلوں سے باہر آئیں گے، تمہیں بھی اپنے اڈے سے باہر آنا ہوگا۔“

وہ سر ہلا کر مسکرانے لگا۔ سردار کی کبھی ہوئی بات سمجھ کر پوری بات کی تہہ میں پہنچ چکا تھا۔ بولا۔ ”سردار! تم فکر ہی نہ کرو۔ اب تو مجھے اس میدان میں کھیلنے کیلئے اترنے کا بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔“

اپنی سفید مونچھوں کو بل دیتے ہوئے سردار سوچ میں گم ہو گیا۔ اُس نے ڈسٹرب نہیں کیا۔ کچھ توقف کے بعد سردار متفکرانہ انداز میں بڑبڑایا۔ ”میں نے اوپر والوں سے کہہ دیا ہے کہ نور پور یونین کونسل میں ناظم اور نائب ناظم میری صوابدید پر کھڑے کئے جائیں۔ وہ مان گئے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ بستی پر ملک غلام فرید کا پوری طرح ہولڈ ہے۔ سب لوگ اُس کے کہنے پر ہی ووٹ دیں گے۔ کوئی ایسا بندہ کھڑا کروں جو ملک فرید کو ناپسند نہ ہو۔“

وہ بولا۔ ”ملک فرید تمہیں پسند نہیں کرتا۔ اس کے باوجود بستی والے تمہیں ووٹ دیتے ہیں۔ تمہارے کھڑے کئے ہوئے بندے کو ہی ضلعی اسمبلی میں پہنچائیں گے۔ ملک سے میں بخوبی بٹ لوں گا۔“

سردار اُسے خالی خالی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچ میں گم ہو گیا۔ ماتھے پر تردد کی غماز لکیریں سجائے بولا۔ ”سننا ہے کہ ملک اپنا بندہ کھڑا کرنے کے چکر میں ہے۔ اُس کی مخالف پارٹی سے بات بھی ہو گئی ہے۔ ابھی تک یہ فائل نہیں ہوا کہ وہ کسے کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ ناظم کیلئے جوڑی دار کسے بنائے گا۔ اگر وہ کھل کر اپنا امیدوار کھڑا کرتا ہے تو ہمارے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گے۔“

عالمگیر مصنوعی بے فکری سے بولا۔ ”کیا مشکلات پیدا ہوں گی سردار! جسے بھی ملک فرید کھڑا کرے گا، میں اُسے سر میں ڈانگ مار کر بیٹھا دوں گا۔“

سردار نے اُسے ڈانٹ دیا۔ ”ادئے بس جوان! جانتا ہوں تمہیں۔ تم نہیں جانتے ہو کہ ملک غلام فرید کے پیچھے کون سی طاقت ہے۔“

اُسے مزید قصائی کی بات یاد آئی۔ کریدتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم مجھے ملک غلام فرید کے بارے میں کھل کر بتاؤ گے تو اس میں تمہارا فائدہ ہوگا۔ میں ہاتھ بچا کر دار کر دوں گا۔“

”ملک فرید کا بھائی شیخوپورہ سے در مرتبہ منتخب ہو کر دفاعی اسمبلی میں پہنچ چکا ہے۔ اس مرتبہ اُس نے الیکشن میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اُس کے بیٹے نے باپ کے ردائی حریف نے پچھاڑ دیا۔ وہ پڑھا لکھا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بالکل سیدھا سادھا آدمی ہے۔ اُس کے پاس تمہارے جیسوں کی بھی کمی نہیں۔ فطرتاً شریک نہ ہونے کے باوجود کشت و خون کا بازار گرم رکھتا ہے۔“ سردار اُسے دھیمے لہجے میں بتلانے لگا۔ ”کسی گھریلو معاملے پر اختلاف کے باعث ملک فرید کا اُس سے ملنا جلنا موقوف ہے مگر دونوں کے بیچ موجود خونی رشتے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک مرتبہ لاہور میں میری اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس نے میرا ایک کام نکلوا دیا تھا۔ وہیں پر اُس نے کہا تھا کہ میں ملک فرید کا ہر طرح سے خیال رکھوں۔ اُسے کوئی گزند نہ پہنچاؤں۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ مجھے دھمکی دے رہا ہو کہ اگر فرید کو کچھ ہوا تو وہ یہاں آ کر میرا کچھ مر نکالنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ میں شیر ہوں مگر طاقت کے زعم میں عقل کی آنکھیں بند نہیں رکھتا۔ جانتا ہوں کہ وہ شیر پر بر شیر ہے۔“

اُس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ سردار ٹھیک کہتا تھا۔ بکریوں کو نوچنے والے بھیڑیے کا شیر سے مقابلہ ایک طرف نتائج لاتا ہے۔ دل میں شکر کیا کہ اپنا اور ملک کا قدم اپنے میں سردار کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوا تھا۔ بولا۔ ”سردار! اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سامنے آ کر ملک پر ڈار نہیں کر سکتے۔ ایک صورت باقی ہے۔ وہ جس آدمی کو کھڑا کرتا ہے، اُسے جیتنے دیا جائے۔ جب جیت جائے تو اُس پر دباؤ ڈال کر اپنی پارٹی میں شامل کر لیا جائے۔“

سردار نے ستائشی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ تہقہ لگا کر ہنس پڑا۔ ایسے میں فلموں کے ولن کے جیسا دکھائی دینے لگا تھا۔ اٹھ کر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ٹہلنے لگا۔ ہاتھ پیچھے باندھ رکھے تھے۔ مونچھوں کو حسبِ عادت بل دیتے ہوئے اُس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ چمکی دیتے ہوئے بولا۔ ”واہ عالمگیر! یہ ہوئی ناں بات۔ کیا تم پر یقین ہو کہ ملک کے

امیدوار کو جیتنے کے بعد تم اپنی پارٹی کی چھتری تلے لانے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟“

وہ سفاک انداز میں مسکرانے لگا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔ آنکھیں بول اٹھیں۔ ”دنیا میں تم سے بڑھ کر خود سر اور ناگ صفت کوئی شخص نہیں۔ تمہاری دُم پر پیر آتا ہے تو چیخ اٹھتے ہو۔ تمہاری کمزوری پر ہاتھ ڈالوں تو تم بھی منہ کے بل آن کر دو گے۔ یونین کونسل کے ناظم کی کیا اوقات ہے کہ دُم ہلاتا ہو امیرے پیچھے نہ چلے۔“

سردار کو اُس کا جواب مل گیا۔ ستائشی انداز میں اُسے دیکھ کر مسکراتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ عالمگیر کو ملاقات کا دقت ختم ہونے کا اشارہ مل چکا تھا۔ وہ اٹھا اور کمرے سے نکل کر اپنی سوز کی طرف بڑھ گیا۔

ٹھکانے پر پہنچا تو بشیر خان کو متفکر پایا۔ دریافت کرنے پر اُس نے بتلایا۔ ”مجھے اڑتی اڑتی خبر ملی ہے کہ رفیع اللہ خان کا تبادلہ ہمارے تھانے میں ہو رہا ہے۔“

عالمگیر نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“

بشیر خان نے کہا۔ ”مجھے اے ایس آئی محمد بخش نے فون پر بتایا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اُس کے چارج لینے پر ہم سب لوگوں کو انڈر رگراؤنڈ ہونا پڑے گا۔“

عالمگیر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ رفیع اللہ کو جنوبی جانتا تھا۔ گزشتہ چار سالوں سے دوسرے ضلع کے ایک تھانے میں بطور ایس ایچ او تعینات تھا۔ محکمے میں اُسے ”کالی بھیڑ“ کا نام دیا جاتا تھا۔ لوگوں کے نزدیک ملک بھر میں سب سے زیادہ دیانت دار انسپکٹر قرار پاتا تھا۔ رشوت نہیں لیتا تھا۔ کسی سیاسی وڈیرے کی اجارہ داری کو قبول نہیں کرتا تھا اور نہ ہی مجرموں کو زور عات دینے کا قائل تھا۔ اُس کی پشت پر اُس کا کزن تھا جو ڈی آئی جی کے عہدے پر فائز تھا۔ اس لئے عام تو عام رہے، خاص لوگوں کو بھی قانون شکنی کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

وہ رفیع اللہ کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اُسے اپنے سردار کے رسوخ پر کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ بکنے والے پولیس آفیسرز کے دم پر اُس کی مونچھوں کو بل آتا تھا۔ رفیع اللہ جیسے سرفروش پولیس آفیسر کے سامنے اُس کے اوپر تک کے تمام تعلقات بے معنی ثابت ہونے والے تھے۔ وہ بولا۔ ”بشیر! وہ جہاں بھی گیا، ہر ایک کو سیدھا کرنے میں کامیاب ہوا۔ ہمارے سردار جیسے طرم خاں ہر حلقے میں موجود ہیں جو بد معاشری اور بے ایمانی کی بیساکھی پر چل کر اسمبلی میں پہنچتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں پکڑا کر رشوت کے عوض چھڑوانے

والے دوٹوں پر سوالیہ نشان بن کر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں چوڑیاں پہن کر بیٹھا پڑے گا جب تک وہ یہاں سے چلا نہیں جائے گا۔“

کچھ سوچنے کے بعد اُس نے فون پر اے ایس آئی سے رابطہ کیا۔ ”پیارے! کبھی خوشی کی خبر نہیں دیتے ہو، لگتا ہے کہ ڈراوے دینے پر جھکے نے تجھے تعینات کر دیا ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”سنجھل کر بولا۔“ عالمگیر! حکم کا یکہ ہمیشہ انڈر رلڈ والوں کے پاس نہیں رہتا، کبھی ہمارے ہاتھ بھی لگ جاتا ہے۔ میری مانو تو اپنے پتے چھپالو۔“

عالمگیر کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال سا تن گیا۔ بولا۔ ”کوئی ایسا طریقہ بتاؤ کہ وہ یہاں آنے کی بجائے کسی اور طرف بھیج دیا جائے۔ اُس کے آنے سے ہمارے ساتھ ساتھ تم سب اہلکار بھی مشکلات میں گھر جاؤ گے۔ کوئی طریقہ سوچو۔“

محمد بخش نے کہا۔ ”بڑی سرکار نے اُسے یہاں پہنچنے سے روکنے کی ایک تدبیر کی ہے۔“ بڑی سرکار سے مراد، سردار فضل خان کی پارٹی کا سربراہ سردار مظفر علی خان تھا۔ مزید بتانے لگا۔ ”اُس نے رفیع اللہ کے تھانے کے متعلقہ علاقے کے لوگوں میں اپنے کارندے بھیج دیے۔ وہ مقامی عوام کو ساتھ لے کر ہڑتال کر رہے ہیں۔ اُن کا مطالبہ ہے کہ رفیع اللہ کو اُن کے تھانے پر ہی تعینات رکھا جائے۔ تبادلہ نہ کیا جائے۔ دیکھیں کیا بنتا ہے؟“

سانپ کو گھیرنے کیلئے سپیرے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، عالمگیر یہ سوچ کر مسکرانے لگا۔ بڑی سرکار کی اس گیم سے سانپ بھی مر جاتا، لاشی بھی بچ جاتی اور اُبلے لباس پر خون کے دھبے بھی نہ پڑتے۔ دو تین دنوں میں ہی اُد پر تک داویلا مچ گیا۔ ہر طرف رفیع اللہ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ پہلا انسپکٹر تھا جس کیلئے عوام سڑکوں پر نکل آئی تھی۔ بڑی سرکار کی گیم بڑی کامیابی سے چل رہی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اچانک شہر کے اجنبی لوگ سڑکوں پر نکل آتے تھے اور اپنے ساتھ عوام کو ملا کر جلوس کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ عوام نے یہ دھمکی بھی حکام بالا تک پہنچا دی تھی کہ اگر رفیع اللہ کا تبادلہ کیا گیا اور نیا انسپکٹر تعینات کیا گیا تو وہ تھانے کی عمارت کو آگ لگا دیں گے۔ سڑکوں پر جلتے ہوئے تاروں کا دھواں ایوانوں تک پہنچا تو ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔

عالمگیر سردار فضل خان کی ہمراہی میں بڑی سرکار کے دربار میں پیش تھا۔ سردار نے متفکرانہ انداز میں کہا۔ ”انتخابات سر پر ہیں۔ ایسے میں رفیع اللہ کو ہمارے تھانے میں بھیجا

جار رہا ہے۔ میری طرف سے پیشگی عذر قبول کر لیا جائے۔ پورے حلقے میں سے پارٹی کو کوئی سیٹ نہیں مل سکے گی۔“

بڑی سرکار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ایک تھانیدار سے ڈرتے ہوئے آپ کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔ کیا ایک ایم پی اے ایک بگڑے ہوئے تھانیدار کے ہاتھ کاٹنے کی طاقت نہیں رکھتا؟..... میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔ کھل کر اُسے روکوں گا تو وہ میرے لئے مشکلات پیدا کرے گا۔ جہاں اُسے روکنا چاہتا ہوں، وہاں کے بڑے بھی اُس سے تنگ ہیں اور اُسے تھانے سے نکالنے کیلئے بہت اُد پر تک اپروچ کئے بیٹھے ہیں۔ میرے پاس عوام کو کھڑا کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ میں کر چکا ہوں اور شکار کی رغبت کیلئے چارہ ڈال کر بیٹھ گیا ہوں۔“

سردار نے پوچھا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُسے ہمارے تھانے کی بجائے کسی اور تھانے میں بھیج دیا جائے۔ بڑی سرکار! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آپ سمیت ہم سب لوگ جس طریقے سے سیٹ نکالتے ہیں، اُس طریقے پر پردہ ڈالنے والے یہی لوگ ہیں۔ ہم نے اس بازی کو ہاتھ سے گنویا تو سمجھ لیجئے گا کہ سیاست کی بساط بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔“

دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ بڑے حلقوں والے اجارہ داروں کے گلوں میں اینیانداری کی ایک ہڈی پھنس گئی تھی۔ سردار بڑی سرکار کے کان کے قریب ہو کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”اگر کہیں تو اُسے پکا پکا ٹرانسفر کر دیں؟“

یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھیں عالمگیر پر جمی ہوئی تھیں۔ عالمگیر کی ریڑھ کی ہڈی میں کرنٹ کی طرح خوف کی سرد لہر سراپت کر گئی۔ دل میں دعائیں مانگتے لگا کہ بڑی سرکار اس منصوبے کی اجازت نہ دے۔ سردار مظفر علی خان اپنی عادت کے مطابق اوپر والے دانتوں کے نیچے سروں پر شہادت کی انگلی کی ٹھوکریں مارنے لگا۔ دونوں اپنے اپنے زادایوں سے امید بھری نگاہوں سے اُسے سوچ میں پڑا ہوا دیکھنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد وہ گھمبیر آواز میں گویا ہوا۔ ”یہ میں نے بھی سوچا تھا۔ آپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جیسے ہم لوگ اندر دانداری ایک ہیں، ایسے ہی یہ نام نہاد ایمانداری بھی ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے ہیں۔ رفیع اللہ کے پیچھے ایس ایس پی سلطان خان اور اُس کا ڈی آئی جی کزن اُس کی حفاظت کیلئے کمر بستہ کھڑے ہیں۔ اُسے چھیڑ کر ہم کسی نئی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔“

سردار فضل خان معاملے کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ رازدار انداز برقرار رکھتے ہوئے بولا۔
”اپنا عالمگیر اتنی صفائی سے ہاتھ بچا کر.....“

سردار مظفر نے ہاتھ اٹھا کر اُسے روکتے ہوئے کہا۔ ”نہیں سردار فضل خان! ہر گئی میز می انگلیوں سے نہیں نکلتا۔ وہ اگلے ہفتے تمہارے علاقے کے تھانے کا چارج لینے پہنچ رہا ہے۔ عوامی ہڑتالیں اور جلے جلوسوں کو اوپر والوں نے اہمیت نہیں دی ہے۔ اُس کی آمد پر تم دریا پار والوں کو اپنے حلقے میں مصروف کر دینا۔ رفیع اللہ کی تمام تر توجہ دریا پار والوں کی چھوٹی چھوٹی وارداتوں کو روکنے اور انہیں پکڑنے پر مرکوز رہے گی۔ عالمگیر اپنے کام پر پہلے سے زیادہ احتیاط سے لگا رہے گا۔“

سردار فضل بڑی سرکار کا ہم خیال تو نہیں بنا مگر ماننے کے سوائے کوئی چارہ نہ پا کر اثبات میں سر ہلاتا ہوا عالمگیر کے ساتھ اُٹھ آیا۔ راستے میں عالمگیر سے مخاطب ہوا۔
”سردار مظفر علی خان کو بھی ہم نے خواہ مخواہ ہی بڑی سرکار بنا رکھا ہے۔ وہ اس مرتبے کا اہل نہیں ہے۔“

عالمگیر نے کہا۔ ”سردار! تم خواہ مخواہ ہر بات دل پر لے لیتے ہو۔ اگر پارٹی کو ہمارے مفادات کی فکر نہیں ہے تو ہمیں کیا پڑی ہے خود کو آگ میں جھونکنے کی۔ تم اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہو۔ چلی سیٹوں پر پارٹی کامیاب ہوتی ہے یا نہیں، اس سے ہمیں کیا لینا دینا۔“

سردار نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”خالی بندوق ہاتھ میں ہو تو صرف میہ کا بن سکتا ہے۔ گولی نہ ہو تو دشمن کو زیر نہیں کیا جاسکتا۔ چلی سیٹوں پر اپنے بندے نہ ہوں تو ان غریب غریبوں کے پر نکل آتے ہیں اور یہ ہماری سجدہ گاہوں میں ماتھا ٹیکنے کیلئے نہیں آتے۔ ہمیں دونوں ہاتھوں میں برابر طاقت رکھنا پڑتی ہے۔ اوپر والے ہاتھ کی گرفت ختم ہوگی تو ہمیں اوپر سے کچھ نہیں ملے گا۔ نیچے والے ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں تو روٹی کو ترستے ہوئے لوگ ہمارے گریبان تک پہنچ جائیں گے۔“

عالمگیر بڑے غور سے اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس پڑھ شخص کو اپنا اقتدار بچانے رکھنے کے بڑے گُر آتے تھے۔ اتنی گہرائی تک کوئی ماہر سیاسیات بھی نہیں اتر سکتا تھا جتنی گہرائی میں وہ اتر کر تیرنے لگتا تھا۔ بولا۔ ”سردار! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ملک فرید نے اپنے بھائی کے توسط سے رفیع اللہ کو یہاں منگوایا ہو۔ اُس کا یہ خیال ہو کہ ہم پر تھانے کا راستہ بند

کر کے وہ اپنے امیدوار کو بہ آسانی کامیاب کر دالے گا۔“
سردار نے ہنکارا بھرا۔ سوچ کر بولا۔ ”تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔“

گاڑی آگے چل رہی تھی۔ عالمگیر کا ذہن پچھلے انتخابات کی پرہجوم گلیوں میں دوڑنے لگا۔ واضح طور پر سردار کے حریف کی سیٹ نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔ عین موقع پر اُس کی دم پر عالمگیر نے ایسا پاؤں رکھا کہ اُسے انتخابات سے چھ دن قبل ہی عوامی جلسے میں سردار فضل کے حق میں دستبرداری کا اعلان کرنا پڑا تھا۔ تبھی تو بشیر خان نے اُسے کہا تھا۔ ”عالمگیر! یہ الیکشن سردار نے نہیں، تم نے جیتا ہے۔“

سردار اپنا سر سیٹ پر ٹیکے ہوئے آنکھیں موند کر گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ ایسی ہی کیفیت میں رہتے ہوئے بولا۔ ”مگر ملک کے اپنے بھائی سے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ اتنے معمولی سے کام کیلئے وہ اپنے بھائی کی مدد نہیں لے سکتا۔“

عالمگیر نے کہا۔ ”سردار! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ جہاں مفاد ہوتا ہے، وہاں انا اور ضمیر تھپک کر سلا دیے جاتے ہیں۔ تم بھی تو مخالفوں کے ڈیرے پر مطلب نکالنے کیلئے پہنچ جاتے ہو۔ جھک کر کام نکال لیتے ہو۔ دل کو سمجھانے کیلئے یہ بھی کہتے ہو کہ سیاست میں کوئی جتن نہیں ہوتا، کوئی دشمن نہیں ہوتا۔ وہ تو پھر اُس کا سگا بھائی ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود نہ گیا ہو، اپنے بیٹے کو بھیج دیا ہو۔“

سردار نے اُسے استعجاب آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ لوگ کونین کی گولی شوگر میں لپیٹ کر کھلاتے ہیں۔ وہ شوگر کو کونین میں لپیٹ کر حلق میں ٹھونس رہا تھا۔ سر ہلاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ جو ان آدمی ہے، یہ سمجھ نہیں سکتا کہ اس دنیا میں اپنے وجود کو قائم رکھنے کیلئے ضمیر اور ایمان کی قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔ دونوں میں سے ایک چیز ہی بچائی جاسکتی ہے۔ اقتدار یا ضمیر۔“

بقیہ سفر خاموشی سے کٹا۔ سردار الیکشن کے بارے میں سوچتا رہا۔ عالمگیر، رفیع اللہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ آج تک مڈ بھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ کافی کچھ اُس کے بارے میں سن ضرور رکھا تھا۔ جتنا کچھ سنا تھا، وہ حوصلے کی حویلی ڈھانے کیلئے کافی تھا۔ اُس نے تو یہاں تک سن رکھا تھا کہ وہ بڑی سرکار کو بھی اپنے اصولوں پر سودے بازی کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی اُس کے کارندوں کو خاطر میں لاتا ہے۔ ہاتھی کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر پیٹنے کی طاقت

ایک اراضی پر مقدمہ عدالت میں چلتا آ رہا تھا۔ وہ کسی بھی طرح اراضی سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ مقدمے کا رخ بتلاتا تھا کہ سردار کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ مصنوعی مسکراہٹ لیوں پر سجاتے ہوئے بولا۔ ”میرے! چوہدری باسط کا ناظم بننا گاؤں کیلئے بہت فائدہ مند ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بڑا اچھا دار اور غریب پرور بندہ ہے۔ گاؤں کی حالت بدل کے رکھ دے گا۔ مگر کیا ہی اچھا ہو کہ وہ سردار فضل کی پارٹی میں شامل ہو کر الیکشن لڑے۔“

میرا اُن پڑھ آدمی تھا۔ حیران ہو کر بولا۔ ”اِس سے کیا فرق پڑے گا؟“
عالمگیر نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ تم اور میں دونوں بڑوں کے کارندے ہیں۔ بڑوں کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں مگر ہماری یاری پر کوئی آج نہیں آئی۔ سچ کہتا ہوں۔ اگر چوہدری باسط سردار والی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لے تو اُسے اوپر سے بہت زیادہ فنڈز ملیں گے۔ اپوزیشن میں جانے سے وہ گاؤں کیلئے کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔“

بات میرے کی سمجھ میں آ گئی۔ عالمگیر اُسے مطمئن کر کے بھی مطمئن نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کا ملک اِس بار کی پرایمیاں نہیں لائے گا۔ اپوزیشن پارٹی کے لیڈروں سے اُس کے گہرے تعلقات تھے۔

میرے سے بغل گیر ہو کر وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ سردار کو فون پر اطلاع دی۔ ”سردار! ملک فرید نے چوہدری باسط اور شکور پٹھان کو کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ دونوں امیدواروں کی لمبی چوڑی برادری حلقے میں مقیم ہے۔ وہ کسی طرح بھی ہارنے نظر نہیں آتے اور نہ ہی ہمارے پاس اُن کے مقابلے کے امیدوار موجود ہیں۔“

سردار کی پریشان آواز سنائی دی۔ ”یہ تو بہت بری خبر ہے۔ تم ایسا کرو کہ میری اور ملک فرید کی ملاقات کا بندوبست کرو۔ میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

اُس نے حامی بھرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

بشیر خان کھانا تیار کر چکا تھا۔ کھانا چار پائیوں پر چھتے ہوئے بولا۔ ”عالمگیر! انتخابات کے دنوں میں رفیع اللہ کا علاقے میں آنا بہت براشگون ہے۔ اُسے اگر ہمارے گینگ کا پتہ چل گیا تو وہ کسی زور عاست کے بغیر ہمیں جیل بھجوا دے گا۔ تم نے اِس بارے میں کچھ سوچا

رکھنے والا شیر کو کہاں دھاڑنے کا موقع دے گا۔ وہ بے دھیانی کے عالم میں سر کھلانے لگا۔ بڑی سرکار اور سردار فضل کی طرح اُس کے اپنے بھی کچھ مقاصد تھے جو رفیع اللہ کی آمد پر خطرات کا شکار ہوتے دکھائی دینے لگے تھے۔

سردار کی کوٹھی سے نکلتے ہی وہ نور پور پہنچا۔ میرے قصائی کو تلاش کرنے میں اُسے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ ایک زمیندار کے گھر میں حقہ گڑ گڑاتا ہوا مل گیا۔ اُسے دیکھ کر بولا۔ ”لگتا ہے تمہیں بھی رفیع اللہ کی آمد کا پتہ چل گیا ہے۔ یار عالمگیر! بڑا غضب ہوا۔“

وہ مسکرانے لگا۔ بھرم رکھنے کو بولا۔ ”سامنے آئے گا تو اُس کے بازوؤں کی طاقت کا اندازہ ہوگا۔ تم سناؤ۔ ملک سے بات ہوئی؟“

وہ بولا۔ ”ہاں! میں نے ملک کو مشورہ دیا تھا کہ وہ رقبہ بچ دے۔ وہ پہلے تو مانا ہی نہیں، جب مانا تو اڑ گیا کہ وہ رقبہ کسی نور پور کے ضرورت مند زمیندار کے ہاتھ بیچے گا، سردار فضل کو نہیں دے گا خواہ وہ دگنی قیمت ہی کیوں نہ دے۔“

وہ مایوس ہو کر بولا۔ ”یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ سردار فضل خان ہر قیمت پر رقبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

میرے قصائی نے کہا۔ ”اُسے سمجھا کہ اِس ضد سے باز آ جائے۔ اِس میں اُس کا ہی فائدہ ہے۔“

عالمگیر دل ہی دل میں بولا۔ ”اُسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ میرے بتلانے پر اُس کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ میرے قصائی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یہ تو پتہ ہوگا ہی کہ ملک بستی میں کس چوڑی کو الیکشن میں کھڑا کر رہا ہے؟“

میرا ہنس پڑا۔ اُس کی ہنسی بڑی معنی خیز تھی۔ اپنا منہ اُس کے چہرے کے قریب لا کر بولا۔ ”چوہدری باسط علی اور شکور پٹھان کے علاوہ کس کو کھڑا کر سکتا ہے۔ پورا گاؤں چوہدری باسط کے رشتہ داروں پر مشتمل ہے جبکہ نور پور یونین کونسل کے حلقے میں جاہ جاپٹھان بیٹھے ہوئے ہیں جو برادری کی بنیاد پر شکور پٹھان کو ہی ووٹ دیں گے۔“

عالمگیر سوچ میں پڑ گیا۔ ہمیشہ راج کرنے والا سردار فضل خان مسائل میں گھرتا جا رہا تھا۔ رفیع اللہ کے بعد چوہدری باسط کی مقامی سیاست کے اکھاڑے میں اترنے کی خبر نے رہی سہی کسر نکال دی۔ سردار کا گزشتہ تین سالوں سے چوہدری باسط کے ساتھ بائیس

ہے؟“

نہ اُس نے کچھ سوچا تھا اور نہ ابھی اس پر غور و خوض کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اپنی توجہ ضروری امور پر مرکوز کر رہا تھا۔ کامیابی کیلئے انتشارِ فکر سے بچنا لازمی ہوتا ہے۔ وہ بولا۔ ”بشیر خان! تم اور شہر دونوں دریا پار کے جفا دیوں سے رابطہ استوار کرنے کی کوشش کرو۔ انہیں رفیع اللہ خان کے بارے میں بتلائے بغیر اس لائن پر لگاؤ کہ وہ دریا پار کر کے آئیں اور اس علاقے میں چوریوں اور وارداتوں کا بازار گرم کریں۔ ہم اُن کی پس پردہ مدد کریں گے۔“

شہر استعجاب آمیز لہجے میں بولا۔ ”عالمگیر! کبھی شیر نے اپنا شکار کتوں کے حوالے کیا ہے جو ہم انہیں یہاں بلوائیں؟“

وہ ہنس پڑا۔ سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔ ”شیر کے سامنے بھیئس کھڑی ہو تو وہ اپنی یکسوئی سے لطف اندوز ہونے کیلئے کتوں کو ہرن کے پیچھے لگا کر چالاکی اور عقلمندی کا ثبوت دیتا ہے۔ بھیئس گرانے کیلئے ہمیں ہرن کو کتوں کے حوالے کرنا ہوگا۔ رفیع اللہ کو الجھانے کیلئے انہیں آگے لانا ہوگا۔ ایسے میں ہم پوری توجہ کے ساتھ اپنا کام کر سکیں گے۔ چھوٹی موٹی وارداتیں الیکشن کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ سمجھے؟“

وہ سمجھا، یا نہیں، اختلاف کی جرات نہ کرتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔ ”عالمگیر! تم بہت گہرے آدمی ہو۔ بڑے آدمیوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہو، پڑھے لکھے ہو، وہ سب سمجھتے ہو جس سے ہم آگاہ ہی نہیں ہوتے۔“

اُس نے بشیر خان سے کہا۔ ”شکر ہے کہ بڑی سرکار نے رفیع اللہ کے قتل کا حکم نہیں دیا۔ اگر اُس کی چرخی اس طرف گھوم جاتی تو ہمارے لئے بہت بڑی مصیبت کھڑی ہو جانا تھی۔“

بشیر خان نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ بڑے لوگ اپنا راستہ کھولنے کیلئے ہمیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔“

رات کو خود کو نیند کے حوالے کرتے ہوئے وہ چار پائی پر دراز ہو گیا۔ ہر روز کی طرح پھر میز پر عموداً کھڑی کی ہوئی نارنج کا سایہ دیوار پر لرزاں ہو گیا۔ اُس نے تہیہ کیا کہ آج لائین کی طرف منہ کر کے نہیں لیٹے گا۔ سر ہانے کی طرف سے چار پائی کو اونچا کرنے کیلئے اُس نے دو اینٹیں پائیوں کے نیچے رکھ دیں۔ دل ہی دل میں لائین کو مخاطب کر کے طنزیہ انداز

میں سوچنے لگا۔ ”شعلے کو حرکت دے کر تم سمجھنے لگتی ہو کہ تم میں جان پڑ گئی ہے۔ نہیں..... مردوں میں کبھی جان نہیں پڑتی۔ تم مُردہ ہو۔ تمہارے شعلے میں آ کر کھڑی ہونے والی بھی مُردہ ہے۔ اُس کی نصیحتیں کفن اوڑھ کر نہ ختم ہونے والی نیند میں غرق ہو چکی ہیں۔“

سوچ میں گم تھا کہ اچانک چونکنا پڑا۔ نارنج کے سائے میں اُس کی ماں آن کھڑی ہوئی۔ اُس پر دزدیدہ نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ میں صرف لپکتے ہوئے شعلے میں آ کر کھڑی ہو سکتی ہوں؟ غلط فہمی میں مبتلا ہو عالمگیر! علم دین بن کر زندگی گزارتے تو کبھی شعلوں سے نہ ڈرتے۔ میں کبھی شعلے اوڑھ کر تمہیں کچوکے دینے کیلئے نہ آتی۔ اب بھی وقت ہے، سنبھل جاؤ۔ ان فرعونوں کی دنیا سے نکل جاؤ اور دنیا کے کسی پرسکون گوشے میں جا کر علم کے پودوں کی آبیاری کرو۔“

وہ زچ ہو کر بولا۔ ”اماں! تم نے ان بڑوں کی دنیا سے بھاگ کر کیا پایا؟ ساری عمر آبلہ پادوڑنے میں گزار دی۔ ایک بل کا چین نہیں پایا تم نے؟ مجھے دیکھو..... میں ان کے حلق میں نوکیلی ہڈی بن کر چیخنے والا ہوں۔ طعنے دینے کی بجائے میری حوصلہ افزائی کرو۔ میں تمہاری روح میں لگی آگ کو انہی فرعونوں کے خون سے بجھا دوں گا۔“

وہ نفی میں سر ہلا کر تیز لہجے میں بولی۔ ”مجھے ان کے ناپاک خون سے اپنی پاکیزہ آگ بجھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں روکنے آتی ہوں۔ جیسے میری انگلی تھام کر تم نے اپنا بچپن سکول میں گزارا، ایسے ہی میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ ایک خوبصورت اور تعمیری دنیا تمہاری راہ دکھ رہی ہے۔“

اُس نے کروٹ بدل کر ماں کو او جھل کر دیا۔ نظروں کے سامنے بند کھڑکی تھی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا ایک طاق کھول دیا۔ باہر کی طرف سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ چاند کی مدھم روشنی میں اُسے یوں لگا جیسے وہ جیل کی سلاخوں کے سامنے آن کھڑا ہوا ہو۔ دل کانپ اٹھا۔ جیل کے شب و روز یاد آنے لگے۔ پھر سوچا۔ ”جیل کی سلاخوں سے گرم ہوا کے جھونکے بیرک میں داخل ہو کر روح تک کو جھلسا دیتے تھے۔ ان سلاخوں سے آزاد، ٹھنڈی اور تازہ ہوا اندر آتی ہے۔ پھر بھی مجھے جنت اور جہنم کے فرق کا کیوں پتہ نہیں چلتا؟“

اُس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ سردی کے باوجود وہ پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ کھڑکی سے در آتی ہوا بہت ٹھنڈی لگ رہی تھی۔ سکون کا لہر دلہر احساس روح تک اترتا ہوا محسوس

ہور ہا تھا۔ لطف کشیدگی کے مرحلے کو شہر کی غنودگی بھری آواز نے پایہ تکمیل تک نہیں پہنچے دیا۔ وہ بڑبڑایا۔ ”اوں ہوں عالمگیر! کیوں ہمیں نمونیہ کرواتے ہو۔ کھڑکی بند کر دو، بہت سردی ہو رہی ہے۔“

کھڑکی بند کر کے وہ ایک طویل سانس حلق میں اتارتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”ہم سب ایک جیسے ماحول سے نکل کر اس گورستانی حویلی میں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے تعاقب میں آگ کی لپٹیں چلتی آرہی ہیں مگر یہ اتنے پرسکون کیوں رہتے ہیں؟ انہیں سردی کیوں لگتی ہے؟ مجھے کیوں نہیں لگتی؟ یہ سب ایک جیسے ہیں۔ میں ان سے مختلف ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ میں ٹھیک نہیں ہوں۔ مجھے خود کو بدلنا ہوگا۔“

ایک جیسے حالات میں زندگی کا سفر طے نہیں ہوتا۔ ایک کروٹ پر تمام رات نہیں گزرتی۔ اُس نے تھک کر کروٹ بدلی تو نگاہوں کے سامنے پھر ٹارچ کا سایہ لہرانے لگا۔ اُس نے غصے سے ہاتھ مار کر ٹارچ کو نیچے گرا دیا۔ ٹارچ اُس کی چارپائی کے پایے کے نیچے رکھی ہوئی اینٹ پر جا گری۔ اُس کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ یوں لگا جیسے اُس کے بدن کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ اٹھا اور ٹارچ کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ بشیر خان نے لحاف سے منہ نکال کر کہا۔ ”اوئے عالمگیر! خدا نے نہ جانے کس اضطراب کے عالم میں تجھے بنایا تھا کہ سوتے میں بھی تخریب کاری پھیلاتے رہتے ہو۔ کبھی تو سکون سے سو جایا کرو۔“

وہ شرمندہ ہو کر لحاف میں دبک گیا۔ شعلے یا سائے میں آنے والی اُس کے لحاف میں نہیں آئی۔ ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اُس کے جانے پر دروازے سے چپک کر کھڑی نیند کی دیوی کمرے میں داخل ہوئی اور وارفتہ بائیں واکے عالمگیر کے لحاف میں گھس گئی۔



کہا جاتا ہے کہ امیر زادیوں کی پر تعیش زندگی تفکرات اور واہموں سے پاک ہوتی ہے۔ وہ جو چاہتی ہیں، خرید لیتی ہیں۔ دنیا بازار ہے۔ ہر چیز بکنے کیلئے شوکیسوں میں دھردی جاتی ہے۔ مفلس رال پکاتا، محرومیت بھری نگاہ سے دیکھتا آگے گزر جاتا ہے۔ پیسے والا اپنے دل کو لپٹائے بغیر خرید لیتا ہے۔ اُس کی خواہش درد کی صورت اختیار کرنے سے قبل ہی پوری ہو کر مٹ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سچ ہو۔ سیانے ٹھیک کہتے ہوں مگر شاہانہ کے اطراف میں نوٹوں کی گلدیوں نے ایک دوسرے سے جڑ کر دیوار کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس دیوار کے پار خواہشوں کا بازار تھا۔ وہ اس دیوار کو پھلانگنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ ہر چیز کی دستیابی کا دعویٰ رکھنے والے بازار میں اُس کے جذبات کی آسودگی کا کوئی سامان بکاؤ نہیں تھا۔

اونچے شعلے والے لوگوں کی کالونی میں واقع اپنے باپ کی پر تعیش اور بڑے قد والی کوشی کے بڑے سے بیڈروم کی نیلی جذبات خیز روشنی میں وہ بیڈ پر نیم دراز ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ بڑے کہتے ہیں کہ شراب میں نشہ نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو سب سے پہلے اپنے پیندے کے بل پر بوتل ٹاپنے لگتی۔ ٹی وی کی تنہی سی سکرین میں سوائے متحرک تصویروں کے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر کچھ ہوتا تو وہ بھی اپنے بال سفید کر بیٹھتا۔ کبھی لڑکھڑا کر گر پڑتا۔ کبھی کسی دوشیزہ کی جوانی کو منعکس کرتے ہوئے شور مچانے لگتا۔

بوتل پرسکون تھی۔ پینے والی دھڑکن کی ایک رُوسروں پر کبمل میں لپٹے پیروں میں انجانی پائل باندھے محو رقص تھی۔ دائیں پنڈلی پر بائیں پیر کا لمس بھی عجیب لگ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ غضب کی سردی کے باوجود پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے

چپکنے لگے جن میں سکرین سے پھوٹنے والے رنگ منعکس ہو کر لرزنے لگے تھے۔ اُس نے جذبات آگیاں سانس حلق میں اُتار کر کمبل کے نرم گداز کو سینے میں اُتارنے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی۔ چین نہیں آیا۔ ریموٹ سے ٹی وی آف کر دیا۔ کمرے میں ایک لخت اندھیرا پھیل گیا۔ نائٹ بلب کی نیلی روشنی ناکافی لگنے لگی۔

جوانی میں نہ تو دھڑکن پر قابو پایا جاسکتا ہے اور نہ ہی سانسوں کی بڑھتی گھٹتی رفتار پر دسترس قائم رہتی ہے۔ ٹی وی کا تنہا ساسرخ بلب روشن تھا۔ سکرین یوں مردہ تھی جیسے مرنے والے کی روح نے اچانک اُس کا ساتھ چھوڑ کر ٹھنڈا ٹھار کر دیا ہو۔ مردہ سکرین اپنے آخری منظر کو اُس کی نگاہوں میں ٹھہرانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

وہ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے آہستگی سے اٹھی، کھڑکی تک آئی اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی۔ کھڑکی کھولنے کی ہمت نہ پڑی۔ باہر گہری کہر آلود رات طاری تھی۔ اطراف کے امیر زادوں کی کوٹھیوں پر سکوت طاری تھا۔ رنگ برنگے بلب روشن تھے جو خبر دے رہے تھے کہ مکینوں نے پُر حدت رات اوڑھ رکھی ہے۔ خبردار! کوئی جگانے کی کوشش نہ کرے۔ لیرے سونے والوں کی بے آرمی کو خاطر میں نہیں لایا کرتے۔ دیوار پھاند کر اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ جودن کی روشنی میں اپنے اونچے قد کے باعث سر کے بالوں تک ہاتھ نہیں پہنچتے دیتے، رات کی نیند میں زمین سے دو فٹ متوازن بلند لیٹے ہونے کے باعث بالوں سے پکڑ کر اٹھا دیے جاتے ہیں۔

وہ بالوں سے پکڑ کر اٹھائی نہیں گئی تھی۔ دل پر ہاتھ رکھ کر کسی نے بستر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑبڑائی۔ ”یہ اچانک مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں۔ باپ کہتا ہے کہ میں خاص ہوں۔ میرے جیسی دنیا میں کوئی نہیں۔ پھر میری جوانی عام لڑکیوں کی طرح کیوں بے چین کرنے لگتی ہے۔“

اُس کے باپ نے یونیورسٹی میں بھیجتے ہوئے اُسے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اُسے اپنے لئے جیون ساتھی چننے کی پوری آزادی حاصل ہے مگر آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوڑے کے ڈھیر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جائے۔ سمجھا دیا گیا تھا کہ اُس کی زندگی میں اُترنے والے کو قبولیت کی سند صرف اس صورت میں مل سکتی ہے کہ وہ اُس کا ہم پلہ ہو۔ بڑے نہیں بہت بڑے خاندان کا چشم و چراغ ہو۔

یونیورسٹی میں انسانوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ بھیڑ میں سے کسی اپنے جیسے کو ٹول ٹول کر تلاش کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ گزشتہ تین ماہ سے آنکھوں پر پٹی باندھے ٹولنے میں مصروف تھی۔ انگلیاں چھلنے کو آگئی تھیں مگر کوئی لمس آشنائی کا جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا۔ تنہائی کی ہر رات میں دل کو ٹھنڈی میں جکڑ کر جگانے والا کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

بے دھیانی میں پردے کو تختی سے پکڑ کر جھول گئی۔ پردے کا ہینگر ٹوٹ گیا۔ وہ لہرا کر قالین پر دھپ سے گر گئی۔ پردہ اُس پر غریب کی چادر کی طرح کرکریا سا بھگن ہو گیا۔ اُس نے پردے کو ہٹانے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ گرنے سے تھوڑی سی تکلیف کا احساس ہوا تھا مگر اس کی جذباتی کیفیت پر احسان کرتے ہوئے وہ بھی مزہ دے گیا۔ آنکھیں موندے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

کانی دیر گزر گئی۔ تپتا ہوا بدن ٹھنڈا ہوا تو سردی لگنے لگی۔ اُٹھ کر کمبل میں گھس گئی۔ جی چاہتا تھا کہ ٹی وی آن کر کے بقیہ فلم دیکھے۔ بدن پہلی بار منکر ہو گیا۔ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔ ”اب بہت ہو چکی ہے۔ جھوٹے منظر دکھا دکھا کر مجھے خواہ خواہ آگ کی بھیٹی میں جھونکتی رہتی ہو۔ آگ سے باہر نکال کر نچوڑنے لگتی ہو۔ میں اب بہت ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔ مجھے سونے دو۔“

نیند نہیں آئی تو دروازہ کھول کر متصلہ کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ اُس کی مستقل خدمت گزار رحمت بی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ دروازہ کھول کر بولی۔ ”شانی بی بی! خیر تو ہے؟ اکیلے میں ڈر لگنے لگا ہے کیا؟“

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ رحمت بی دوپٹہ درست کرتی ہوئی اُس کے ساتھ بیڈروم میں آگئی۔ وہ رحمت بی کے نیم بوڑھے بدن سے لپٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ چند لمحوں میں ہی یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ گھٹلی چوسنے سے نہ تو زبان کو ذائقہ ملتا ہے اور نہ ہی بیٹ بھرتا ہے۔ آم دسترس سے باہر تھا اس لئے وہ گھٹلی چوسنے لگی۔ رحمت بی اُس کے لرزتے بدن کو اپنے بدن میں چھپاتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”جوانی تو مجھ پر بھی آئی تھی۔ سوتے میں ڈرنے کی عادت مجھے بھی تھی مگر کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ڈرے ہوئے بدن نے آگ پکڑ لی ہو۔ ڈر ٹھنڈا کرتا ہے، تپانے والا جذبہ کوئی اور ہی نام رکھتا ہے۔ اللہ خیر کرے!“

رحمت بی کے باپ نے اُس کی جوانی کو آگ پکڑنے سے پہلے ہی برف کی سل پر

بوسوں کے ڈرائیور ہارن بجا کر اپنا فرض پورا کر دیتے ہیں۔ کوئی آئے یا نہ آئے، اس سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ زر خرید ڈرائیور تھا۔ اپنی سواری کے مزاج پر چلنے کی تنخواہ وصول کرتا تھا۔ سردار فضل نے اُسے ایک اور فرض بھی سونپ رکھا تھا۔ شانی بی بی جہاں بھی جائے، جس سے ملے اور جو بھی کرے، پل پل کی رپورٹ سردار تک پہنچانے کا معاوضہ اُسے الگ سے ملتا تھا۔

اپنی مسلسل جاسوسی کا شانی کو بھی علم تھا۔ کوئی دل میں چوری کی نیت سے آج تک اُترا ہی نہیں تھا جس کو ڈرائیور کے چہرے پر فٹ باپ کی نگاہوں سے چھپانا مقصود ہوتا۔ اس لئے اُسے کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ پھر آپوں آپ ہی جواں بدن سے گنج اُترنے لگی۔ گزشتہ چند دنوں سے ایک واردات چل رہی تھی۔

وہ ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”میں جلد ہی فارغ ہو جاؤں گی۔ ایک ڈیڑھ بجے تک تم یہیں رہو۔“

وہ گراہی پلاٹوں کے وسط میں بنی ہوئی روش پر چلتی ہوئی اپنے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو گئی۔ سیکنڈ فلوور پر جانے کیلئے زینوں پر رئیس سے قدم مل گئے۔ وہ اُس کے دائیں پہلو میں برابر قدم اٹھاتے ہوئے زینے پھلانگ رہی تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ”عورت کے شانہ بٹانہ چلنے کی خبریں سن رہے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ یقین ہوا کہ واقعی عورت مرد سے قدم ملا کر چلنے کی طاقت رکھتی ہے۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”صدیوں سے دل سے دل ٹکرا کر چلتی عورت پر مرد کو یقین نہیں آیا، تمہیں ایک دن میں کیسے آگیا؟“

وہ لا جواب ہو کر طنزیہ انداز میں بولا۔ ”بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ باپ اپنے حریفوں کو گفتار میں لا جواب کر دیتا ہے، تم اپنے حلیف کے ہونٹوں پر چپ کا قفل لگا دیتی ہو۔“

وہ ریٹنگ پکڑ کر ہنسنے لگی۔ رئیس دل فگار نظارے کی زد پر بے خود ہونے لگا۔ بولا۔ ”اب کیا ہوا؟“

وہ خود پر قابو پاتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں، تم بڑے باپ کا بیٹا ہونے کے ساتھ ساتھ با اختیار وزیر کے بھائی بھی ہو۔ جو جتنا جھوٹا ہوتا ہے، اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمہارے گھر میں دو بڑے موجود ہیں۔“

جمادیا تھا۔ وہ بمشکل اٹھارویں سن میں پہنچی تھی کہ باپ نے بیاہ کر اپنے بھتیجے کے حوالے کر دیا۔ علی محمد اُس وقت تیس کا تھا۔ غریبوں کے گھروں میں ایسی شادیوں کو بے جوڑ قرار نہیں دیا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے کہ دلہن کو دلہا سے دس پندرہ سال کم عمر ہی ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہی تو کہا جاتا ہے۔ غریب زادی کا بدن بہت جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

وہ سوچنے لگی کہ سردار فضل کے ہاں کس چیز کی کمی ہے۔ کروڑوں روپے کا جہیز تیار پڑا ہے۔ برادری اُس کے دروازے پر آئے روز ماتھا ٹکینے کیلئے آئی رہتی ہے۔ بیٹی بائیسویں سال میں قدم رکھ چکی ہے۔ چڑھی جوانی کو محبت کی پان چڑھا کر میان میں رکھ دینا چاہیے ورنہ کسی سکندر کے ہاتھ میں آ کر قتل و غارت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اُس نے ایک مرتبہ دبے دبے لفظوں میں سردار سے اُس کی شادی کی بات چھیڑی تھی۔ سردار نے یہ کہہ کر اُس کی زباں بند کر دی تھی کہ ابھی مناسب وقت نہیں آیا۔ جب آئے گا، شادی کر دی جائے گی۔ چودہ سال تک شادی کی کڑا ہی میں تیل کی طرح تڑکنے والی رحمت بی اُس کے وجود کی حدت کو محسوس کرتے ہوئے پریشان ہو رہی تھی کہ مناسب وقت اور کیا ہوتا ہے؟

صبح دیر سے اٹھی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر نیچے اُتر آئی۔ ڈرائیور اور باڈی گارڈ چوکس انداز میں کھڑے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اچلتی ہوئی نگاہ دونوں پر ڈال کر، سلام کا جواب دے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بیک مرر میں جھانکنے سے ڈرائیور کی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ آج مرر ہلا ہوا تھا۔ بے دھیانی میں بیک مرر پر نگاہ پڑی تو اپنی ہی آنکھیں دکھائی دیں۔ ہیجان شب نے آنکھوں میں لال دُورے نصب کر دیے تھے۔ اُس کی سہیلیاں ستائش بھرے لہجے میں کہا کرتی تھیں۔ ”شانی ڈیر! تمہاری آنکھیں بڑی مدھ بھری ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے تم نے پی رکھی ہے۔ آنکھوں میں جھانکنے والے پر بھی نشہ چڑھنے لگتا ہے۔ کون سا کاجل استعمال کرتی ہو؟“

وہ رات بھر آنکھوں میں چھپنے والے کاجل کا نام نہیں بتا سکتی تھی۔ جھینپ کر منہ پھیر لیا کرتی تھی۔ دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ اُس نے ادا سے اپنی آنکھیں چھپائی ہیں۔ ایسا نہیں تھا، وہ دل کی چوری کو چھپا کر مسکرایا کرتی تھی۔ کیسپس میں پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی اپنی مخصوص جگہ پر کھڑی کر دی۔ اُس کیلئے دروازہ کھول کر بولا۔ ”شانی بی بی! آج کس وقت تک فارغ ہو جائیں گی؟“

”پوری کلاس میں سفید کبوتر میری چھت پر اُتار کر تماشا بنادیا اور کام کی بات کوئی لکھی ہی نہیں۔“

پرچی کو بے دردی سے پھاڑ کر پھینکتے ہوئے اپنی کھلی ہوئی کتاب پر جھک گئی۔ اپنے تاثرات سے اُس نے سب پر واضح کر دیا تھا کہ وہ ایسی لڑکی نہیں جو اُڑ کر صحن میں آنے والے کبوتر کو دیکھنے کیلئے اپنے قد سے جھک جاتی ہو۔ ایک ادا سے سر جھٹک کر سوچنے لگی۔ ”میں نادان بھی ہوں۔ ایسی پرچی روانہ کرنے کا مقصد اپنی آمد کی اطلاع دینا ہوتا ہے۔ آنے والے کی ایسی اطلاع کو آڑے ہاتھوں نہیں، کھلے دل سے وصول کرنا پڑتا ہے۔ آج اُس نے سوال پوچھا ہے، کل سوال کے جواب میں دھڑکن کی تال پر جھومتے وجود کو سراہنے کیلئے آئے گا۔ برا کیا جو اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا۔“

کلاس سے جی اکتانے لگا تو بلا جواز اُٹھ کر باہر آ گئی۔ کارڈور کے آخری سرے پر بنی ریلنگ کو تھام کر کھڑی بھگئی۔ زمین پر چلتے اچلے اچلے لوگ فرسٹ فلور سے دیکھنے میں یوں لگ رہے تھے جیسے بونے قدم بوسی کیلئے ادھر ادھر دوڑ رہے ہوں۔ چند لمحوں ہی گزرے تھے کہ رئیس اُس کے پیچھے چلا ہوا ریلنگ کے پاس آ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ”معذرت چاہتا ہوں۔ کبھی کسی لڑکی سے دُک کر بات نہیں کی۔ ڈر کر پیار نہیں کیا۔ پہلی مرتبہ تمہارے سامنے اپنے بڑے قد کو چھوٹا پایا اور ایسی بچکانہ حرکت کر ڈالی۔“

وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ لال ڈوروں والی آنکھوں میں ابھی تک خفگی پلٹیں لے رہی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بولی۔ ”یہ کیسی ندامت ہے جس میں ہاتھ بھی جوڑے جاتے ہیں اور چہرے پر شرارت کے تاثرات بھی دکھائی دیتے ہیں؟“

وہ شرمسار ہو کر بولا۔ ”میرے باپ نے مجھے کہا تھا کہ یونیورسٹی میں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ اپنے لئے دنیا جہان کے چہروں سے رنگ چرانا مگر ہمارے لئے صرف اور صرف اُس لڑکی کو پسند کر کے لانا جو ہمارے شایان شان خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ لڑکی تو بس لڑکی ہی ہوتی ہے۔ غریب ہو یا امیر۔ دونوں کے اہزائے ترکیبی ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ تم خوبصورت دکھائی دیتی تھیں مگر کلاس کی ہر لڑکی کی طرح۔ جب پتہ چلا کہ تم میرے ہم پلہ بھی ہو تو پھر عام دکھائی نہیں دیں۔ خاص

”یہ کیسپس ہے۔ یہاں ایسی باتیں کر کے ہم اپنا خاندانی قد چھوٹا کر بیٹھیں گے۔“ آنکھیں جراتے ہوئے بولا۔ ”کم آن! کلاس کا وقت ہو رہا ہے۔“

کارڈور خاصا لمبا تھا۔ اُس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”جو راستے دل سے نکل کر دل کی طرف جاتے ہیں، وہ اتنے مختصر کیوں ہوتے ہیں۔ اس کارڈور کو اتنا لمبا ہونا چاہیے تھا کہ چلتے چلتے زندگی کا سفر تمام ہو جاتا۔“

کارڈور کا سفر ابھی باقی تھا مگر کلاس روم کے دروازے پر پہنچ کر رئیس رُک گیا۔ پیچھے کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیڈر فرسٹ!“

وہ شاہانہ انداز میں مسکراتی ہوئی قدم بڑھا کر کلاس روم میں داخل ہو گئی۔ کلاس میں عائدہ سنجیدگی سے وقت گزارا کرتی تھی۔ حسب معمول اپنی نشست پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ ”رئیس کو سال بھر سے دیکھتی آرہی ہوں۔ عام دکھائی دینے والا آج بے سبب اچھا کیوں لگے لگا ہے؟“

رئیس کی شخصیت پر کشش تھی۔ اونچا لبا قد..... گہری بھوری آنکھیں اور سلیقے سے سنواری ہوئی شخصیت لڑکیوں کے دل میں آئیڈیل کی طرح بس جاتی تھی۔ شانی کبھی اُس سے متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی روز بدلتی دوستوں کو دیکھ کر سوچا کرتی کہ ان سب کو کیا ہو گیا ہے؟ کیوں یہ ایک ہر جائی صفت انسان کیلئے اپنی شخصیت پر انگلیاں اٹھوانا قبول کر لیتی ہیں؟..... گزشتہ چند دنوں سے وہ بھی اُس میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ خراب بور والے نلکے میں پانی چڑھانے والا اُس کی آواز سے اندازہ لگا لیتا ہے کہ پانی آنے والا ہے۔ رئیس کا یاں مرد تھا۔ بھانپ گیا کہ نلکے کی نال پانی اٹھیلنے والی ہے۔ چلو بڑھا کر کھڑا ہو گیا۔

آنکھ بچا کر کاغذ کی ایک چٹ اُس کے ڈیسک پر رکھتے ہوئے بولا۔

”جواب ضرور دینا۔“

اُس نے حیرانی سے دل کا سندیہ لانے والی ننھی سی کاغذ کی چٹ کو دیکھا۔ لکھا تھا۔

”تمہاری گاڑی کا ڈرائیور اور باڈی گارڈ دونوں تمہارے تنخواہ دار ہیں یا تمہارے باپ کے؟“

وہ حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات آنکھوں میں لئے رئیس کو دیکھنے لگی۔ اطراف میں بیٹھنے والوں کی نظریں اُس پر گڑی ہوئی تھیں۔ دل ہی دل میں کوسے کوسے بولی۔

ہو کر دل کے خاص خانے میں براجمان ہو گئی ہو۔“

وہ مسکرائی۔ ”تقریر کرنے کے دوران سانس لینا ضروری ہوتا ہے ورنہ علمیت دکھانے کے چکر میں آدمی تماشا بن جاتا ہے۔“

وہ شکوہ کنال نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں تقریر نہیں کر رہا ہوں۔ اپنے حقیقی جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ کافی دنوں سے سوچ میں تھا کہ تم سے اظہار محبت کر دوں یا نہ کر دوں۔ آج اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ سچ کو ایک بار چھپا لیا جائے تو عمر بھر جھوٹ کے پیچھے ننگے پیر بھاگنا پڑتا ہے اور سچ یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

وہ پہلی مرتبہ محبت کے اظہار کی دارفتہ لذت سے آشنا نہیں ہوئی تھی۔ کئی مردوں نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود سرسے پاؤں تک سرور میں ڈوب گئی۔ وہ اس کی خاموشی کو اقرار جان کر گرم لوہے کو چوٹ لگانے لگا۔ ”تم خفا ہو گئیں کہ میں نے چٹ پر بے ٹکا سا سوال لکھ کر بھیجا اور کلاس میں تمہیں تماشا بنا دیا۔ تم سوال کو سمجھ ہی نہ پائیں۔ میں نے پوچھا تھا کہ تمہارا ڈرائیور اور باڈی گارڈ کیا تمہارے راز کی حفاظت کرے گا یا وہ میری فلم بنا کر تمہارے باپ کے دی سی آر میں ڈال کر چلا دے گا۔ تم کبھی نہیں یاتم نے سمجھنا چاہا ہی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے محبت.....“

وہ ہاتھ اٹھا اس کی لمبی زبان کو لگام ڈالتے ہوئے بولی۔ ”پلیئر! کتنی لڑکیوں کو اس تین دیواروں والے جھنگے میں پھنسانے کی کوشش کر دو گے؟ مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش میں تمام عمر کا چھتتا والے کریمپس سے نکال دیے جاؤ گے۔“

محبوبہ محبت کی بجائے دھمکیوں کی زبان بولنے لگی تھی۔ وہ اس سے کم تر نہیں تھا۔ سیر پر سوا سیر تھا مگر عشق کی بازی طاقت سے نہیں، ترکیب سے کھیلنا پڑتی ہے۔ مسکرانے لگا۔ بیٹھ موڑ کر بولا۔ ”کیمپس سے تمہارا وجود پھرانے کے جرم میں نکال دیا گیا تو بھی غم نہیں ہوگا۔ جاتے جاتے تمہیں اپنی جیب میں ڈالتا جاؤں گا۔ مجھے دھمکیاں مت دو۔ میرے لئے تمہاری تازیانے کی طرح چلتی زبان ہی کافی ہے۔“

دل میں جوت جگا کر جانے لگا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا زینوں کی طرف جا رہا تھا۔ دل نے کچوک لگایا۔ نادان! تمہیں مجھ سے ہمیشہ دشمنی رہی ہے۔ اس نے پرچی میں دل لپیٹ کر تمہارے ڈیسک پر رکھا تو تم سمجھ نہ پائیں۔ اپنے

سچے جذباتوں کا اظہار کیا تو دھمکیوں پر اتر آئیں۔ کیوں؟ وہ بڑے ظرف کا مالک ہے۔ تم سے زیادہ رسوخ والے خاندان کا بیٹا ہونے کے باوجود دھمکیاں سن کر محبت کی زبان بولتا رہا۔ اُسے رد کر لو ورنہ کبھی پلٹ کر نہیں دیکھے گا۔

اس نے منہ کھولا۔ نام لے کر بلند آواز میں پکارنا چاہتی تھی مگر شرم آڑے آگئی۔ دل کو کونے لگی۔ کیسے بدتمیز ہوتی۔ عورت کا گھنا اس کی شرم ہوتی ہے۔ تم میری لاج پال چادر کو اتار پھینک کر اپنی دنیا بسانا چاہتے ہو۔ وہ جاتا ہے تو جائے، مجھے کیا؟ پلٹنے والا ہوگا تو پلٹ آئے گا۔ نہ جھکنے والا ہوگا تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھے گا۔ ایسا خود سر مرد مجھے نہیں چاہیے۔ میں سردار فضل خان کی بیٹی شاہانہ ہوں۔ اپنے قدموں میں جھکے ہوئے مرد کے سر پر تاج کی طرح بیٹھوں گی۔

وہ زینوں کے قریب پہنچ کر رُکا۔ چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ آہستگی سے پلٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا کہ ابھی پُرگداز سرخ سرخ ہونٹوں پر اس کا نام پڑاؤ کی دعوت بن کر ابھرے گا اور وہ رُک جائے گا۔ اپنی اپنی مچانوں میں دُکے ایک دوسرے کو نظریں جمائے دیکھتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پچھڑاٹا چاہتے تھے۔ کوئی بھی سر جھکانے پر آمادہ نہ ہوا تو ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو گئے۔ وہ ہونٹ بھینچ کر زینے اترنے لگا۔ پانچ زینے اتر کر ایک بار پھر ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑی شاہانہ کو دیکھنے لگا۔ ایسے میں اس کی نظروں کی سیدھ میں شاہانہ کے پیر دکھائی دے رہے تھے۔ تب سمجھ میں آیا کہ نیچے اترنے سے مد مقابل کے پیروں کے برابر سر آ جاتا ہے۔ ٹھٹک گیا۔ اُنا کو ٹھیس لگی۔ کچھ دیر کھڑا تملتا رہا پھر سر جھٹک کر تیز تیز قدموں سے نیچے اترتا گیا۔

کئی منٹوں تک ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑی کیمپس میں بننے پھڑتے جوڑوں کو دیکھتی رہی۔ اس نے یہ بھی بڑی توجہ سے دیکھا کہ عتابی سوٹ میں ملبوس ایک تتلی چند لمحے ایک پھول پر بیٹھی رُس چوسنے کا لطف لیتی رہی، پھر اڑ کر دوسرے پھول پر بیٹھ گئی۔ چمکتے بالوں والا لڑکا اس کا ہاتھ تھامے گرا سی پلاٹ میں ٹہل رہا تھا۔ دونوں کی آواز اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ ہلتے لمبوں سے اندازہ لگانے لگی کہ دونوں محبت کا اظہار کرنے میں ایک دوسرے پر لفظوں کی برتری پانے کی جہت میں لگے ہوئے ہیں۔ سوچنے لگی کہ تتلی ایک پھول سے سیراب کیوں کر نہیں ہو پاتی؟ ایک کے بعد دوسرے پھول کے رنگ اُسے کیوں لہانے

اندازہ لگایا جاسکے کہ محبت کی واردات ہوگئی ہے؟“
جہانمیدہ عورت تھی۔ چھوٹے گھر سے نکل کر بڑے گھر کے بھید کھلتے دیکھ رہی تھی۔ اُس پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے محبت کی ہے یا نہیں، تمہارا دماغ مجھے خراب ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔“

وہ ہنسنے لگی۔ ہنسنے ہنسنے دوہری ہوگئی۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر بولی۔ ”واہ رحمت بی! کیا دل کی بوچھے لگتی ہو۔ اب یہ پوچھو کہ مجھے کس سے محبت ہوگئی ہے؟“
وہ اٹھ کر دوپٹہ سنبھالتے ہوئے کمرے سے نکلنے لگی۔ دروازے پر رک کر بولی۔ ”شانی بی! راز اپنی ذات تک محدود رہے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہتا ہے۔ زبان کی نوک پر آن بیٹھے تو ہر طرف سے آگ کی پلٹیں زمین سے اُٹھ کر آسمان کو چھونے لگتی ہیں۔ میں کم ذات ہوں۔ مجھے اپنے راز میں شریک مت کر۔“

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر رحمت بی اُسے کوئی موقع دیے بغیر باہر نکل گئی۔ ڈر کر جاتے ہوئے سمجھا گئی۔ ”نادان لڑکی! محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔ ہونی کو ہونے تک چھپائے رکھنا چاہیے ورنہ حالات خراب ہو جاتے ہیں۔“



چاروں ملک فرید کے آراستہ مہمان خانے کے بڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تواضع کے لوازمات ٹیبل پر ڈھیر ہو چکے تو ملک فرید نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔ رحمت بن کر اترے تو دل میں جگہ دی جاتی ہے، آنکھوں پر بیٹھایا جاتا ہے۔ میرے دل و نظر کے دروازے آپ کیلئے کھلے ہیں۔“

”ملک صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے۔“ سردار نے مصنوعی خوشی کو چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے خوشی ہوئی کہ آپ میرے بارے میں ایسے خیالات رکھتے ہیں۔ بس سیاسی مصروفیات ہی مجھے آپ جیسے بڑے لوگوں سے دور رکھتی آئی ہیں وگرنہ کئی بار دل چاہا کہ آپ سے ملاقات کروں۔ آج خواہش پوری ہوگئی ہے۔“

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد سردار فضل نے اپنے مقصد پر آتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ نور پور میں لوکل باڈیز کے انتخابات کیلئے ایسے بندے کو کھڑا کیا جائے جو عوام کی فلاح کا سچا جذبہ دل میں رکھتا ہو۔ اس سلسلے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔“

لگتے ہیں؟..... صدیوں کی عورت کو اس نکتے کی سمجھ نہیں آئی تھی، اُس پر آگہی کا ذکر کیوں کر کھل جاتا۔

پھر یہ حقیقی وڈیو کلپ بھی اُسے بور کرنے لگے۔ آہستہ رومی سے چلتی ہوئی اپنی گاڑی تک آئی۔ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”آدھا گھنٹہ سڑکوں پر گاڑی آہستہ رفتار سے چلاتے رہو۔ کوشش کرنا کہ کم بھیڑ والے راستوں سے گزر ہو۔“

ڈرائیور نے گاڑی بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بی بی جی! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکچر نہیں ہوا۔ بیٹھ بیٹھ کر خاصی بور ہوگئی ہوں۔“
وہ پہلے بھی کبھی کبھار ایسا حکم جاری کر دیتی تھی۔ اُس نے گاڑی کو ایک سڑک پر ڈال دیا۔ اگلی سیٹ پر باؤی گاڑ ڈال اپنی گن تھامے جو کس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرانے لگی۔ ”پاپا نے میری نگہداشت کیلئے باؤی گاڑ رکھ کر اطمینان حاصل کر لیا ہے۔ اتنی عمر گزار کر کبھی اُسے پتہ نہیں چلتا کہ لڑکی کے بدن کی رکھوالی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ آنکھ کی شوخی سے پکڑی جاتی ہے اور دل کی دنیا سے اغوا ہو جاتی ہے۔ بدن تو مٹی کے ڈھیر کی صورت میں بے حرکت ایک جگہ پر پڑا رہتا ہے۔“

ایک گھنٹے کے بعد اپنے کمرے میں پہنچ کر چیخ کرنے لگی۔ رحمت بی نے حسب معمول اُس کے سر میں تیل ڈال کر ماش کی۔ اُسے سونے کا مشورہ دیتے ہوئے بیڈ پر چڑھا دیا۔
بولی۔ ”رحمت بی! ایک بات پوچھوں؟“
وہ مستفسر نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

وہ بولی۔ ”تم نے جوانی میں کسی سے محبت کی تھی؟“
رحمت بی چونک اٹھی۔ دل میں بولی۔ ”یہ سوال کسی عورت سے کرنے کی ضرورت کیا ہے؟..... کبھی کوئی دل محبت سے خالی بھی ہوا ہے جو مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ میں نے کبھی محبت کی ہے یا نہیں؟“

چند لمحے حیرت سے دیکھنے کے بعد بولی۔ ”شانی بی! یہ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟“
وہ مسکرا کر بولی۔ ”میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ جب آدمی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو اُس پر کیا گزرتی ہے؟ کس قسم کی بے چینی دماغ میں بھر جاتی ہے جسے محسوس کرے؟“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر میں یہ سمجھ نہیں پایا کہ اس سلسلے میں آپ کو میرے پاس آنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟“ ملک فرید نے پُر استغلال لہجے میں کہا۔ ”میں کوئی سیاسی آدمی تو ہوں نہیں اور نہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہوں۔ پھر؟“

سردار نے کن اکھیوں سے عالمگیر کو دیکھا۔ گلا کھنکھار کر بولا۔ ”بات یہ ہے ملک صاحب! کہ آپ کس نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ اپنے دل میں رکے ہوئے غریب پروری کے سچے جذبے کو طاقت بناتے ہوئے مضبوط قدموں سے سیاست میں قدم رنجہ فرمائیں۔ سچی بات ہے کہ اگر آپ یہ ایکشن لڑیں تو نہ صرف بڑے میڈیٹ سے جیتیں گے بلکہ یہاں کے لوگوں کو بھی بڑا آسرا مل جائے گا۔“

ملک فرید مسکرانے لگا۔ اُس کی مسکراہٹ سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لہذا توقف کے بعد بولا۔ ”یہ تو طے ہے کہ میں کبھی بھی سیاست میں نہیں آؤں گا۔ رہی بات عوامی فلاح کی..... تو اس سلسلے میں گاؤں کے لوگوں نے ایک جسارت کی ہے جس پر میرا دل خوش ہوا ہے۔ اپنا وہ چوہدری باسط ہے ناں! اُسے اور پٹھان برادری کے شکور خان کو لوگوں نے متفقہ طور پر ایکشن میں کھڑا کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دونوں بندے ہی کھانے والے نہیں ہیں۔“

سردار نے اپنی بساط بچھا دی۔ سر ہلا کر بولا۔ ”بہت اچھا کیا نور پور کے لوگوں نے۔ اس کے باوجود کہ چوہدری باسط سے میرے تعلقات اچھے نہیں ہیں، میں مانتا ہوں کہ بہت اچھا عوامی نمائندہ ثابت ہوگا۔ ایک گزارش کرنا چاہوں گا کہ اُسے ہماری پارٹی کے پلیٹ فارم سے کھڑا کیجئے۔ تاکہ میں بھی کھلم کھلا اُس کی تائید اور مدد کر سکوں۔ دیکھیں ناں! سیاست کے بھی کچھ قواعد و ضوابط ہوتے ہیں جن پر مجبوراً ہمیں چلنا پڑتا ہے۔ اگر ہماری پارٹی کی قیادت اس حلقے میں اپنا کوئی امیدوار کھڑا کرتی ہے تو مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی معاونت کرنا پڑے گی۔ اس سے ہم سب کا نقصان ہوگا اور تعلقات خراب ہوں گے۔“

سردار نے اپنی چال چل دی تھی۔ ایک پیادہ اگلی رو میں پہنچا دیا تھا۔ ملک نے دیکھا۔ غور کیا۔ اپنے پیادوں کا جائزہ لیا۔ پھر ہنکارا بھر کر بولا۔ ”میں بات کی گہرائی میں پہنچ چکا ہوں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کو تعلقات قائم رکھنے کی خواہش ہے۔ اس خواہش پر چل کر میرے غریب خانے پر آنے کو سراہتا ہوں مگر آپ کی پارٹی میں شمولیت کیلئے آپ کی

بڑی سرکار کے قدموں میں سر رکھنا پڑے گا۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔“ اُسے شرمندگی کا احساس ہوا۔ بولا۔ ”میں آپ کو پارٹی میں شمولیت کی دعوت نہیں دے رہا ہوں، میں تو چوہدری باسط اور پٹھان کو.....“

ملک نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ایک ہی بات ہے سردار فضل خان! میں جانتا ہوں کہ عوام چاہے یا نہ چاہے، اُوپر والوں کے چاہنے پر بڑی سرکار نے ہی میدان مار لینا ہے۔ اُس سے ٹکر لے کر ہمارے جیتے ہوئے نمائندوں کو مساوی فہم نہیں ملے گا۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کی پارٹی میں شامل ہو کر دس کروڑ میں سے پچاس لاکھ تو مل ہی جائیں گے۔ اتنی تھوڑی رقم بھی ہمارے گاؤں کی ترقی کیلئے کافی ہے مگر یہاں کے عوام بڑی سرکار سے سخت تالاں ہیں۔ وہ اُس کے کھڑے کئے ہوئے بندے کو آگے نہیں لانا چاہتے۔“

سردار نے اپنے توپخانے کی پوزیشن بدلی۔ ”آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ چوہدری باسط کو کسی بھی پارٹی کے شید میں کھڑا نہیں کرتے۔ میں بھی کوشش کرتا ہوں، آپ بھی کریں۔ جب وہ جیت جائے تو ہماری پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دے۔ جیتنے کے بعد عوام کا کوئی اختیار نہیں رہے گا۔“

ملک فرید بڑے غور سے سردار کو دیکھنے لگا۔ ملی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ سانپ نے گنج اتار لی تھی محتاط انداز میں بولا۔ ”کیا یہ عوام کے ساتھ کھلا دھوکہ نہیں ہوگا؟“

سردار کہنا تو چاہتا تھا کہ۔ ”عوام کو کب کھلے دھوکے میں نہیں رکھا گیا؟ ہر کوئی سبز باغ دکھا کر اپنا اُلوسیدھا کرتا ہے اور پلٹ کر خبر نہیں لیتا۔ چوہدری باسط ایسا کر لے گا تو کیا جرم ہوگا؟“ دل کی بات دل میں ہی رکھ کر بولا۔ ”ہمیں اس رخ سے نہیں سوچنا چاہیے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کس راستے پر چلنے سے ہمارے عوام کو مفاد حاصل ہوتا ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ اوپر والے کھاتے ہیں۔ نیچے والے بھی اپنا حصہ نکال لیتے ہیں۔ عوام کو کچھ نہیں ملتا۔ ہم عوام کو کچھ لے کر دینے کیلئے اگر اپنی خواہش اور مرضی کو دبا دیں تو بے ضمیری نہیں ہوگی۔ وہ جھوٹ ضرور بولنا چاہیے جس سے کسی غریب کا فائدہ ہوتا ہو۔“

ملک معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ جو کہنا نہیں چاہتا تھا، آنکھوں سے ہویدا ہونے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ کڑا اپنا مطلب نکالنے کیلئے لہجے میں اتنی شیرینی گھول لیتا ہے کہ مکھی نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے دام میں آ جاتی ہے۔ پہلو بچا کر نکلتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ

میں یہ نہیں آیا کہ اسی رقبہ کے سامنے آپ کا سیکٹروں ایکڑ رقبہ پڑا ہے، آپ وہاں سکول اور جنازہ گاہ کیوں نہیں بنوادیتے؟“

طمانچہ رخ موڑ کر اپنے منہ پر آن لگا۔ لا جواب ہو کر بولا۔

”اس زمین کی لوکیشن ایسے کاموں کیلئے بہت آئیڈیل ہے۔ بہر حال! یہ الگ موضوع ہے۔ آپ اس پیشکش پر توجہ دیجئے جو میں نے آپ کو دی ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ بڑی سرکار سے اپائنٹ منٹ ہے۔“

عالمگیر اور منیرا قصائی، سردار فضل خان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کوشی سے باہر آ گئے۔ عالمگیر نے منیرے سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”کوشش کرنا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔“

منیرا سر ہلانے کے ساتھ ساتھ بھی ہلانے لگا۔ ”الوداع میرے ہمزاد! میرے دوست! الوداع!“

نورپور سے نکلتے ہوئے عالمگیر نے بشیر خان سے فون پر رابطہ کیا۔ دریافت کیا۔ ”شبر اور خادم کو دریا پار بھیجا ہے یا نہیں؟“

دوسری طرف کی بات سن کر فون بند کرتے ہوئے سردار سے مخاطب ہوا۔ ”سردار! بڑی سرکار کے حکم کے مطابق میں نے پار والے رسہ گیروں کو یہاں آنے کی دعوت شبر کے ہاتھ بھیج دی ہے۔ رفیع اللہ کو دریائی مگر چھوٹوں میں اتنا الجھا دوں گا کہ وہ ہم پر توجہ ہی نہ دے سکے۔“

سردار گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ سنی اُن سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنے کام کے بارے میں بہتر جانتے ہو۔ میں ملک فرید کے بارے میں متفکر ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ میری بات مان لے گا۔“

عالمگیر نے کہا۔ ”وہ مانے یا نہ مانے، چوہدری باسط کو میں اپنی راہ پر لگانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

سردار کا چہرہ پریشانوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ طویل اور پرخطر سیاسی سفر میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اُس کے چاروں طرف دشمنوں کی گھاتیں آباد ہو گئی ہوں۔ وہ ہار ماننے اور جھکے والا بندہ نہیں تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو کر ایسی باسط بچھانا چاہتا تھا کہ اُس کے

کے خیالات کو تہہ دل سے سراہتا ہوں۔ مجھے اپنے دوستوں سے مشورہ کرنے کا وقت دیجئے۔ اللہ بھلی کرے گا۔“

”اوکے!“ سردار نے کہا۔ ”مجھے بھی کوئی جلدی نہیں۔ ہاں! ایک خوشخبری سنی ہے۔ پتہ چلا ہے کہ رفیع اللہ کا تبادلہ ہمارے تھانے میں ہو گیا ہے۔ یہاں کے لو فرسدر جائیں گے۔“ ملک نے مصنوعی حیرانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا! مجھے پتہ نہیں چلا۔ سردار صاحب! ایک آدمی کی ایمانداری لاکھوں بے ایمانیوں کا راستہ نہیں روک سکتی۔ جب زنجیریں دروازوں پر لٹکانے والے شہنشاہ ہی ہاتھ کاٹنے پر لگے ہوئے ہوں تو وہ کیا کر سکے گا؟ پکڑ کر چالان کر دے گا اور بس..... با اختیار مجرم قانونی پیچیدگیوں کا سہارا لے کر صاف نکل جائیں گے۔“

ادھر ادھر کی کچھ رسمی باتوں کے بعد سردار نے پھر باتوں کے ریوڑ کو اپنے مفاد کی پگڈنڈی پر ہانک دیا۔ اُس کی ایک چال باقی تھی۔ وہ بھی چل دی۔ بولا۔ ”ایک اور معاملہ بھی آپ سے ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔ وہ زمین جو آپ نے شوکت علی سے خریدی ہے، وہ اپنا جائز منافع رکھ کر مجھے دے دیجئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس میں سے چار کنال رقبہ میں گاؤں کی جنازہ گاہ کیلئے وقف کر دوں۔ ایک زنانہ پرائمری سکول گاؤں کیلئے تاکافی ہے۔ ایک ایکڑ محکمہ تعلیم کو دے کر اُس پر سکول منظور کرانے کی کوشش کروں۔ کوئی علم نہیں کہ میری کون سی نیکی خدا کے ہاں منظور ہو جائے اور میں سرخرو ہو جاؤں۔“

چال بڑی جاندار تھی۔ ملک پہلو بدل کر رہ گیا۔

سردار نے مزید کہا۔ ”اسی ارادے سے میں نے شوکت علی سے بھی کہا تھا کہ وہ مارکیٹ ریٹ پر زمین مجھے بیچ دے۔ وہ نہیں مانا۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ آپ جیسے طرف والے آدمی کے ہاتھ رقبہ بیچ گیا۔ آپ میری بات کو سمجھ رہے ہیں ناں؟“

ملک نے دل ہی دل میں کہا۔ ”دنیا کو احق سمجھنے والے فرعون! سکول اور جنازہ گاہ بنانے کیلئے بندوق کے بل پر رقبہ نہیں خریدا جاتا۔ اگر ایسا کیا جائے تو خدا راضی ہونے کی بجائے ناراض ہوتا ہے۔“

جھوٹے کی چھائی ہوئی باسط پر جھوٹے مہرے کو ہی بڑھانا پڑتا ہے۔ وہ دل پذیر لہجے میں بولا۔ ”خوش کر دیا سردار فضل خان! بہت اچھی سوچ رکھتے ہیں آپ۔ لیکن میری سمجھ

دی تھی۔

اپنی ویران حویلی میں پہنچا تو پتہ چلا کہ دریا پار جانے والے ابھی تک نہیں پلٹے تھے۔ وہ سیکر کی مساک کو دانتوں تلے چباتے ہوئے جنگل کی طرف نکل گیا۔ جنگلی گھاس کرتک بلند تھی۔ کانٹوں سے بچتے بچاتے وہ دریا کے تین پر پہنچ گیا۔ ذہنی طور پر کافی الجھا ہوا تھا۔ دریا کے خوبصورت منظر نے اُس کی توجہ بٹاتے ہوئے خطرات کی دنیا سے عارضی طور پر غافل کر دیا۔ وہ جوتے اتار کر پانی میں اتر گیا۔ ٹھنڈا اور شفاف پانی اُس کے اضطراب کو جذب کرنے لگا۔ پانی گھٹنوں تک پہنچا تو اُس نے پیش قدمی روکتے ہوئے منہ ہاتھ دھوئے۔ چلو میں پانی بھر کر سیر ہونے تک پیاس بجھائی۔ پھر پانی سے نکل کر کنارے پر آن بیٹھا۔ تاحد نگاہ کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہر طرف پانی..... دریائی مٹی کی بھینی بھینی مخصوص مہک..... درختوں کی سرگوشیاں..... مینڈکوں کی پانی میں چھلانگیں لگانے اور ٹرانے کی آوازیں اور..... کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہی دریا زندگی کو بچاتا ہے، جب اپنی بساط سے پاؤں پھیلاتا ہے تو موت اور تباہی بانٹنے لگتا ہے۔ انسان بھی دریا کی طرح تب تک پرسکون رہتا ہے جب تک اُس کے ظرف کے مطابق خدا اُسے دیتا رہتا ہے۔ جب متجاوز ہو جاتا ہے تو دوسروں کیلئے عذاب بن جاتا ہے۔ سردار بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔

اُس کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ دولت بے حد و حساب تھی۔ پچاس مربعوں کے قریب زرعی اراضی تھی جو اُس کی دولت میں ہر فصل پر بے تحاشا اضافہ کر دیتی تھی۔ انتخابی موسم پر لاکھوں روپے انویسٹ کر کے کروڑوں کی فصل آنے والے ایکشن تک کاٹا رہتا تھا۔ ہر گاؤں میں اُس نے ایک ٹاؤٹ بنا رکھا تھا جو اُس کیلئے کماتا تھا۔ لومڑی طرح شیر کا جھوٹا کھا کر گریبان کھول کر گھوما کرتا تھا۔ اوپر سے نیچے تک ہتھیلی کے حرام کی بھیک مانگنے والے نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کس کیلئے یہ سب کچھ کر رہا تھا؟ ایک بیٹی کیلئے۔ حالانکہ وہ جتنا کچھ اکٹھا کر چکا تھا وہ دس بیٹیوں کی دس نسلوں کیلئے کافی تھا۔ ہوس ختم ہونے کی بجائے مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔

اُسے اپنی ماں یاد آ گئی۔ آدھا دن گارمنٹ فیکٹری میں ملازمت کرتی۔ باقی دن سلائی کڑھائی کر کے چند نکلے جوڑتی۔ کچھ سے پیٹ بھر لیتی، کچھ سے تن ڈھانپ لیتی۔ کہیں سے بیٹے کیلئے یونیفارم مانگ لاتی تو کہیں سے اُس کے سکول کی فیس۔ کسی گھر سے سیکنڈ ہینڈ

تمام دشمن آپوں آپ پھنستے چلے جائیں۔ ایک ایک کر کے وہ سب کو نیچا دکھا سکتا تھا۔ مل کر آنے والوں کی مچانوں میں آگ لگانے کیلئے کوئی انوکھا لائحہ عمل تیار کرنا چاہتا تھا۔ غلیظ پر تھانے کی سیاست سے وہ دشمن کی جڑیں کھوکھلی کر دیا کرتا تھا۔ رفیع اللہ کے آنے سے یہ محاذ اُس کے ہاتھ سے نکلنے والا تھا۔ اپنے اوپر بیٹھے خدائی دعویداروں کی دہلیز پر ہاتھ ایک کر وہ اپنی سیاسی دکان پر سودا ختم نہیں ہونے دیتا تھا۔ سجدہ گاہ تک جانے کے راستے میں ملک فرید سینہ پھلا کر کھڑا ہونے والا تھا۔

فرعون کو بھی کبھی کبھی خدا کی یاد آ جایا کرتی تھی۔ اچھے پتوں کی خواہش میں وہ بھی خدا کے آگے جھک رہا تھا اور کئے پر پشیمان ہوئے بغیر اپنا حق جتلا رہا تھا۔ ”اے پروردگار! تو جانتا ہے کہ یہ سب دشمن ایک ایک کر کے میرے سامنے آتے رہے ہیں اور منہ کی کھا کر پلٹتے رہے ہیں۔ اب سارے مل کر شیر کو گرانا چاہتے ہیں۔“

دل میں خیال آیا کہ جہاں اختیارات نہیں چلتے، وہاں وہ رشوت کے ٹوکے ہاتھوں میں سجائے پہنچ جاتا تھا اور کام نکلوانے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ اس دربار میں اختیار نہیں چلتا، نہ ہی دھونس دھمکی کا رگر ہوتی ہے۔ رشوت جھولی میں بھر کر گڑ گڑانے لگا۔ ”بچ پروردگار! تم نے کبھی مجھے نیچا نہیں دکھلایا۔ اب کے بھی کامیابی کیلئے بھیک مانگنے تمہارے در پر آیا ہوں۔ مراد پانے پر حضرت بابا سائیں کے مزار پر دیگوں کی قطار سجادوں گا۔ پورے علاقے میں تمہارے نام پر لنگر بانٹ دوں گا۔“

عالمگیر اُس کے بھکے ہوئے خیالات سے بے خبر آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سردار کی آواز پر چونکا۔ وہ ڈرائیور کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ ”عالمگیر کو کوٹھی پر چھوڑ کر مجھے بازار لے چلنا۔ بیٹی چھٹیاں گزار کر واپس جا رہی ہے۔ اُس کیلئے کچھ شاہنگ کرنا ہے۔“

کچھ دیر بعد کار کوٹھی کے گیٹ پر رُک گئی۔ وہ اُترا اور سردار فضل خان کی بیٹی شاہانہ کے بارے میں سوچتا ہوا اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے دو تین مرتبہ شاہانہ کو اس کوٹھی میں دیکھا تھا۔ ایک بار سردار اُسے اپنے زنان خانے میں بھی لے گیا تھا جہاں اُس کی شاہانہ سے رسمی سی ملاقات ہوئی تھی۔ غیر معمولی حسن کی مالکہ ہونے کے باوجود اُسے ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ غرور اور بدتمیزی کے اعتبار سے وہ اپنے باپ سے بھی چند قدم آگے نکلتی دکھائی

لیتی۔ جی بھرتا تو واپس بھیج دیتی۔ ہمیشہ اپنے اختیار میں رکھتی۔“
ایسا سوچا جاسکتا ہے، کیا نہیں جاسکتا۔ سوچنے لگی۔ ”یہی فلم تھی جو پچھلی رات اُس کے
تن بدن میں انگارے بھر رہی تھی۔ اب ہیرا اور ہیروئن کی حرکتیں بہت گھٹیا لگ رہی ہیں۔
یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ رات کے اندھیرے میں اور ہوتی ہوں، دن کے اجالے میں اور
ہو جاتی ہوں۔“

دل کو لگنے والی بات ہے۔ جو کام رات کی تاریکی میں کیا جاسکتا ہے، وہ دن کے اجالے
میں کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ وہ شرم مار رہی تھی اور خود کو ملامت کر رہی تھی کہ اُس نے یہ
ڈسک کیوں چلائی۔ اٹھی اور پلیئر بند کر دیا۔ ریموٹ سے کیبل کی نشریات چلاتے ہوئے
چینل پر چینل بدلنے لگی۔ ذہن اضطراب پکڑ چکا تھا۔ کینو کے باغ میں سے کوئی کینو پسند
نہیں آ رہا تھا۔ سپورٹس کے ایک چینل پر پیرا کی کا میچ چل رہا تھا۔ مختلف روؤں میں پیراک
اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔
نیگنوں پانی میں سرخ و سپید بدن بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ اُس نے ریموٹ کنٹرولر بیڈ کی
سائیڈ ٹیبل پر اچھال دیا اور پورے انہماک سے نیم برہنہ بدنوں کی کشمکش دیکھنے لگی۔ تب
بات سمجھ میں آئی کہ عریانی سے نیم عریانی جذبات میں زیادہ ہلچل مچاتی ہے۔ جیتنے والا نیگرو
تھا۔ تیسرے نمبر پر آنے والا انگریز تھا۔ چہرے کے خطوط میں مشرق کی آمیزش رکھتا تھا۔
پانی نچوڑتے ہوئے تالاب کی گگر پر کھڑا خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے
بیٹھی اُسے دیکھ رہی تھی۔

اجانک اُس کی شکل بدلنے لگی۔ چند ہی لمحوں میں اُسے یوں لگا جیسے ٹی وی کی سکرین
میں سے ریئس جھانک کر اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ حیران ہوئی۔ آنکھیں مل مل کر دیکھنے
لگی۔ جاگتی آنکھوں میں سپنا بھر گیا۔ بولی۔ ”عجیب چاہنے والے ہو، سامنے ہوتی ہوں تو
بیٹھ موڑ کر چل دیتے ہو۔ دور ہوتی ہوں تو بہانے بہانے سے مجھے دیکھنے کیلئے پہنچ جاتے
ہو۔ تمہیں دل تک لانے کیلئے پانچہ پکڑاتی ہوں، تم پکڑ کر چھوڑ دیتے ہو۔ یہ نہیں جانتے ہو
کہ عاشق گندم کے سوکھے خوشے کی طرح پانچہ پکڑ کر دل تک پہنچ جاتے ہیں۔ تم اُنا پر
میرے حسن کو قربان کر کے چل دیے۔“
وہ ہاتھ لہرا کر بولا۔ ”میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے ماضی کے طعنے دینے لگتی

کتائیں اٹھا لاتی اور بیٹے کے سامنے رکھتے ہوئے کہتی۔ ”کتاب ایک دو بار پڑھ لی جائے تو
اُس میں چھپے خزانے کم نہیں پڑتے۔ تم اسے پورا سال خرچ کرنے کے بعد بھی اتنا لبریز ہی
پاؤ گے۔“

ماں ٹھیک کہتی تھی۔ پورا سال پڑھنے کے بعد بھی اُس میں شامل لفظوں کی تعداد میں کمی
واقع نہیں ہوتی تھی۔

وہ سوچنے لگا۔ ”میری ماں اپنا اقتدار گنوا کر تمام عمر ایک بیٹے کو تعلیم دینے پر اکتفا کیے
بیٹھی رہی۔ کرائے کے مکانوں میں رہتے ہوئے اُس کے دل میں کبھی بھی یہ خواہش پیدا
نہیں ہوئی تھی کہ بھری دنیا میں اُس کا اپنا گھر بھی ہونا چاہیے۔ اُس نے علم کی سلطنت میں
اپنے بیٹے کا گھر بنانے میں ہی عمر بٹا دی۔ اُس کے برعکس یہ کم بخت پوری دنیا کو اپنے
قدموں میں جھکانے اور بیٹی کو پوری تحصیل کا مالک بنانے کیلئے ہر لمحہ جہنم کا ایندھن خریدنے
میں برسرِ پیکار رہتا ہے۔ کیا کرے گا وہ اتنی دولت اپنی بیٹی کے قدموں میں ڈال کر؟“

اُس کا انہماک بڑھتا جا رہا تھا۔ کندھے پر ہاتھ کا بھاری لمس محسوس کر کے چونک پڑا۔
گردن موڑ کر دیکھا تو بشیر خان کو خود پر جھکے پایا۔ اُس کے بیٹھنے کیلئے پہلو میں جگہ بنانے
ہوئے بولا۔ ”آؤ بشیر خان! لگتا ہے تم بھی میری طرح سکون کی تلاش میں ادھر آ نکلے ہو۔“
وہ ہنسا۔ ”نہیں! میں تمہاری تلاش میں ادھر آیا ہوں۔“

دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ظاہر ہے دونوں کی گفتگو کا موضوع رفیع اللہ، ملک
فرید اور سردار فضل کی تکیوں ہی تھی۔



اگلے دن اُس نے کلاس سے ناغہ کر لیا۔ دل لمبی تان کر سونے کو چل رہا تھا۔ بغیر نیند کے
لیٹے رہنے پر بدن نے اٹلٹھن پکڑ لی۔ لیٹنے کیلئے بدن کا تھکنا ضروری ہوتا ہے۔ کسلندی کا
حالت میں سی ڈی پلیئر میں فلم لگا کر بیٹھ گئی۔ ادھ دیکھی فلم جہاں سے چھوڑی تھی،
وہیں سے چلا کر دیکھنے بیٹھ گئی۔ جذبات میں ہلچل مچانے والے مناظر آنکھوں کو خیرہ کرنے
لگے۔ ہیرا و ریئس کی شکل کی مشابہت تلاش کرنے لگی۔ ہیروئن کے لباس میں خود گھس
بیٹھی۔ سوچنے لگی۔ ”فلم کو چلانے اور بند کرنے کا اختیار میری انگلیوں کو حاصل ہے۔ کاش
کہ قسمت کا ریموٹ کنٹرول بھی میرے ہاتھ میں ہوتا۔ مٹن دبا کر ریئس کو اپنے پاس بلا

کو دوٹ نہیں دوں گی بلکہ ماما کے بیلٹ بکس سے جڑ کر کھڑی ہو جاؤں گی۔“
سردار فضل ہنسنے لگا۔ یقین ہو گیا کہ بیٹی بالکل ٹھیک ہے۔ بولا۔ ”تمہارے اچھے مستقبل
کیلئے دل پر ہاتھ رکھ کر تمہیں لاہور بھیجا ہے۔ جب تک لاہور ہوگی دن گن گن کر وقت
گزاروں گا۔ جب آ جاؤ گی تو تمہیں رخصت کرنے کیلئے دن گننے لگ جاؤں گا۔“

”ہائے پاپا! محبت بھی کرتے ہیں، بھگانے کے چکر میں بھی پڑ جاتے ہیں۔ ایسی باتیں
نہ کیا کریں۔ مجھے لاج آتی ہے۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔ ”اگر میں آپ پر بوجھ بن گئی ہوں تو
میں مرھپ جاتی ہوں۔ گھر آ کر کیا کروں گی؟“

باپ کا دل آسودگی سے معمور ہو گیا۔ فون اپنی بیوی کو پکڑا تے ہوئے بولا۔ ”لو بیٹا! اپنی
ماں سے بھی بات کر لو۔ ہم باپ بیٹی کے بیچ میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔“
وہ بولی۔ ”ماما! پاپا بھی تو ہم دونوں کے محبت بھرے کمرے میں بغیر دستک دیے گھس
آتے ہیں۔ ان کی باتوں کا برا نہ منایا کریں۔“

ماں دعائیں دینے لگی۔ بولی۔ ”تمہارے پاپا چلے گئے ہیں۔ بتلاؤ مجھے! کوئی ہم دونوں
سے چڑا کر تمہیں دور لے جانے والا آیا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں آیا تو تمہیں میری بات ماننا
پڑے گی۔ میں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ تمہیں سردار اکرم خان کے بیٹے سردار خان کی انگوٹھی
کا گینہ بنا دوں گی۔ اگر تمہیں سردار خان پسند نہیں تو پھر تمہیں اپنے پاپا کی بات مجبوراً ماننا
پڑے گی۔“

سردار اکرم خان اُس کی ماں کا بڑا بھائی تھا۔ علاقے کا معروف کاروباری شخص تھا۔
کائن جٹنگ کے کاروبار سے منسلک تھا۔ تین فیکٹریاں اور چند ایک کمپیوٹرائزڈ کانٹے اُس
کے بیٹے سردار خان کی ملکیت تھے۔ اتنی مالیت کی جائیداد چھوٹے بیٹے کے نام بھی تھی۔ وہ
بولی۔ ”ماما! میں پھر کہتی ہوں کہ میں نہ تو آپ کی مرضی پر چلوں گی اور نہ ہی پاپا کی بات
مانوں گی۔ اور ہاں! آپ کی اطلاع کیلئے عرض کرتی ہوں کہ میرا آئیڈیل مجھے دکھائی دینے
لگا ہے۔ ابھی اُس کی شبیہ دھندلی دھندلی دکھائی دیتی ہے۔ جب واضح ہوگی، آپ کو مطلع
کروں گی۔ اور اب خدا حافظ!“

اُس نے ماما کا جواب سننے بغیر ہی فون بند کر دیا۔ ابھی ہاتھ منہ تک نہیں پہنچا تھا کہ فون
دھڑک اٹھا۔ اُس نے سکرین پر آئے ہوئے نمبر کو دیکھا۔ مسکرانے لگی۔ ماما کال بیک

ہو۔ اچانک سامنے آتا اور پارسائی کی قسمیں کھاتا تو تمہیں یقین آ جاتا کہ میں نے آج
تک کسی عورت کو چھوا تک نہیں ہے۔ اب سال بھر تمہارے سامنے اپنے وجود کو ثابت کرتا رہا
ہوں۔ تم مجھے فلرٹ کرنے والا سمجھتی ہو۔ کیا یہ نہیں جانتی ہو کہ کیمپس کی ہر لڑکی کے وجود میں
میں تمہیں ہی تلاش کرتا رہا ہوں۔ میں بُرا ہوں تو تم بھی تو چھپ کر سامنے آتی ہو، سامنے
آ کر چھپنے لگتی ہو۔“

وہ بے طرح شرمانے لگی۔ عورت کا حسن تعریف کی لو پر تینے لگتا ہے۔ لو مسلسل چلنے لگے
تو تپ کر آگ پکڑ لیتا ہے۔ آتش عدسے سے گزرنے والی روشنی کو کورے کاغذ پر مرکوز کرنا
جائے تو ننھا سا شعلہ پیدا ہوتا ہے جو آن کی آن میں پورے کاغذ کو اپنی لپیٹ میں لے
لیتا ہے۔ رئیس کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہو چکی تھیں۔ وہ لوؤں تک تپ گئی۔ چہرے کو ہاتھوں
کے پیالے میں لیتے ہوئے لجا کر بولی۔ ”ہائے اللہ! ایسے تو نہ دیکھو مجھے..... مجھے شرم
آ رہی ہے۔“

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”دکھاؤ تو مجھے۔ کہاں شرم آ رہی ہے؟“
شرم پکڑانے والی شے نہیں ہوتی، دکھانے والا رنگ ہوتا ہے۔ حسن فخر سے شرماتا ہے۔
چورندامت سے شرماتا ہے۔ وہ عجیب چور تھا جو شرم مانے کی بجائے پوری ڈھٹائی سے اُس کی
شرم کے تمام تر رنگ چرانے آ گیا تھا۔ سر ہانے کو بازوؤں میں بھینچ کر سینے سے لگانے لگی۔
یوں لگا جیسے تھکے ہوئے وجود کی نکور ہونے لگی ہو۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر چونک اٹھی۔
رحمت بی ناشتے کی ٹرے لئے اندر داخل ہوئی۔ اُس پر نگاہ ڈال کر آہستگی سے بولی۔ ”نشانی
بی بی! ناشتہ تیار ہے۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ تمہارے پاپا کا فون آیا تھا۔ میں نے بتایا کہ بی
بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لئے آج یونیورسٹی نہیں گئی۔ کہہ رہے تھے کہ جب جائے تو
فون پر میری بات کروادینا۔ تم ناشتہ کر کے اُن سے بات کر لینا ورنہ پریشان رہیں گے۔“
وہ ہاتھ منہ دھوئے بغیر ناشتہ کرنے لگی۔ منہ۔ ”نہ کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی چلانے لگی
اور اپنے پاپا سے رابطہ کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر بولی۔ ”آپ کیسے ہیں؟ ماما کیسے ہیں؟“
باپ کی پیار بھری آواز سنائی دی۔ ”بیٹا! ہم دونوں کا ٹھیک ہونا تم پر منحصر ہوتا ہے۔ تم
ٹھیک تو ہم بھی ٹھیک ورنہ بڑھا پاؤ دکر آتا ہے۔“
وہ ہنسنے لگی۔ ”پاپا! مجھے بھی سیاسی بیانیوں پر پڑخانے لگے ہیں۔ میں جھوٹی خوشامد پر آپ

کر رہی تھی۔ اُس نے گود میں پڑے ہوئے فون پر کال ریسیو کی اور لاؤڈر آن کر کے کمرے میں رکھ دیا۔ ماما کی آواز سنائی دی۔ ”بے وقوف لڑکی! اتنی اچھی خبر دینے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ جانتی ہو کہ جب تک مجھے تفصیل نہیں بتلاؤ گی، مجھے چین کی نیند نہیں آئے گی۔ شاباش! اب جلدی سے شروع ہو جاؤ۔“

اُس نے کن اکھیوں سے دارڈروب میں ملبوسات کو ترتیب دینے میں مصروفِ رحمت با کی طرف دیکھا۔ سر جھکا کر بولنے لگی۔ ”ماما! اُس کا نام رئیس ہے۔ میرے ڈیپارٹمنٹ میں پڑھتا ہے۔ امیر اور بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھ میں دلچسپی لیتا ہے۔ ابھی تک کھانا نہیں کھلے گا تب آپ کو تفصیل سے بتلاؤں گی۔ آپ پاپا سے ابھی کوئی بات نہیں کریں گی۔“

ماما کچھ اور تفصیل چاہتی تھی۔ اُس کے پاس بتلانے کیلئے مزید کچھ نہیں تھا اس لئے گفتگو میں تشنگی رہ گئی۔ فون بند کرتے ہوئے رحمت با سے مخاطب ہوئی۔ ”تم میرے لئے چائے لے آؤ۔ ناشتے کو جی نہیں مان رہا۔“

رحمت با چائے لانے کیلئے کچن میں چلی گئی۔ وہ اپنی ماما کے بارے میں سوچنے لگی۔ ”دشانی سے بہت بیمار کرتی تھی۔ اکلوتی ہونے کے سبب وہ ماما اور پاپا کی آنکھوں کا تار تھی۔ بیٹی کی خواہش میں اُس کے باپ نے تین شادیاں کی تھیں۔ دوسری بیوی بغیر کوئی بچہ نہ بنے بیمار ہو کر مر گئی۔ تیسری چھ سات سال تک بانجھ رہی اور سردار کے طعنے جھیلیں رہی۔ ایک مرتبہ پھٹ پڑی اور کہنے لگی کہ دونوں ڈاکٹر کے پاس چل کر اپنا چیک اپ کراتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بانجھ نہ ہو، سردار بانجھ پن کی حد تک کمزور ہو۔ سردار نے اُسے طلاق دے کر کوٹھی سے چلتا کر دیا۔ بیوی پاؤں سے جوتے کی مانند چپکی رہے تو اپنی اوقات میں روتی ہے۔ تیسری بیوی پاؤں سے نکل کر سردار کے سر میں پڑنے لگی تو اٹھا کر باہر پھینک دی گئی۔ تب سے دونوں میاں بیوی شاہانہ پر صبر کر کے بیٹھ گئے تھے۔“

چائے پینے کے دوران اُس نے اپنی دوست سمیرا کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر پتہ چلا کہ وہ کیمپس میں موجود تھی۔ دشانی کو چھیڑنے کیلئے بولی۔ ”تم آج کلاس میں نہیں آئی ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ کوئی عشق کی سچی کتاب پڑھانے کیلئے اپنے پیروں پر چل کر تمہارے پاس پہنچ گیا ہو۔“

وہ ہنسنے لگی۔ بولی۔ ”باتیں بتاتی رہتی ہو۔ جانتی ہو کہ مجھے پڑھانے والا ابھی دنیا میں نہیں آیا۔ جب آئے گا تو سب سے پہلے تمہیں ہی بتلاؤں گی۔“

”جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے۔ عشق ہوتا ہے تو سب سے پہلے چھپنے اور چھپانے کا سبق اُزیر کراتا ہے۔“ سمیرا نے کہا۔ ”کہو! کیسے فون کیا؟“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے فون رئیس کا نمبر لینے کیلئے کیا تھا۔ دل میں چھپا چور انگڑائی لے کر جاگ گیا۔ اُسے روکنے لگا کہ فون نمبر لینے سے سمیرا کھٹک جائے گی۔ تمہارے کلاس میں پہنچنے سے پہلے ہی وہ ہر ایک پر تمہاری کارگزاری کی رپورٹ کھول دے گی۔ الٹی سیدھی باتیں کرتی رہی، فون نمبر لینے کی ترکیب سوچتی رہی۔ بھائی دیا تو بول پڑی۔ ”سمیرا! تمہارے پاس سرنیر واسطی صاحب کے نوٹس ہیں؟“

”تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟“ سمیرا دل کھول کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”جانتی تو ہو کہ میں اُن کا بیڑیڈ کیسے دل پر پتھر رکھ کر اٹینڈ کرتی ہوں۔ اُن کے نوٹس کیسے رکھوں گی؟“

وہ دل ہی دل میں خوش ہو کر بولی۔ ”مجھے ہر صورت میں وہ والے نوٹس آج ہی چاہئیں۔ کلاس میں کس کے پاس موجود ہوں گے؟“

سمیرا توقع کے مطابق بول پڑی۔ ”سر واسطی صاحب کے لاڈلے رئیس کے پاس ہی ہوں گے۔ کہو تو اُس سے دریافت کر دوں؟“

وہ بولی۔ ”اُسے تو منہ لگانا بھی بڑا دل گردے کا کام ہے۔ تم اس طرح کرو کہ اُسے کہو کہ میرے فون پر رابطہ کرے۔ میں خود بات کرتی ہوں۔“

سمیرا نے حامی بھری۔ اُس کا کام ہو گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد ایک اجنبی نمبر سکریں پر جگمگانے لگا۔ دل رئیس کے نام پر دھڑک اٹھا۔ جلدی سے فون آن کر کے بولی۔ ”جی کون؟“

”بہت غریب آدمی جو نام کارنیکس ہے۔“ رئیس کی شوخ آواز سنائی دی۔ ”سمیرا نے مجھے تمہارا نمبر دیتے ہوئے رابطہ کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ کہہ رہی تھی کہ تمہیں واسطی صاحب کے نوٹس درکار ہیں۔ میں تب ہی سمجھ گیا تھا کہ واسطی صاحب کو واسطہ بنایا جا رہا ہے۔“

وہ بولی۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے واقعی اُن کے نوٹس کی ضرورت ہے۔“

وہ ہنسنے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی آواز سیدھی دل میں اترنے لگی۔ وہ بولی۔ ”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

تھوڑے وقفے بعد دستک ہوتی رہی۔ دل کی تسلی کیلئے سکرین پر لکھے ہوئے نام کو پڑھ لیتی۔
ریمیں کا نمبر فیڈ کرتے ہوئے اُس نے نمبر کو اپنے ہاتھوں سے ”ریمیں“ کا نام دیا تھا۔ اب
اپنے لکھے ہوئے حروف اُس کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے تھے۔

رحمت بی کو اُس نے بلا کر ڈرائیور اور باڈی گارڈ کو تیار کرنے کا حکم دیا۔ وہ شاپنگ
کرنے کیلئے بازار جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ بدن کو سسلانے سے پہلے اچھی طرح تھکانا چاہتی
تھی۔ تیار ہو کر پورچ میں آگئی۔ ڈرائیور کو اچھی طرح سمجھا کر بیٹھ گئی۔ گاڑی مین گیٹ سے
باہر نکلی تو وہ سرخ رنگ کی کار کو گیٹ کے قریب کھڑے دیکھ کر چونک پڑی۔ اس کار کو ہر روز
کیمپس میں دیکھا کرتی تھی۔ اُس کے قریب سے گزرنے پر اُس نے ڈرائیونگ سیٹ پر
براجمان ریمیں کو دیکھ کر پہچان لیا۔ وہ گھبرا کر ڈرائیور اور باڈی گارڈ کو دیکھنے لگی۔ شکر کیا کہ
انہوں نے سرخ گاڑی پر توجہ نہ دی تھی۔ نظریں ملنے پر دل نشیں انداز میں مسکرانے لگا۔

وہ نظریں جھکا کر سوچنے لگی۔ دل میں فخر کی طمانیت پھیل گئی۔ چاہنے والا کچے دھاگے
سے بندھا چلا آیا تھا۔ دیوی کے درشن پانے کیلئے مندر کی سیڑھیوں پر براجمان ہو کر اپنی
حشیت اور خاندانی جاہ و حشمت کو مٹی میں رولتے ہوئے اچھا لگا تھا۔ جوانی خراج مانگتی ہے۔
حسن چاہے جانے کا اعتراف مانگتا ہے۔ چاہنے والے نے حسن کو خراج پیش کر کے جوانی
کے منہ زور طوفان کو خوش آمدید کہہ دیا تھا۔

اُس نے غیر محسوس انداز میں گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ اُسے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر
نہال ہو گئی۔ کار ایڈور میں پیچھے نہ مڑنے والا اُس کے قدموں پر قدم رکھ کر بے خود ہو کر چلا
آ رہا تھا۔ آج پھر اُس کے دل نے چاہا تھا کہ بہتا دیا کبھی نہ رُکے، چلتا سفر یونہی چلتا
رہے اور دھڑکن کی طرح محبوب اُس کی ذات سے چمٹا رہے۔ ہر سفر تمام ہو جاتا ہے۔ بازار
آ گیا تھا۔ جگہ بنا کر گاڑی پارک کرتے ہوئے ڈرائیور نے گارڈ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں
کوئی اشارہ کیا۔ شانی کے ساتھ گارڈ بھی اتر آیا۔

وہ شاہانہ انداز میں چلتے ہوئے شاپنگ پلازے میں داخل ہو گئی۔ ایک قدم پیچھے رہ کر
گارڈ اپنی گن سنبھالے چوکس انداز میں چلتا آ رہا تھا۔ پہلے سوچا کرتی تھی کہ گارڈ اور
ڈرائیور کی موجودگی میں بندے کی شان بڑھتی ہے۔ لوگ شاہانہ تمکنت سے خائف ہو کر
راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ چھپچھورے منہ سے رال پکاتے ہوئے بغلوں میں منہ چھپانے لگتے

۔ ”اس میں رونے کی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ ”تم شاید بھول گئی
ہو کہ چند دن قبل تم نے سعدیہ سے نوٹس لے کر فوٹو اسٹیٹ کرائے تھے۔“

وہ کوئی بات بنانا چاہتی تھی مگر ریمیں نے کوئی موقع نہ دیا۔ بولا۔ ”پہلی مرتبہ مجھے واسطی
صاحب پر پیار آ رہا ہے۔ بھلے جتنے بھی خشک ہیں، ایک بنجر زمین کو زرخیز بنانے میں
کامیاب ہو گئے ہیں۔ اُن پر صدقے جاؤں، بیج ہاتھ میں لئے زرخیز دھرتی کی طرف بڑھا
چاہتا ہوں۔ کہو! کہاں آؤں؟ کہاں بیٹھ کر محبت کا بیج بوئیں؟“

وہ اُس کی زبان کو روکنا بھی چاہتی تھی، خوش بھی ہو رہی تھی۔ دل سے چاہتی تھی کہ
اسی طرح بولتا رہے اور وہ سستی رہے۔ بنتے ہوئے مصنوعی خشکی سے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ
تم میرے اس طرح رابطہ کرنے پر غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو۔ تکلیف دینے پر معذرت چاہتی
ہوں۔ دوبارہ سعدیہ سے نوٹس لے لوں گی۔ تمہارا شکریہ!“

شانی نے بہ بگلت فون بند کر دیا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔ چند لمحے بعد دوبارہ کال آگئی۔
اُس نے ریسیو کرنے کی بجائے کال منقطع کر دی۔ مسکراتے ہوئے اُس کا نمبر فون بک میں
فیڈ کرنے لگی۔ فیڈنگ کے دوران بھی اُس کی کال آئی جسے اُس نے ریسیو نہیں کیا۔

فون ٹیبل پر رکھ کر انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تمکنت سے چلتی ہوئی قد ام
آئینے کے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ یوں لگا جیسے آئینے پر کوئی قیامت آ کر ٹھہر گئی ہو۔ دونوں
ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوجے میں پھنسا کر سر سے بلند کرتے ہوئے توت کی گیلی ٹنٹی کا
طرح پلک کھا گئی۔ ٹنٹی سے بجوی شانیں لہرانے لگیں۔ انگلیوں کے جوڑوں سے کلک کلک
کی ننھی ننھی آوازیں نکلیں۔ دل کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔

دل فگار انداز میں مسکرا کر پلٹی اور بیڈ پر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ دونوں ہاتھیں پورے
وسعت میں کھول کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ ایسے وقت میں فون کی بیل بجنے لگی۔ وہ اٹنے
کی بجائے کن اکھیوں سے دھڑکن کی تال پکڑنے والے ننھے سے جادوئی کبوتر کو دیکھنے لگی۔
کبوتر اُس کے چاہنے والے نے اپنی منڈیر سے اڑا کر اُس کی دہلیز پر اڑا بھیجا تھا۔ دہلیز
تالی کو ہوا دیتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”میں نے نوٹس مانگے تھے، بار بار دستک دینے کی
اجازت نہیں دی تھی۔“

اُس نے ہاتھ لیا۔ اپنی نوک پلک سنوارنے میں خاصا وقت صرف کیا۔ فون پر تھوٹ

وہ مسکرانے لگی۔ اُس نے بہت اچھی آفر کی تھی۔ دل سے صدا ابھری۔ ”کیا سوچنے لگ گئی ہو؟ جس کے دل میں میل اور کھوٹ ہوتا ہے، وہ ایسی باتیں نہیں کرتا اور نہ ہی خود پر پابندیاں عائد کرتا ہے۔ وہ تمہیں سچے دل سے چاہتا ہے۔ چاہت میں بندہ اپنے ہاتھ پیر باندھ سکتا ہے۔“

وہ بولی۔ ”میں لاہور میں پڑھنے کیلئے آئی ہوں حالانکہ مجھے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے باپ نے میرے لئے اتنی دولت کما رکھی ہے کہ میری سات پشتوں کی فضول خرچیوں کا یہ آسانی بوجھ اٹھا سکتی ہے۔ تم پہلے اچھے نہیں لگتے تھے۔ سچ کہتی ہوں۔ دوستی میں جھوٹ بچتا نہیں۔ قریب آئے ہو تو دل تمہاری طرف کھینچنے لگا ہے۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ تم چاہتے ہو مگر چاہنے والے نہیں ہو۔ چند دن بعد بھونرے کی طرح پھول بدلنے کے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ اس کے باوجود تمہاری دوستی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دھتکاروں گی نہیں۔ لاؤ ہاتھ بڑھاؤ۔ وعدہ کرو کہ میری مرضی کے بغیر مجھے ہاتھ تک نہ لگاؤ گے۔“

اُس نے جھٹ سے اپنا ہاتھ پیش کر دیا۔ دل میں بولا۔ ”اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر تم نے محبت کی پہلی بخشش عطا کر دی ہے۔ ہاتھ پکڑ کر دل تک پہنچنا میرا کام ہے اور مجھے اپنا کام کرنا آتا ہے۔“

رئیس کے ہاتھ میں اُس کا نرم، ننھا اور بڑگذا ہاتھ ہفت اقلیم کی طرح آیا تھا جو لمبے لمبے ڈگ بھر کر آتے ہوئے گاڑی کی نظروں میں بھی آ گیا۔ گاڑی نے قریب پہنچ کر گھورتی نگاہیں اُس پر مرکوز کرتے ہوئے خاموش زبان میں سمجھایا۔ ”آج ہاتھ لگایا ہے، آئندہ ہاتھ لگاؤ گے تو پھر تمام عمر ہاتھ ملتے رہو گے۔“

شانی نے جلدی سے اُسے مخاطب کر کے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ ”یہ میرا کلاس فیلو ہے۔“ پھر رئیس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”گڈ بائی مسٹر رئیس! کلاس میں ملاقات ہوگی۔ شاہجہاں میں میری مدد کی تو کوئی ضرورت نہیں ناں!“

وہ ہاتھ لہرا کر بائے کہتا ہوا ایک دکان میں گھس گیا۔ شانی گاڑی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ دل میں تھوڑی سی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ گاڑی نے اُسے رئیس کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ گھر جاتے ہی وہ پہلا کام یہی کرے گا کہ اُس کے باپ کو آگاہ کرے گا کہ ایک لڑکے نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کے فرض کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔

تھے۔ آج یہ سب کچھ بُرا لگ رہا تھا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ گاڑی گاڑی میں بیٹھا رہے اور سرخ گاڑی والا اُس کے نقش پا پر چلتا ہوا اُس کے پہلو سے آن لگے۔ بس نہیں چلتا تھا۔ جانتی تھی کہ گاڑی اُس کی بات نہیں مانے گا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو رئیس کو آتے دیکھا۔

سیڑھیاں چڑھ کر شاہجہاں پلازہ میں داخل ہو گئی۔ آج حسب توقع خواتین کا رش حد سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ بہ مشکل راستہ بناتے ہوئے ایک دکان میں داخل ہوئی۔ گاڑی غیر محسوس انداز میں اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ کچھ چیزیں خرید کر گاڑی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”انہیں گاڑی میں رکھ آؤ۔ جلد واپس آ جانا، میں یہیں کھڑی ملوں گی۔“

گاڑی چند لمحے سوچتا رہا۔ ہاتھ بڑھا کر شاہجہاں بیک تھامتے ہوئے بولا۔ ”بی بی جی! آپ بے فکر ہو کر شاہجہاں کریں۔ زیادہ وزن نہیں۔ میں اٹھا لیتا ہوں۔“

وہ برا سامنہ بناتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ لمبوسات سے اُس نے غیر ضروری طور پر چند سوٹ خریدے۔ پیک کرائے بغیر گاڑی کو تھما دیے۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ سوٹ اٹھا کر چلتا ہوا تماشا بن گیا تھا۔ ایک دکان کے سامنے رُک کر بولا۔ ”آپ کا سٹیکس خریدیں۔ میں سوٹ گاڑی میں رکھ کر آتا ہوں۔“

اُس نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔ وہ اوجھل ہوا تو رئیس لپک کر اُس کے قریب آ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ ”پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ بڑے گھر کی لڑکی کا قرب پانے میں کتنی مشکل پیش آتی ہے۔ کہو! کیسی ہو؟“

وہ چند لمحے اُسے ایک ننگ دیکھتی رہی۔ جو کہنا چاہتی تھی وہ نامناسب لگتا تھا، جو نہیں کہنا چاہتی تھی وہ لبوں پر آ گیا۔ نظریں جھکا کر بولی۔ ”تم کیسے ہو؟“

وہ بولا۔ ”جلدی جلدی کہہ دیتا ہوں۔ تمہارے بغیر ہر بل گراں گزرتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اگر مجھے محبت ہو گئی ہے تو اُس کا انجام کیا ہوگا؟ اگر محبت نہیں ہوئی تو دل میں اتنی بے چینی کیوں بھر گئی ہے کہ برسوں سے دیکھی بھالی چیزیں بھی اجنبی اور بے معانی دکھائی دینے لگی ہیں۔ اگر تم یہ سوچتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ فلرٹ کر رہا ہوں تو یقین دلانے کیلئے یہ پیشکش کرتا ہوں کہ چند دن میرے ساتھ چلو۔ مجھے پرکھو۔ تمہیں تو نہ چھوؤں گا، نہ اٹھاؤں۔ محبت طلب کروں گا۔ دو اچھے دوستوں کی طرح ہم تب تک ملتے رہیں گے جب تک نہ چاہو گی۔“

یوں لگا جیسے اُس کے قدموں نے اُس کا وزن اٹھانے سے انکار کر دیا ہو۔ خوفزدہ لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ باڈی گارڈ اور ڈرائیور کہیں دکھائی نہیں دیے۔ بم پھٹنے سے پھیلنے والی بھگدڑ میں او جھل ہو گئے تھے۔

وہ لہرا کر گرنے لگی تو چادر پوش نے کمر میں بازو حائل کر کے سنبھال لیا۔ چند لمحوں بعد وہ گاڑی کی سیٹوں کے درمیان فرش میں بے ہوش پڑی ان دیکھی منزل کی طرف جارہی تھی۔ ہوش میں رہتے ہوئے گرد کو لباس پر لگنے نہیں دیتی تھی۔ بے ہوش ہو کر اغوا کرنے والوں کے جوتوں تلے دبی ہوئی تھی۔



جوتے چیک کرتے ہوئے اُس کی توجہ رئیس پر مرکوز رہی۔ سلیز مین جس جوتے کی تفریق کرتا، وہ اُسے پیک کرنے کا آرڈر دے دیتی۔

پانچ چھ جوڑے خریدنے کے بعد وہ شوز سنور سے باہر نکل آئی۔ اُس کی شاؤنگ مکمل ہو چکی تھی۔ ایک دو دکانوں پر بلا ضرورت ٹھہر کر اشیاء چیک کرتی رہی۔ پھر اس کام میں بم بوریت ہونے لگی تو اُس نے گارڈ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ پلازے سے باہر نکلی تو خود کو بے ہوش بھیس میں پا کر جھنجھلا گئی۔ لوگ چلتے ہوئے دوسروں پر دھیان دینے کے عادی نہیں تھے۔

اچانک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا۔ یوں لگا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ اُس نے کانوں پر سختی سے اپنے ہاتھ رکھے۔ چند قدموں کے فاصلے پر پلازے کی بالائی منزل کی بیرونی دیوار گری تھی جس کے نیچے کئی آدمی آگئے تھے۔ دھکم پیل اور شور و غوغا نے قیامت منظر بنا دیا۔ کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ دھماکہ کہاں ہوا ہے اور کس سمت میں جانا ہے۔ ایک طرف کو بھاگ کھڑی ہوئی۔ ٹھوکر لگی تو منہ کے بل جا گری۔ جلدی سے اٹھ کر بھاگے لگی۔ شور میں ایک ہی بات سنائی دے رہی تھی کہ کہیں بم پھٹا تھا اور بیسیوں بندے گرے تھے۔ گرنے والوں میں کتنے مرے تھے، کتنے بچے تھے، یہ پتہ نہیں چلتا تھا۔ دل کو ڈنڈا دھڑکا رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا بم بھی پھٹ سکتا تھا۔

کسی کے مرنے سے گورکن سمیت کئی بندوں کی روزی بن آتی ہے۔ بم پھٹنے سے بھگدڑ سے مفاد کشید کرنے والوں کی چاندی ہو گئی۔ کوئی دکانوں کے گلوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا تو کسی کے ہاتھ میں گرنے پڑنے والوں کے موبائل دبے ہوئے تھے۔ چند ہی لمحوں میں وہ پلازے سے کافی دور نکل آئی۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ خون، درد اور تھکن سے بے حال ہو کر رک گئی۔ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ ایسے میں اُس کے ہلے میں کوئی نوکدار چیز چھب گئی۔ اُس نے گھبرا کر پہلو میں دیکھا۔ گرم اونچی چادر میں ملبوس ایک خوفناک شکل والا آدمی اُس سے لگ کر کھڑا تھا۔ اُس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے گیا۔ سر اسیمہ نگا ہوں سے بائیں طرف دیکھا۔ وہی سہی کسر بھی نکل گئی۔ ویسا ہی ایک شخص راستہ روک کر کھڑا تھا۔ سہی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ہلے میں ریوالور کی نوک چھونے والے چادر پوش نے سرگوشی کے سے انداز میں نہایت سناک لہجے میں کہا۔ ”اُس گاڑی کی طرف چلو ورنہ کلیجے میں گولی اتار دوں گا۔“

عالمگیر عالم کو خبر ملی تھی کہ رفیع اللہ پندرہ دن بعد یہاں پہنچنے والا ہے۔ انتخابات میں ابھی ایک ماہ پڑا تھا۔ وہ مضطرب ہو گیا۔ بشیر خان سے سر جوڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کے آنے سے پہلے پہلے ہی اپنے کام کے مشکل مراحل طے کر لے۔ یہ تعین نہ ہو پایا کہ کام کا آغاز کہاں سے کریں۔ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ سردار فضل کا فون آ گیا۔ اُس نے فون اٹینڈ کیا۔ سردار نے فوری طور پر اُسے اپنی کوشی میں طلب کیا تھا۔

آدھے گھنٹے میں وہ گاڑی دوڑاتا ہوا سردار کے پاس پہنچ گیا۔ سردار کو غصے کی حالت میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ پوچھا۔ ”سردار! خیر تو ہے؟“

سردار نے اُسے بڑے سفاک لہجے میں کہا۔ ”ہمارے پاس وقت کم ہے۔ بڑی سرکار کا حکم ہے کہ فوری طور پر چوہدری باسط کو اپنی پارٹی میں شامل کیا جائے۔ میں اور بڑی سرکار دونوں ملک فرید کے پاس گئے تھے۔ اُسے لے کر چوہدری باسط کے ڈیرے پر بھی گئے جہاں بیٹھ کر ڈیڑھ گھنٹے تک مذاکرات ہوئے۔ ان دونوں نے ہماری تمام آفرز کو ٹھکرا کر نہایت سخت رویہ اپنایا۔ بڑی سرکار کا حکم ہے فوری طور پر ایکشن لیا جائے اور چوہدری باسط کو رام کیا جائے۔“

وہ بولا۔ ”میں اور بشیر خان بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ رفیع اللہ کی آمد سے پہلے ہی اپنا کام نبھال لینا چاہیے۔ اُس نے چارج لے لیا تو پھر ہمارے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔“

سردار فضل اُس کے قریب صوفے میں بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں کرشمیں بدلتی ہوئے بے چینی دیکھ کر عالمگیر نے پوچھا۔ ”بڑی سرکار نے ایکشن کیلئے کوئی لائحہ عمل بھی بنا

ہوگا۔ اگر مناسب سمجھو تو مجھے کوئی راہ بچھا دو۔ پتہ نہیں کیا ہوا ہے میرے ذہن کو کہ صحیح طریقے سے کام ہی نہیں کر رہا۔“

سردار چند لمحے اُسے ملوثی نظروں سے دیکھتا رہا۔ کسی فیصلے پر پہنچ کر بولا۔ ”ہم دونوں نے ایک پروگرام ترتیب دیا ہے۔ اُسے پایہ تکمیل تک تم لوگوں نے پہنچانا ہے۔ کامیابی کی صورت میں بڑی سرکار کے خصوصی انعام کے مستحق ہو جاؤ گے۔“

وہ بیزاری سے بولا۔ ”سردار! مجھے انعام کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ میں اپنے کام کو سرانجام دیتے ہوئے تمہارے سوا کسی کی ہمدردی یا انعام کا لالچ دل میں نہیں رکھتا۔ تم کام بناؤ۔“

”چوہدری باسط کی دو بیٹیاں ہیں۔ بیٹا کوئی نہیں۔“ سردار صوفے میں کھسک کر اُس کے قریب آ گیا۔ دیواروں کے کانوں سے بھی اپنی آواز کو چھپانا چاہتا تھا۔ بولا۔ ”دونوں بڑی سرکار کے شہر کے گرلز کالج میں جاتی ہیں۔ ایک پڑھتی ہے، دوسری پڑھاتی ہے۔ اُن میں سے ایک کو اٹھا کر بڑی سرکار کے خفیہ اڈے پر لے جانا ہوگا جہاں اُس کو پانچ چھ گھنٹے رکھا ہوگا۔ سمجھ رہے ہونا میری بات؟“

وہ سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھا تو دریافت کرنے لگا۔ ”اِس سے ہمیں کیا فائدہ ملے گا؟“ سردار نے ایک آنکھ میچ کر معنی خیز انداز میں کہا۔ ”موج میلہ کرنا۔ جوانی کے بھوکے گھوڑے کو چارہ ڈالنا۔ جو جی میں آئے کرنا مگر یہ دھیان رکھنا کہ جو بھی کرنا، اُسے وڈیو کیمرے کی آنکھ میں اِس طرح محفوظ کر لینا کہ چوہدری باسط کی ڈم پر ہمارا پاؤں پکا پکا ٹھہر جائے۔ ملک فرید کی جھولی سے نکال کر چوہدری باسط کو اپنے قدموں میں بیٹھانے کیلئے وڈیو کیسٹ کا ایک منظر ہی کافی ثابت ہونا چاہیے۔ اغوا کا پتہ چلنے سے قبل اُسے آزاد کر دو گے۔“

اُس کے روٹنگے کھڑے ہو گئے۔ خالی الذہنی کی کیفیت میں سردار فضل کو دیکھنے لگا۔ بڑھاپے نے سرمہ سفید کر دیا تھا مگر من کے اندر چھپی ہوئی خباثت میں کوئی کی واقع نہیں ہوئی تھی۔ بیٹھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سردار! یہ فیئر نہیں ہوگا۔ چوہدری باسط کی بیٹی کا ہماری سیاست سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ کوئی اور طریقہ سوچو۔“

سردار ہتھ سے اکھڑ گیا۔ زہر خند لہجے میں بولا۔ ”سیاست میں ضمیر اور غیرت نام کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ ہم کسی کو پکڑواتے ہیں پھر اُسے چھڑوانے کے پیسے بٹورتے ہیں۔ غریبوں

آ جاؤ۔ میں شیر و کو پابند کردوں گا۔ وہ بھی یہیں ملے گا۔ تم دونوں بیٹھ کر پروگرام ترتیب دے لینا۔ یہ خیال رکھنا کہ کل رات تک یا پرسوں تک یہ کام مکمل ہو جانا چاہیے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

اُس نے اوکے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ زیر لب بڑی سرکار کو گالیاں دیتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ ”تمہارے باپ کے پاس بھی زیادہ وقت نہیں تھا کینے آدمی! ہمت کرو اور مردوں کی طرح آگے بڑھ کر چوہدری باسط اور ملک فرید پر ہاتھ ڈالو تو جانوں۔ سازشیوں کی طرح ایک غیر متعلق اور معصوم لڑکی پر بھوکے بھیڑیے جھوڑ کر تماشا دیکھنا چاہتے ہو۔ تلف ہے تمہاری مردانگی پر!“

بشیر خان مسکرانے لگا۔ پیٹھ پر تھکی دیتے ہوئے بولا۔ ”کبھی کبھی شیر کو ذائقہ بدلنے کیلئے نرم نرم گھاس پر منہ بھی مار لینا چاہیے۔ اکثر شکاری جانور ہاضمہ درست رکھنے کیلئے چارہ کھاتے رہتے ہیں۔“

وہ بیزاری سے بولا۔ ”تمہاری ضد پر ہتھیار ڈال کر میں یہ گنداکام کرنے چلا ہوں ورنہ اُن کی خاطر یہ ظلم کبھی نہ کرتا۔“

بشیر خان دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ اُس نے خاموشی کی زبان میں اُسے طعنہ دیا تھا۔ ”اے او عالمگیر! میرے نام پر ظلم کرو یا سردار کے حکم پر۔ جرم کی تعزیر ایک سی ہے۔ چوری لکھ کی ہو یا لکھ کی..... دفعہ ایک ہی لگتی ہے۔“

رات سنسان حویلی میں اُتر آئی۔ آج اُس کا دل بچھا بچھا سا تھا۔ کسی گہری سوچ میں غرق چارپائی پر لائین کی لرزتی لو پر نگاہیں جمائے لیٹا تھا۔ کافی دیر گزر گئی، آنے والی نہیں آئی تو اُس کی کمی محسوس کرنے لگا۔ وہ آتی تھی تو دل کو گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ آج نہ آنے پر دل ہول کھائے جا رہا تھا۔ وہ بند ہونٹوں کے عقب میں چلا اٹھا۔ ”آج میرا مغز چاٹنے کیلئے تمہارے پاس وقت نہیں ہے؟“

اچانک وہ سفید عکس لہرا گیا۔ اُس نے سنا کہ ماں غزدہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”علم دین سے عالمگیر بننے والے! اگر تم نے پڑھا ہوتا تو کبھی بھی کسی عورت پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہ کرتے۔ روز کہتے ہو کہ فرعون کیلئے موسیٰ بن کر اس راہ پر چل نکلے ہو۔ بتاؤ! کیا تم ایک نمسے انسان کو فرعون نہیں بنارہے ہو؟“

کی غربت کو اُن کے منہ پر مار کر اُن کے منہ سے نوالہ چھین لیتے ہیں، زکوٰۃ کی رقم کے پیرا حقدار ہم ہوتے ہیں، تم جو کچھ کرتے پھر رہے ہو، کیا یہ جائز ہے؟ کیا ضمیر ان کاموں کی اجازت دیتا ہے؟..... ہرگز نہیں۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ چوہدری باسط کی کوئی کمزوری ہاتھ لگنے والی نہیں ہے۔ دیو کی جان جس مینا میں اُٹکی ہوئی ہے، اُسی کو گردن سے دیو بوج کر دیو کو قدموں میں سرنگوں کرنا پڑے گا۔ عزت ہاتھ میں آنے پر وہ کوئی قانونی چارہ جوئی کرنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔“

وہ چند منٹ تک مزاحمت کرتے ہوئے اُسے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ نہیں مانا تو عالمگیر کو ہی ماننا پڑا۔ طوعاً و کرہاً حامی بھر کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ بشیر خان کو سردار کا حکم سنایا۔ کچھ دیر کے بعد پانچویں سر جوڑ کر بیٹھے صلاح و مشورہ کر رہے تھے۔ بشیر خان سمیت کئی چوہدری باسط کی شہ رگ پر پوری قوت سے پنجہ جمانے کے حق میں تھے۔ عالمگیر اُن کے جذبات سمجھتا تھا۔ گنگا نشان کرتے ہوئے دیوی کے درشن ملتے دکھائی دیتے تھے اس لئے سبھی پر جوش تھے۔

کچھ ہی دیر میں سردار کا حکم ماننے کا فیصلہ ہو گیا۔ بشیر خان نے کہا۔ ”اس مرتبہ پہلی طرح نہیں ہوگا کہ تم شکار کو بھگا کر فائرنگ کرنے لگو اور سردار کی آنکھوں میں دھول جھونک دو۔ یہ یاد رکھنا کہ اس مرتبہ شکار کی ہمیں بھی ضرورت ہے۔“

اُسے ولی طور پر چوہدری باسط کی بیٹی سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اُس کی زندگی میں ایسے کئی واقعات رونما ہو چکے تھے۔ وہ صرف رفیع اللہ سے ڈر رہا تھا۔ مبادا کہ ملک فرید الہا معاملے میں کوہِ رفیع اللہ کو چارج لینے سے پہلے گھسیٹ لے۔ اُسے بڑی سرکار کے اثر و رسوخ کا بھی بخوبی علم تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اس ضلع میں کوئی مائی کالا ایسا نہیں جو بڑی سرکار کو پھلانگ کر اُسے گرفت میں لے سکتا ہو مگر ایماندار آفیسر کا ٹکبہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔

سردار نے اُسے بڑی سرکار سے رابطہ کرنے اور ڈکیشن لینے کی ہدایت بھی کی تھی۔ اُس نے نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر مؤدب لہجے میں بولا۔ ”سردار فضل خان نے آپ سے رابطہ کرنے کا حکم دیا تھا۔“

سردار مظفر علی خان کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”تم کل کسی وقت میری کوٹھی؟“

وہ بولا۔ ”اماں! تم فکر نہ کرو۔ میں ایک طرف جرم کرتا ہوں، دوسری طرف نیکی بھی کرتا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں کہ تم کس نیکی کی طرف اشارہ کر رہے ہو۔“ ماں کا دکھ میں بجھا ہوا لہجہ بھینگے لگا تھا۔ ”وہ بھی عورت ہے۔ تم ایک طرف نہیں، دونوں طرف ظلم کرنے چلے ہو۔ میں کہتی ہوں کہ لوٹ آؤ۔ خود کو قانون کے حوالے کر کے خدا سے معافی مانگو۔ ہو سکتا ہے تمہارے آنسو اُس ذاتِ بابرکت کو پسند آجائیں اور وہ تمہیں تمہارے گناہوں سمیت بخش دے۔“

وہ ہنسنے لگا۔ وہ بولی۔ ”غور کر علم دین! تمہاری ہنسی میں بھی فروغِ نیت خود کر آئی ہے۔“ وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ اُس کے ساتھی جاگ گئے۔ اُسے یوں ہڈیانی انداز میں ہنسنے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ اُس کی چار پائی پر پیٹھ کر اُسے جھنجھوڑنے لگے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ دماغ نے گرمی پکڑ لی ہے۔ کوئی سر سام بتلا رہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے پورے حواس میں تھا۔ بیٹے کی توجہ ہٹتے دیکھ کر ماں اوجھل ہو گئی۔ سمجھانے وال بات سمجھا گئی تھی۔ جسے اپنے پیچھے لگانا چاہتی تھی، وہ غچہ دے کر نکل گیا تھا۔

پانی پیا، بشیر خان نے دودھ گرم کر کے پلایا۔ کچھ دیر تک سردرد کا بہانہ کرتا رہا پھر لحاف میں دبک کر سو گیا۔ ابھی اُسے اگلے دن کیلئے پلاننگ کرنا تھی۔ سردار فضل اور سردار مظفر کیلئے چوہدری باسط کی عزت کے آسمان کا تارا توڑ کر لانا تھا۔ اُس کے نزدیک یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اپنی ماں کو چپ کرانا مشکل دکھائی دیتا تھا۔

صبح اُس نے شہر علی کو اپنے ساتھ چلنے پر تیار کیا۔ نکلنا ہی چاہتا تھا کہ سردار کا فون آ گیا۔ اُس نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے سردار؟ اتنی تر کے فون کر رہے ہو لگتا ہے آکھ کھلے ہی میں یاد آ گیا ہوں۔“

سردار قہقہہ لگا کر بولا۔ ”ابھی بڑی سرکار کا فون آیا تھا۔ اُس نے تمہیں یاد کیا ہے۔ میں نے تمہیں یاد دہانی کرانے کیلئے رابطہ کیا ہے۔“

وہ کال منقطع کرنے والے بٹن پر انگلی رکھ کر بولا۔ ”میں اور شہر نکل ہی رہے ہیں۔“ شہر میں پہنچے۔ ہر طرف ریل پیل دیکھ کر عالمگیر سوچ میں پڑ گیا۔ لوگ چلتے ہوئے جھکتے نہیں تھے۔ صبح چلتے تھے، شام چلتے تھے۔ نہ جانے ان کا انجام کیا تھا۔ یہ ضلعی ہیڈ کوارٹر تھا۔

سردار فضل کے شہر سے کافی بڑا تھا۔ رواں دواں ٹریفک کے بیچ میں رستہ بناتے ہوئے وہ سردار مظفر کی محل نما کوٹھی پر پہنچے۔ کوٹھی کو دیکھ کر مغل شہنشاہوں کی یاد تازہ ہونے لگتی تھی۔ کوٹھی کے عین سامنے لڑکوں کا کالج واقع تھا جہاں اُن گنت نوجوان بیروزگاری کا عذاب جھیلنے کیلئے تربیت حاصل کرتے تھے۔

خاص کمرے میں بڑی سرکار اور شیر و اُن کے منتظر تھے۔ تواضع کے بعد بڑی سرکار نے کسی کو بالخصوص مخاطب کئے بغیر کہا۔ ”آج تم لوگ تمام انتظامات مکمل کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم صبح اپنا کام کر دکھاؤ۔“

عالمگیر نے کہا۔ ”اس کام میں اتنی غلٹ کیوں برتی جا رہی ہے؟ ابھی انتخابات میں پورا مہینہ باقی ہے۔ غلٹ ہمارے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔“

شیر و نے کہا۔ ”تم نے صرف ایک تحصیل کو کور کرنا ہے۔ ہمارے لئے پورے ضلع کو نیٹھ ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی چند دن فرصت کے ہیں، بعد میں ہمارے پاس وقت نہیں ہوگا۔“

اُس نے سر ہلا کر خاموشی اختیار کر لی۔ وہ، شیر اور شیر و تینوں مل کر پروگرام بنانے لگے۔ آدھے گھنٹے میں پروگرام تشکیل پا چکا تو تینوں بڑی سرکار کے خاص کمرے سے نکل کر شہر کے مغربی حصے میں واقع ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ چوہدری باسط کی لڑکی کو اغوا کر کے یہاں لایا جاتا تھا۔ شیر نے مشورہ دیا۔ ”عالمگیر! ایک کی بجائے دونوں لڑکیوں کو اغوا کرنا پڑے گا۔ دونوں اکٹھے کالج میں آتی ہیں۔ ایک کو اغوا کیا گیا تو دوسری چند منٹوں میں ہی آسمان سر پر اٹھالے گی۔“

ان سے بہت بڑی غلطی سرزد ہونے والی تھی۔ ستائشی نظروں سے شیر کو دیکھتے ہوئے شیر و نے کہا۔ ”ویل ڈن شیر! تم لا جواب انسان ہو۔ اس طرف تو ہم نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔“

”ہمارے منصوبے میں ایک اور بہت بڑی خامی موجود ہے۔ وڈیو بنانے کیلئے لڑکی کا آمادہ ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ جبر ظاہر ہوتا ہے جو مغویہ کو بے قصور ثابت کر دیتا ہے۔“ شیر نے سوچ کر کہا۔ ”بڑی بہن کو چھوٹی کے نام پر بلیک میل کر کے ہم اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ دونوں کو اغوا کرنا اس لحاظ سے بھی ضروری ہے۔“

عالمگیر اُس کا ہم خیال ہو گیا۔

واردات کیلئے وہ نہ صرف پلاننگ کر رہے تھے بلکہ انتظام و انصرام میں بھی مسلسل بڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑا بے داغ منصوبہ تشکیل دے لیا تھا۔ شام کو جب اوکے کی رپورٹ ملی تو عالمگیر نے شبر کو اپنے ٹھکانے پر بھیج دیا اور سمجھا دیا کہ وہ بشیر خان کے علاوہ باقی افراد کو شہر میں بھیج دے۔ اُس کے نقش پا پر چلتے ہوئے شیر و نے بھی اُن بندوں کو ٹھکانے پر بلالیا تھا جو بہت کم منظر عام پر آئے تھے۔

شکاریوں نے پجان باندھ لی تھی۔ اُن کے جال میں چھسنے والی بے خبری میں اپنی بہن کے ساتھ گھر سے کالج جانے کیلئے نکل آئی تھی۔ دنیا پہلے جیسی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں بینیں کلائیوں پر وقت دیکھتے ہوئے ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع دیگن اسٹینڈ پر پہنچ گئیں۔ چھوٹی بولی۔ ”باچی! آج سردی کل سے کہیں زیادہ ہے۔ چھٹی کر لیتیں تو اچھا تھا۔ مزے سے صحن میں بیٹھ کر دھوپ تاپتے ہوئے مونگ پھلی کھاتیں۔“

بڑی نے مسکرا کر کہا۔ ”بلاوجہ چھٹی کرنے سے بندہ اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے ایک قدم کو کھو بیٹھتا ہے۔“

ایک دیگن آ کر اُن کے پاس رُک گئی تھی۔ چند ایک سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہمیشہ خالی نشست دو چار دیگنیں گزار کر ملتی تھی۔ وہ لپک کر اُس میں سوار ہو گئیں۔ کنڈیکٹر نے گیٹ بند کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔ ”چل! استاد! گاڑی کو جہاز بنا دے ورنہ بچھلی گاڑی کر اس کر کے سٹینڈ پر پہلا نمبر حاصل کر لے گی۔“

ڈرائیور کو ایسی لیئر پر پاؤں کا وزن بڑھانے کا معقول جواز ہاتھ لگ گیا۔ گاڑی فرائے بھرنے لگی۔ اپنی اپنی نشستوں پر براجمان مسافر چادروں کی بکلوں میں سے جھانک کر ایک دوسرے کو معنی خیز اشارے کرنے لگے۔ بغیر کسی رکاوٹ کے انہوں نے اپنے مشن میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ شہر میں داخل ہو کر گاڑی اجنبی راستے پر مڑی تو دونوں بہنوں کو پریشانی لاحق ہوئی۔ بڑی نے پوچھا۔ ”ہم نے کالج اسٹاپ پر اترنا ہے۔ یہ کس طرف جا رہے ہو تم؟“

ڈرائیور نے پیچھے دیکھے بغیر کہا۔ ”بی بی! بے فکر بیٹھی رہو۔ ادھر پولیس والے کھڑے چالان کر رہے ہیں۔ ہم شہر کا چکر کاٹ کر تمہیں کالج اور دوسرے مسافروں کو دیگن اسٹینڈ پر

پہنچادیں گے۔ کوئی اغوا تھوڑی کر رہے ہیں۔“

مسافروں نے ملا جلا قہقہہ لگایا۔ دونوں بہنوں کو سنانے کیلئے ٹریفک پولیس والوں پر طنز کرنے لگے۔ وہ مطمئن ہو گئیں۔ جب اچانک دیگن موڑ کاٹ کر بڑی سی کٹھنی کے کھلے میں گیٹ میں داخل ہوئی تو دونوں خوفزدہ ہو کر ارد گرد دیکھنے لگیں۔ چھوٹی چلائی۔ ”یہ تم ہمیں کہاں لے کر آ گئے ہو؟ گاڑی روکو اور ہمیں یہیں اُتار دو۔“

انہیں حالات کی سنگینی کو پوری طرح سمجھنے تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ شکاریوں کی تپتی ہوئی ہڈیاں میں ہر نیوں کا گوشت اتر چکا تھا۔ ایک نے گیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو کئی ہاتھ اُس پر لپک پڑے۔ اُن کی آن میں انہیں دبوچ کر اندر لے جایا گیا۔ وہ اِس طرح ہاتھ لگی تھیں کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیا تھا۔

لوہے کے پائپوں والی چار پائپوں پر آ منے سامنے بیٹھے عالمگیر اور شیر و نے کھلے دروازے کے پار دیکھا۔ اُن کے کارندے دونوں لڑکیوں کو گھسیٹتے ہوئے کوریڈور کے آخری سرے پر واقع بڑے کمرے میں لے گئے تھے جہاں اُن کے سوا گت کیلئے تمام تر انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ شیر و نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ”بشر علی غضب کا منصوبہ ساز بندہ ہے۔ سواریاں دیگن پر چڑھ کے کالج پہنچیں۔ کالج میں پڑھائی کرنے کے بعد دیگن میں سوار ہو کر اپنے شاپ پر اتر گئیں۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوگی کہ آج پڑھایا جانے والا سبق پہلے جیسا نہیں تھا۔“

عالمگیر مسکرا کر اپنی عادت کے مطابق دانتوں سے ناخن کاٹنے لگا۔ بظاہر مطمئن دکھائی دینے والا عالمگیر اندر ہی اندر شدید اضطراب کا شکار ہو چکا تھا۔ چند منٹوں کے بعد شیر و کے ایک کارندے نے اندر جھانک کر دیکھا اور آہستگی سے کہا۔ ”استاد شیر و! ڈھالے باندھ کر لوکیشن چیک کر لو تا کہ ہم اپنا کام شروع کریں۔“

دونوں نے اپنے چہرے ماہرانہ انداز میں چھپائے اور بڑے کمرے میں آ گئے۔ دروازے میں کھڑے ہو کر دونوں نے مشاقانہ نگاہوں سے پورے کمرے پر نگاہ دوڑائی۔ کمرے کے آخری سرے پر چھوٹی بہن کو کھڑی چار پائپ کے ساتھ ٹائیلوں کی رسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود گردن موڑ کر کمرے میں ہونے والی کارروائی کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بڑی بہن کمرے کے وسط میں رکھے بڑے سے بیڈ کے وسط میں بیٹھی ہچکیاں

تعاون پر آمادہ ہو جائے گی۔“

وہ آہنما طویل سانس سینے میں اُتار کر بولا۔ ”شیر و استاد! مشکل سوال کے مقابلے میں آسان سوال رکھا جائے تو بندہ سر جھکا کر آسان سوال حل کرنے لگتا ہے۔ اُس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ نہ جانے ہمارے سامنے کیسا پرچہ حل کرنے کیلئے رکھا جائے گا۔“

شیر و ہنسنے لگا۔ اُس کے شانے پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر بولا۔ ”ہمارے ہاتھوں میں پرچہ تھا کہ ہاتھ قلم کر دیے گئے ہیں۔ قلم ڈیک پر دھرا ہے اور ہم خالی شانے لئے کمرہ امتحان میں ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے ہیں۔ ہم پر جرائم کا بوجھ اتنا لد چکا ہے کہ جب بھی پکڑے گئے، پولیس مقابلے میں پار کر دیے جائیں گے یا عدالت ہمیں سزائے موت دے دے گی۔ ہماری جان خطرے میں ہے اس لئے ہم ہر کسی کی جان اور عزت کو خطرے میں ڈالتے رہتے ہیں۔“

بڑے کمرے سے کچھ مشکوک آوازیں برآمد ہو رہی تھیں جو انہیں تسلی دے رہی تھیں کہ اُن کا شن بغیر کسی کھٹائی کے پایہ تکمیل تک پہنچ رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد دونوں اٹھ کر کوٹھی کے لان میں آ کر بیٹھ گئے۔ اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے دونوں بڑے معزز دکھائی دے رہے تھے۔ زمانہ کمرے میں بپا ہونے والی قیامت سے بے خبر اپنی مستی میں مگن تھا۔

جب دیگن لڑکیوں کو مصنوعی مسافروں کے جلو میں لے کر روانہ ہو رہی تھی تو عالمگیر اور شیر و دونوں اُس طرف پیٹھ کئے بیٹھ تھے۔ دیگن کے انجن کی آواز سے اندازہ ہوا کہ جانے والے جا چکے ہیں۔ شیر و کا ایک کارندہ اُن کے پاس آیا۔ دو وڈیو کیسٹیں اُن کے سامنے پڑے لوہے کے پائپ والی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”استاد عالمگیر! ایک میں ملک فرید کی کوٹھی کی وڈیو اور سیپ شارٹ ہیں۔ دوسری میں.....“

بات اھوری چھوڑ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ عالمگیر نے شیر و کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میں آج رات ہی لاہور کیلئے نکل جاؤں گا۔ دونوں فلموں کی ایڈیٹنگ اس انداز میں کروں گا کہ دیکھنے والے کو یہی پتہ چلے کہ ملک فرید کی کوٹھی کے کمرے میں یہ کارروائی کی گئی ہے۔ چند دن لگ جائیں گے اس کام میں۔“

شیر و بولا۔ ”یہ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ میرے ذمہ لگایا گیا کام کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔“ اپنے کارندے کی طرف منہ کر پوچھنے لگا۔ ”تم نے فلم لڑکیوں کو

لے رہی تھی۔ وڈیو کیمرہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر دونوں آگاہ تھے کہ کہیں چھپے ہوئے کیمرے کی آنکھ کمرے کی نقل و حرکت کو ہمیشہ کیلئے محفوظ کر رہی ہوگی۔

عالمگیر کے ایک ساتھی نے اشارہ پاتے ہوئے اپنی کارروائی کا آغاز کیا۔ بیڈ کے پاس آ کر کہا۔ ”اے لڑکی! تم دونوں اس وقت پوری طرح ہمارے شکنجے میں ہو۔ ہم تمہیں گولی بھی مار سکتے ہیں۔ مگر تمہیں قتل کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔“

وہ سکتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا جو بھی مقصد ہو، قتل سے کسی طور کم نہیں ہوگا۔ کیا چاہتے ہو؟“

وہ سفاکی سے بولا۔ ”ہم صرف تمہیں چاہتے ہیں۔ تمہاری بہن پیٹھ کئے کھڑی ہے۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گی تو وہ محفوظ رہے گی۔ اُس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔“ دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن لہراتے ہوئے اُسے ڈرانے کیلئے اپنا لہجہ سخت کر کے بولا۔ ”اگر تم تعاون نہیں کرو گی، جیسا ہم کہیں گے ویسا نہیں کرو گی تو یہ سوچ لو کہ ہم اپنا کام کر کے ہی رہیں گے۔ اس صورت میں تم دونوں پر عذاب نازل ہو جائے گا۔ چند منٹ دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تم یا تم دونوں؟“

وہ روتے ہوئے نہیں کرنے لگی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”خدا کا خوف کھاؤ۔ میرا باپ دل کا مریض ہے۔ اُسے جب اس قیامت کا پتہ چلے گا تو وہ جان دے دے گا۔“

گن بردار بولا۔ ”میں نے تمہیں بتلایا ہے کہ اگر تم تعاون کر دو گی تو تمہارے باپ کو پتہ تک نہیں چلے گا۔“

وہ سوچنے لگی۔ ”اتنا بڑا حادثہ چھپائے سے نہیں چھپتا۔ آج یا کل..... ابا کو پتہ چلا جائے گا۔ تب کیا ہوگا؟“

آنسو خشک ہو گئے۔ سوچنے لگی۔ ”جو اتنا بڑا قدم اٹھا چکے ہیں وہ جو بے ہاتھوں کو دیکھ کر انہیں چھوڑ نہیں دیں گے۔ میں اکڑ دکھاؤں گی تو یہ درندے میرے ساتھ ساتھ میرا چھوٹی بہن کو بھی اڈھڑ دیں گے۔ دونوں کے مرنے سے بہتر ہے کہ ایک مر جائے۔ میں بڑی ہوں۔ مجھے ہی ذلت کی گہری کھائی میں اُترنا ہوگا۔“

عالمگیر اور شیر و مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل آئے۔ اپنے کمرے میں بیٹھ کر شیر و نے کہا۔ ”بوی لڑکی خاصی عقلمند دکھائی دیتی ہے۔ چھوٹی کو بچانے کیلئے

دکھا دی تھی؟“

وہ بولا۔ ”بڑی کو دکھائی تھی۔ اُسے سمجھا بھی دیا تھا کہ اگر کسی کو کچھ بتانے کی کوشش کی اس فلم کی کاپیاں گاؤں بھر میں پھیلا دی جائیں گی۔“

عالمگیر دونوں کیشتیں اٹھائے ہاتھ لہراتا ہوا کٹھنی سے نکل آیا۔ اُس کی گاڑی بڑی سرگرم کی کٹھنی میں کھڑی تھی۔ وہاں تک اُسے رکشا پکڑ کر جانا تھا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اُس نے سردار کوفون پر مشن میں کامیابی پر مبارکباد دے دی تھی۔ سردار کی آواز سن کر ہی اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اُس کے روم روم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

لیکن سے اپنے اسٹاپ پر اترنے والی دونوں لڑکیاں ایک دوسرے سے نظریں جڑا رہی تھیں۔ آج جو پڑھا تھا، وہ دنیا کے کسی بھی نصاب میں لکھا ہوا نہیں تھا۔ بڑی بہن نقابت سے قدم گھسیٹتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ”جی چاہتا ہے کہ زمین شق ہو جائے اور میں اُس میں چوٹی تک اتر جاؤں۔ پڑھانے گئی تھی، غلاظت کی پوٹلی بن کر واپس آئی ہوں۔ علم کی ٹٹا روشن کرنے کیلئے گھر سے نکلی تھی، ایسی آگ بدن میں بھرا لائی ہوں جو مرتے دم تک سکھ کا سانس نہیں لینے دے گی۔ شکر ہے کہ پڑھنے کیلئے میرے ساتھ جانے والی بخیر و عافیت لوٹی ہے۔“

چھوٹی سوچ رہی تھی۔ ”دیکھا نہیں مگر محسوس بہت کچھ کیا ہے۔ میرے لئے باجی نے اپنی عزت کی قربانی دے کر مجھے ہمیشہ کیلئے خرید لیا ہے۔ کاش! ہم دونوں دھوپ سینکنے کیلئے صحن میں چار پائیاں بچھا کر پڑی رہتیں اور یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ ہائے اللہ! یہ کیسی قیامت ہم دونوں پر ٹوٹ پڑی ہے جس سے پوری دنیا بے خبر ہے۔“

یکبارگی دونوں کے دل سے دعا نکلی کہ دنیا جس طرح بے خبر ہے، ایسے ہی قیامت تک بے خبر رہے ورنہ کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔



ڈرائیور اور باڈی گارڈ دونوں نے شاپنگ سنٹر سے متصل تمام علاقہ کنگھال مارا تھا مگر بی کا کہیں پتہ نہ چلا۔ پولیس کی گاڑیاں جاہ جا پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بڑی احتیاط سے کئی پولیس والوں سے بھی دریافت کیا مگر کوئی سراغ ہاتھ نہ آیا۔ رحمت بی کو اس امید پر فون کیا کہ ہو سکتا ہے وہ رکشایا ٹیکسی پکڑ کر گھر پہنچ گئی ہو۔ وہ گھر نہیں پہنچی تھی۔

دونوں کی حالت خراب ہونے لگی۔ ہونٹوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ڈرائیور نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بی بی کو زمین نکل گئی یا آسمان؟ دو گھنٹوں میں ہم نے پورا علاقہ چھان مارا ہے۔ سردار ہمیں کچا چبا ڈالے گا جب اُسے پتہ چلے گا کہ بی بی غائب ہو گئی ہے۔“

گارڈ نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں تھانے اور ہسپتال چیک کرنا چاہئیں۔ امید ہے کہ کہیں نہ کہیں ہمیں بی بی مل جائے گی۔ اگر نہ ملی، تب سردار کو اطلاع کر دیں گے۔“

ڈرائیور چاہتا تھا کہ فوری طور پر سردار کوفون پر مطلع کر دینا چاہیے۔ گارڈ اس حق میں نہیں تھا۔ دونوں نے اطراف کے ہسپتالوں اور تھانوں سے رابطہ کیا مگر ناکامی ہوئی۔ نامراد ہو کر کٹھنی پر پہنچے۔ تب تک چار گھنٹے بیت چکے تھے۔ رحمت بی نے انہیں بتلایا کہ بی بی کٹھنی پر نہیں پہنچی۔ وہ دونوں سر پیٹ کر رہ گئے۔ ڈرائیور نے فکر آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ سردار کوفون کر کے مطلع کر دیتے ہیں۔ اب وہ اس بات پر بھی خفا ہو گا کہ ہم نے فون کرنے میں اتنی تاخیر کیوں کی۔“

رحمت بی کو ابھی صورت حال کی سنگینی کا احساس نہیں تھا۔ اُن کی باتیں سن کر سراسیمہ لگا ہوں سے باری باری دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔ گارڈ نے اُسے شاپنگ سنٹر میں ہونے والے دھماکے اور بی بی کے نہ سمجھ میں آنے والے غیاب کے بارے میں تفصیل سے بتلایا۔ وہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ سر پٹنے لگی اور انہیں کوسنے لگی۔ ”تم پر سردار ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے۔ حرام کھلاتا ہے۔ صرف اس لئے کہ تم بی بی کی حفاظت کرو۔ تم اُسے کسی مصیبت میں ڈال کر بیجڑوں کی طرح تالیاں بجاتے گھر آ گئے ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے اور وہ جہاں سے بھی ملے، لے کر آؤ ورنہ.....“

دور کے آگے والا کام سردار کا تھا۔ تینوں کو اپنی ہڈیاں ٹونٹی دکھانی دے رہی تھیں۔ امتوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ ایسے میں فلسفہ لائن فون کی گھنٹی بجی۔ یوں لگا جیسے کانوں کے قریب کوئی بم پھٹ گیا ہوں۔ دونوں اُچھل پڑے۔ گارڈ نے کمرے میں جا کر سی ایل آئی پر درج نمبر پڑھا۔ خون خچر کر آنکھوں میں آ گیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”سردار کا فون ہے۔ آ کر سنو!“

رحمت بی اور ڈرائیور اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں پڑ

وہ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں ٹھیک ہوں۔“

وہ تینوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ رحمت بی کو سردار کا فون یاد آ گیا۔ بھاگتی ہوئی کمرے میں پہنچی۔ فون اٹھایا اور جلدی سے بولی۔ ”سردار! معاف کرنا۔ میں بی بی کا سر دبانے میں مصروف تھی۔ وہ سوئی ہے تو میں فون سننے کیلئے آئی ہوں۔“

سردار نے غصے سے کہا۔ ”میں پندرہ منٹ سے فون تھام کر بیٹھا ہوں۔ خدا جانے تم لوگوں کو عقل کب آئے گی۔ شانی ٹھیک تو ہے ناں؟“

اُس نے بات بنائی۔ ”اُسے سر میں درد تھا۔ مجھے کہنے لگی کہ سر دبا دو۔ میں اُس کے سر ہانے بیٹھی تھی کہ آپ کا فون آ گیا۔ آپ جانتے تو ہیں کہ وہ اپنی مرضی کرتی ہے۔ میں نے کہا بھی کہ سردار صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ وہ کہنے لگی کہ جب میں سو جاؤں تب جا کر فون سننا۔“

سردار زیر لب مسکرانے لگا۔ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بولا۔ ”وہ جاگے تو اُسے کہنا کہ اپنے پاپا کو فون کرے۔ احقر نہیں نی!“

فون بند ہو گیا۔ رحمت بی نے سکون کا سانس لیا۔ دونوں کو مخاطب کر کے بولی۔ ”میرا منہ کیا دیکھتے ہو؟ جاؤ! اُس کو نہ کہہ کر آؤ اور بی بی کا چیک اپ کراؤ۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ابھی تک خونزدہ ہے۔“

دونوں نے جانے میں کوئی سستی نہیں دکھائی۔ اُن کو بڑھا کر رحمت بی شانی بی بی کے کمرے میں آئی۔ وہ بیڈ پر آڑھی ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے اُس کے بے ترتیب جسم کو گھسیٹ کر سیدھا کیا۔ سر کے نیچے سر ہانہ رکھا اور کمر تک کمبل اوڑھا دیا۔ سرد باتے ہوئے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی۔ ایسے میں اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ رحمت بی کو غور سے دیکھنے لگی۔ بولی۔ ”یوں لگتا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ تم خواب ہو؟ اگر خواب ہو تو میری نظروں سے اوجھل ہو جاؤ۔ اگر حقیقت ہو تو میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے یقین دلاؤ۔“

لہجہ بکھرا ہوا تھا۔ رحمت بی کا دل ہول کھانے لگا۔ اُس کی آنکھوں پر پیار سے ہاتھ پھیر کر بولی۔ ”میری جان! تم ہوش میں ہو۔ جاگ رہی ہو۔ میں تمہارے پاس بیٹھی ہوں۔

رہی تھی کہ وہ سردار کا فون اٹینڈ کرتا۔ بیل تھک کر خاموش ہو گئی تو وقتی طور پر یوں محسوس ہوا جیسے قیامت آ کر وارننگ دے کر چلی گئی ہو۔ رحمت بی نے بڑی دند کا پردہ بنا کر باہر دیکھا۔ دونوں کو امید بندھی کہ ہو سکتا ہے بی بی آ گئی ہو۔ رحمت بی کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر دونوں کے منہ لٹک گئے۔ فون پھر جاگ پڑا تھا۔ گارڈ نے طوعاً و کرہاً فون اٹھایا۔ سردار کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”کیا سب لوگ مر گئے ہو؟ فون کیوں نہیں اٹھاتے؟“

وہ بولا۔ ”جج..... جی سردار!“

آواز گلے میں ہی کہیں پھنس کر رہ گئی تھی۔ سردار نے ڈپٹے ہوئے کہا۔ ”رحمت بی کرم ہے؟ اُسے بتاؤ کہ سردار کا فون ہے۔“

۔ ”جی ایک منٹ! ابھی بلواتا ہوں۔“ یہ کہہ کر گارڈ سہمی ہوئی نگاہوں سے رحمت بی کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک مین گیٹ پر ہارن بج اٹھا۔ سردار کے فون کو ہولڈ پر منتظر رکھ کر تینوں بجلی کی سرعت سے گیٹ پر بھاگ گئے۔ گارڈ نے گیٹ کھولا۔ باہر ہسپتال کی ایسبولینس کھڑی تھی۔ تینوں کے دل دھک سے رہ گئے۔ اگلی نشست سے سفید کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی اُتر کر اُن کی جانب آیا۔ قریب آ کر بولا۔ ”سردار فضل خان کی کوئی بھی ہے؟“

تینوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گارڈ نے پوچھا۔ ”خیر تو ہے ناں؟“

وہ بولا۔ ”بالکل خیریت ہے۔ سردار فضل خان کی بیٹی دھماکہ سن کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ ایک رفاہی ادارے نے اُسے اٹھا کر ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ ہوش میں آنے پر اُسے لے آئے ہیں۔“

اُسی دوران ایسبولینس کا پچھلا گیٹ کھلا۔ شانی بی بی ڈگمگاتے قدموں سے چلتی ہوئی اُن کی طرف آنے لگی۔ تینوں بھاگ کر اُس تک پہنچے۔ ٹولتی نظروں سے دیکھا۔ بخیریت! کر اطمینان کا سانس لینے لگے۔ ڈرائیور نے کچھ نوٹ ایسبولینس سے برآمد ہونے والے سفید پوش کو تھمائے اور وہ سب یہ غلت کوشی میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے کسی نے پوچھنے اور دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی کہ ایسبولینس کس ہسپتال سے آئی تھی۔ شانی بی بی کو کمرے میں پہنچا کر تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ رحمت بی نے اُسے بلاتے لٹاتے ہوئے پوچھا۔ ”بی بی! اب طبیعت کیسی ہے؟“

دیتا تھا۔ نہیں پلٹا۔ رگوں میں اترنے والی سکون آور دوانے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ وہ ننھے ننھے خرائے لینے لگی۔ رحمت بی نے ایک دوسرے دروازہ کھول کر اُسے دیکھا۔ تلی پا کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگی۔ ”شکر ہے کہ میں نے سردار کا فون نہیں اٹھایا۔ اللہ نے بی بی کو بحفظ وامان عین موقع پر بھیج دیا ورنہ سردار نے ہم تینوں کی کھال کھینچ کر بھس بھر دیتا تھا۔“

بعض قیامتیں نوازش کا روپ دھار کر آتی ہیں، بعض عافیت کے کپڑوں میں ملبوس ہو کر آتی ہیں۔ آ کر چلی جاتی ہیں اور انسان کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ جب دبے پاؤں گزر جانے والی آندھی کے اثرات دیکھتا ہے تو سوچنے لگ جاتا ہے کہ یہ کب اور کیسے ہو گیا؟..... ایسے میں اُسے کوئی دکھائی نہیں دیتا جو اُسے بتلا دے کہ کس نے کیا کر دیا ہے۔

دن چڑھ آیا تھا۔ راحت بی کئی مرتبہ اُسے جگانے کیلئے کمرے میں آئی مگر ہمت نہ پا کر لوٹ گئی۔ موبائل فون بے جان تھا۔ دل کی طرح دھڑکنے کے علاوہ کوئی کام نہیں جانتا تھا۔ اُسے نہیں پتہ تھا کہ خوابیدہ حسن کو بیدار کرنے کی کیا سزا مل سکتی ہے۔ وہ چیخ اٹھا۔ شانی نے اٹھ کر اُسے دیکھا۔ جسارت پر خفا ہو کر آنکھیں ملنے لگی۔ اُس کی بے رخی پر بھی فون خاموش نہیں ہوا تو اُس نے لپک کر اُسے اٹھا لیا۔ فون پر۔ ”پاپا“ کا لفظ جگمگا رہا تھا۔ اُس نے سر جھٹک کر بکھرے ہوئے بالوں کو کمر پر ڈالا اور فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔ ”ہائے پاپا! اتنی مزے کی نیند آئی ہوئی تھی کہ آپ نے جگا کر مزہ کر کر اکر دیا۔“

سردار کی متشکر آواز سنائی دی۔ ”بیٹی! خیریت تو ہے نا؟ اتنی دیر گئے تک سو رہی ہو۔ کیا یونیورسٹی نہیں جاتا تھا؟“

دہ ہنسنے لگی۔ ہنسنے ہنسنے لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ باپ کی آواز آئی۔ ”یہ کیا بد تمیزی ہے؟ سیدھی طرح بتاؤ کہ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ وہ بمشکل خود پر قابو پا کر بولی۔ ”پاپا! آپ بھی بڑے عجیب ہیں۔ کیا میں اتوار کے دن کیپس پہنچ جایا کروں؟“

باپ جھینپ کر ہنسنے لگا۔ بولا۔ ”اچھا! بوڑھے باپ پر ایسے ہنسنے والی کو اتنا پتہ تو ہوتا چاہیے کہ میں کل شام سے اب تک کئی مرتبہ فون کر چکا ہوں۔ جب پوچھو، پتہ چلتا ہے کہ بی بی صاحبہ سو رہی ہیں۔ سونے کے علاوہ بھی کوئی کام کر لیا کرو۔“

تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم دھماکے میں تجھے رتی بھر چوٹ بھی نہیں آئی۔ وہ آنکھیں کھولے سوچنے لگی۔ ہم دھماکہ؟

مسکرانے لگی۔ نسبتاً بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”لگتا ہے تم خواب دیکھ رہی ہو۔ میں جاگ رہی ہوں۔ ہائے! اتنا عجیب خواب دیکھا ہے میں نے کہ ابھی تک یوں محسوس ہوا ہے جیسے خواب میں ہی پڑی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بیڈ میں اٹھ بیٹھی۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ یقین آ گیا کہ اپنی خواب گاہ میں بیٹھی ہوئی ہے۔ رحمت بی کی گود میں سر رکھتے ہوئے مسکرانے لگی۔ ایسے میں گارڈ اور ڈرائیور ڈاکٹر کو لے آئے۔ ڈاکٹر نے اُسے چیک کیا۔ اُس سے کچھ دریافت بھی کیا۔ وہ بولی۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ عجیب سا خواب دیکھا ہے۔ دل بہرہ دی خواب دیکھنا چاہتا ہے۔ آپ کے پاس کوئی ایسا اینکہ ہے جو مجھے واپس اُس خواب میں لے جاسکتا ہے تو مجھے لگا دیں۔“

ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ ”ہاں بیٹی! ایسا ایک اینکہ ہے جو تمہیں اپنی من چاہی دنیا میں واپس لے جاسکتا ہے۔ لاؤ! بازو! ادھر کرو۔“

اُس نے میڈیکل باکس میں سے ایک ایپیپول نکالا۔ سرخ بھر کر اُس کے بازو کی دہائی میں انجیکٹ کر دیا۔ گارڈ سے مخاطب ہوا۔ ”فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بے ہوش رہا ہے۔ بے ہوشی میں خواب دیکھتی رہی ہے۔ میں نے اسے سکون آور دوا دے دی ہے۔ یہ گولیاں کھلا دیں اور اسے آرام کرنے دیں۔ جب سو کر اٹھے گی تو بالکل فریش اور تندرست ہوگی۔“

چند منیٹ دے کر، فیس بنور کر وہ چلا گیا۔ تینوں نے سنا کہ کاسانس لیا۔ آئی ہوئی قیامت اُلٹے پیروں پلٹ گئی تھی۔ اپنی خوش قسمتی پر نازاں تینوں اپنی اپنی دنیا میں سمٹ گئے۔

دوا اپنا رنگ دکھانے لگی۔ وہ خود کو ہوا میں اڑتا محسوس کرنے لگی۔ روٹھے ہوئے خواب کو غنودگی میں آوازیں دینے لگی۔ ادھوری نیند میں بڑبڑانے لگی۔ ”اے! تم بھی رئیس کی طرح میری طرف پلٹ آؤ۔ مجھے اپنی بانہوں میں لے کر مجھے یقین دلاؤ کہ میں دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ہوں۔ مجھے بتلاؤ کہ مجھے فتح کرنے کیلئے اب بھی زمانہ جنگیں لڑنا ہے۔ لوٹ آؤ میرے من چاہے خواب.....“

کبھی کبھی اب لوٹ آتے ہیں۔ اُس سے ایک بار کا دیکھا ہوا خواب ناراض دکھائی

چور کردی گئی ہوں۔ کچھ ایسا ہوا ہے جس کا مجھے پتہ نہیں چل رہا۔“ پھر خود ہی اپنے خیالات کی نفی کرنے لگی۔ کبھی نشہ آور انجیکشن نہیں لگوا لیا تھا۔ کبھی ڈر کر بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ سوچنے لگی۔ ”ہوسکتا ہے کہ نشے کا ٹیکہ لگوانے کے بعد ایسا ہی محسوس ہوتا ہو۔ ڈر کر بے ہوش ہونے والا ہوش میں آنے پر ایسا ہی محسوس کرتا ہو.....“

ناشتہ کرنے اور تیار ہونے تک وہ کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ سر جھٹک کر بار بار بہکتی ہوئی ذہنی رد کو قابو میں لانے کی کوشش کرتی رہی تاوقتیکہ بیجان بٹھہر نہیں گیا۔ ٹہلتے ہوئے لان میں آگئی۔ کرسی میں بیٹھ کر فون پر رئیس سے رابطہ کرنے لگی۔ متعدد بار کی کوششوں پر بھی رابطہ نہیں ہوا تو جھنجھلا کر پھولوں سے الجھنے لگی۔ گلاب کا پیلا پھول تو زکرتی پتی کر کے گھاس کے فرش پر بکھیر دیا۔ بے دردی سے پاؤں تلے روندتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ ”بے زبان چیز مردہ ہوتی ہے۔ تم کیسے مُردے ہو کہ ہر گزرنے والے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہو۔ قریب آنے پر دھتکارنے لگتے ہو۔“

پھر رئیس کا نمبر ملانا چاہتی تھی کہ کوئی جینیل میوزک کی تال پر بولنے والے طوطے کی طرح اس کے ہاتھ پر آن بیٹھا۔ اُس نے چونک کر نمبر کو دیکھا۔ اجنبی نمبر دیکھ کر چونک اٹھی۔ اُن کر کے بولی۔ ”جی فرمائیے! کون صاحب لائن پر ہیں؟“

دوسری طرف سے گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔ یوں لگا جیسے کوئی جان بوجھ کر آواز بدلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اجنبی بن کر کان میں سرگوشی کرنے والا کہہ رہا تھا۔ ”شاہانہ فضل! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ غور سے میری بات سنو۔“

وہ بولی۔ ”مگر آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”میں کون ہوں، یہ بتلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ تم مجھے نہیں جانتی ہو۔“ اُس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ”میں کیا کہنا چاہتا ہوں، یہی بتلانے کیلئے میں نے فون کیا ہے۔ کل تمہاری زندگی سے تین چار گھنٹے چرائے جا چکے ہیں۔ اتنی صفائی سے کہ تمہیں خبر تک نہیں ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد تمہیں کوریز کے ذریعے ایک پارسل ملے گا۔ اُس میں سے ایک وڈیو ڈسک برآمد ہوگی۔ تمہارے چرائے ہوئے چند گھنٹے اُس میں محفوظ ہیں۔ وصول کر کے دیکھ سکتی ہو۔“

وہ ٹھٹھک گئی۔ بات اُس کے خانے میں کہیں نہیں بیٹھی تھی۔ حیرت و استعجاب کے عالم میں بولی۔ ”میں کچھ سمجھی نہیں۔ آپ جو کہنا چاہتے ہیں، وہ کھل کر کہیں۔“

وہ ریسپور کو چوم کر بولی۔ ”مجھے نہیں پتہ تھا کہ آپ میرے لئے پریشان ہو رہے ہیں۔ بازار میں ایک بم پھٹا تھا۔ اُس سے ڈر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ سر میں کچھ درد تھا۔ ڈاکٹر نے دوا دی اور میں مزے سے سو گئی۔ اب جاگی ہوں۔“

باپ پریشان ہو گیا۔ کرید کرید کر پوچھنے لگا۔ باپ کے بعد ماں نے بھی تفصیل دریافت کی۔ پھر مطمئن ہو کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ رحمت بی جائے کی پیالی لئے کھڑی تھی۔ اُس سے پیالی پکڑتے ہوئے بولی۔ ”رحمت بی! آج کیا دن ہے؟“

رحمت بی نے کہا۔ ”آج منگل ہے۔“

وہ ہنسنے لگی۔ پیالی ہاتھ میں لرزنے لگی۔ پیالی رکھ کر ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ رحمت بی نے ہنسنے کی وجہ دریافت کی تو وہ بولی۔ ”پاپا نے بھی مان لیا کہ آج اتوار ہے..... میں پاگل ہوں، وہ بھی پاگل ہیں۔ ہائے رحمت بی! خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے؟“

رحمت بی عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کچن میں ناشتہ تیار کرنے کیلئے چلی گئی۔ وہ چائے پینے لگی۔ منہ کا ذائقہ کڑوا تھا۔ پہلے چند گھنٹ بے مزہ لگے۔ پھر چائے مزہ دینے لگی۔ آخری گھنٹ حلق میں اتار کر بیڈ سے اُتری۔ ٹانگیں وزن سہار نہ سکیں۔ قالین پر دھپ کر کے گر گئی۔ بیڈ کے فوم پر ہاتھ رکھ کر اٹھی اور سوچنے لگی۔ ”آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا۔ آج کیوں ہونے لگا ہے؟“

سہارا لے کر کھڑی ہوئی۔ احساس ہوا کہ بدن کا عضو عضو عجیب سی خشکت و ریخت کا شکار ہو چکا ہے۔ خواب اتنے جاندار نہیں ہوتے کہ جاگتے پر بھی اپنے اثرات چھوڑ جائیں۔ اُسے خواب پوری طرح یاد نہیں رہا تھا۔ بس یاد تھا تو اتنا کہ رئیس اُس پر جھکا ہوا اُس کے حسن کی تابناکیوں کو اپنی نگاہوں میں، اپنے وجود میں جذب کر رہا تھا۔ سوچنے لگی کہ وہ رئیس سے کہاں ملی تھی؟ یاد نہ آیا۔ یاد کرنے کی کوشش میں یہ یقین بھی جاتا رہا کہ اُسے توڑنے پھوڑنے والا رئیس ہی تھا یا کوئی اور۔ ہاتھ روم کی طرف جانے لگی تو واضح طور پر لڑکھڑا گئی۔ سر چکرانے لگا۔ سوچنے لگی کہ ڈاکٹر کے لگائے ہوئے انجیکشن کا اثر ابھی تک گیا نہیں۔ خود کو فریش کرنے کیلئے اُس نے ہاتھ لینے کا ارادہ کیا اور ہاتھ روم میں گھس گئی۔

بالوں کو تویلیے میں لپیٹ کر لباس تبدیل کرتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”یہ کیسی کمزوری بدن سے چمٹ گئی ہے؟ جسم میں کہیں ڈکھن نہیں ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے تمام کی تمام ہڈیاں چور

ریڈ کئے جانے کا پیغام درج تھا۔ اُس نے دروازے کی طرف دیکھ کر پلیر بند کر دیا۔ چائے آگئی۔ پینے کے دوران اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ رحمت بی کے جانے کے بعد اُس نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ دروازہ بند ہوا، آنکھ کی کھڑکی کھل گئی۔

سکرین پر چند کوشیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ کیمروہ زوم کرتے ہوئے ایک کوشی پر آن ٹھہرا۔ چند لمحے منظر ساکت رہا۔ پھر زومنگ شروع ہوگئی۔ کوشی کے ایک کمرے کے دروازے کو چند سینکڑ تک دکھایا گیا۔ اُس کا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ یہ بہر حال طے تھا کہ اُس نے فلم میں دکھائی جانے والی کوشی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ دروازے پر کیمروہ کی آنکھ ٹھہری ہوئی تھی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

منظر بدل گیا۔ اب اُس کمرے کا اندرونی منظر دکھایا جا رہا تھا۔ وہ ٹھنک گئی۔ سانس سینے میں اٹکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی مسہری بچھی ہوئی تھی۔ اُس پردہ خود ہی براجمان تھی۔ اُس نے آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ سچ اُس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا تھا۔ وہ اٹھ کر ٹی وی کے قریب آگئی۔ یہ یقین کرنا پڑا کہ سکرین پر چمکتا ہوا چہرہ اُسی کا ہی تھا۔ لباس بھی وہی تھا جو پہن کر شاپنگ کیلئے گھر سے نکلی تھی۔

اُسے حیرانی ہوئی کہ وہ بے ہوش نہیں تھی، لیٹی ہوئی نہیں تھی بلکہ اپنے وزن کو پوری طرح سہار کر بیٹھی تھی۔ پھر کیمروہ کے لینز اور اُس کے وجود کے درمیان سفید لباس والا حائل ہو گیا۔ اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا مگر وضع قطع سے بخوبی پتہ چلتا تھا کہ دروازے میں داخل ہونے والا شخص ہی کیمروہ کے سامنے سے گزرا ہے۔

پھر آواز بھی سنائی دینے لگی۔ بلاشبہ اُسی کی آواز ٹی وی پر سنائی دی تھی۔ یہاں تک حیرانی ہی حیرانی تھی۔ اُس کے آگے پریشانی ہی پریشانی تھی۔ جو منظر وہ دیکھ کر ساری رات کیلئے بے چین ہو جایا کرتی تھی، صبح اٹھنے پر بدن ٹوٹا پھوٹا محسوس ہوتا تھا، وہی منظر اُس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اُس نے بار بار پاز کر کے، ریورس کر کے دیکھا۔ لہجہ، شکل اور آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ نشے کی حالت میں تھی۔ نشہ شراب کا بھی ہو سکتا تھا، کسی دوا کا بھی..... مگر لطف کشید کرنے کے لمحات نے اُسے ندامت اور پریشانی کے اتھاہ سمندر میں ڈبو دیا تھا۔

وہ بولا۔ ”تم اُس فلم کو بالکل تنہائی میں دیکھنا۔ نہ سمجھ میں آنے والی بات سمجھ میں آجائے گی۔ دیکھنے کے بعد اُسے تو ڈر دینا اور کسی سے تذکرہ نہ کرنا ورنہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔“

وہ پریشانی سے فون کو کان سے ہٹا کر سکرین کو گھورنے لگی۔ خیال آنے پر جلدی سے کان سے لگایا مگر بولنے والا خاموش ہو چکا تھا۔ اُس نے جلدی سے کال بیک کا بٹن پش کر کے موبائل فون کان سے لگایا۔ ریکارڈ شدہ نسوانی آواز بتلانے لگی کہ مطلوبہ نمبر بند ہے۔ جھنجھلا کر بار بار ری کال کا بٹن پش کرنے لگی۔ تھک کر کرسی میں گر گئی۔ تب بات سمجھ میں آئی کہ جانے والا بار بار بلانے سے بھی پلٹ کر قریب نہیں آتا۔

گارڈ کو بلا کر ہدایت کی کہ جونہی کوئی پارسل آئے، فوری طور پر اُس کے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ کمرے میں اُس آکر سوچنے لگی۔ کیا ہو چکا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ دونوں باتیں سمجھ میں نہ آنے والی تھیں۔ اپنی ذہنی کیفیات پر غور کرنے لگی۔ دل نے کہا۔ ”طبیعت میں جو سرور بھرا ہوا تھا، وہ بلاوجہ نہیں تھا۔ دنیا میں بغیر اپنے مفاد کے، کوئی بھی کچھ نہیں دیتا۔ تمہارے ساتھ کچھ ہو چکا ہے۔ خواب دینے والے نے تم سے کوئی بہت بڑی حقیقت چھین لی ہے۔“

سرتھام کر بیٹھ گئی۔ دل دھڑکنے لگا۔ گارڈ نے اُسے سفید لفافہ لا کر دیا تو چونک اٹھی۔ خالی الذہنی کی کیفیت میں غرق ہو کر لفافے کو دیکھنے لگی۔ جس نے اتنا تردد کیا تھا، وہ اُسے کوئی گیت مالا یا انڈین فلم دکھانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ پلاسٹک کی پیکنگ میں ایک وی سی ڈی برآمد ہوئی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بندہ اپنی جانب اٹھی ہوئی گن سے اتنا خائف نہیں ہوتا جتنا کسی غیر مسخر شے کو دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ نہ جانے اس چمکتی ہوئی تھالی میں کیسی سیاہی بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنی دوستوں سے بار بار کی ڈی لے کر آئی تھی۔ رات کی تنہائی میں دیکھ کر پسینے سے شرابور ہو چکی تھی۔ نظر کی لگائی تسکین کیلئے وہ تمام رات کیلئے اپنے بدن اور ذہن کو بے چین کر بیٹھتی تھی۔ دیکھنے میں یہ بھی ویسی ہی دکھائی دے رہی تھی مگر..... اس میں بھری ہوئی بے چینی پوری زندگی پر مسلط ہونے والی تھی۔

رحمت بی کو چائے کا حکم دیا۔ سی ڈی پلیر آن کر کے ڈسک چلا دی۔ ٹی وی پر ڈسک کو

منظر پر منظر بدلتے رہے۔ فلم کے ہیرو کی شکل اُس کیلئے یکسر اجنبی تھی۔ اُس نے کبھی اُسے نہیں دیکھا تھا۔ ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ کیمہرہ سمٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ پھر زوم کرنا ہوا کوٹھی سے نکل گیا۔ وہ بہت دیر تک پھٹی پھٹی نگاہوں سے سی ڈی پلیئر بنانے والی کپنی ہاؤس کے سامنے ٹوٹے ہوئے سکریں پر دیکھتی رہی۔ دکھائے جانے والے منظر نے اُس کی رگوں سے خون کی آخری بوند تک نچوڑ ڈالی تھی۔ اب فون کرنے والے کی بات سمجھ میں آئی تھی۔ اُس کی ہمت نہ بڑی کہ وہ سی ڈی پلیئر میں سے ڈسک نکال لے۔ پیشانی پر آئے پسینے کے دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے دراز ہو گئی۔ نظریں رُکے ہوئے سیکھے کے پروں پر جم گئیں۔ یوں لگنے لگا جیسے پنکھا چل پڑا ہو۔ بڑبڑائی۔ ”ہائے اللہ! یہ سب کچھ کیسے ہو گیا ہے؟ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میری عمر بھر کی سنبھال کر رکھی ہوئی پونجی یوں لٹ کر اشتہار بن گئی اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ اب جبکہ مجھے بم پھٹنے اور ہوش میں آنے کے دوران ہونے والے علاج کا پتہ چل چکا ہے تو زمین پھٹی کیوں نہیں؟ قیامت کیوں نہیں آئی؟..... ہائے! میرے باپ کو پتہ چلے گا تو اُس پر کیا بیتے گی؟ وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق ہی نہیں رہے گا۔“

یہ نہیں جانتی تھی کہ منہ دکھانے کے لائق تو وہ پہلے ہی نہیں تھا۔ شیر کی طرح غوغا کر نکھیں گاڑ کر انسانوں کی رائے کو زمین میں گاڑ دیا کرتا تھا۔ سوچنے لگی۔ ”شیر جیسی آنکھ رکھنے والے کی آنکھوں سے یوں دیدہ دلیری سے سرمہ چرانے والا اور فلم بنا کر ثبوت دینے والا کون ہے؟ مجھ پر یہ ظلم کا پہاڑ کیوں توڑا گیا ہے؟“

ہر بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتی۔ اُسے جو سمجھا گیا تھا، اتنا ہی اُسے ازبر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ بیڈ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دھڑکتے دل سے پھر سی ڈی پلیئر کو آن کر دیا۔ اب وہ کوئی کلیوڈ ہونڈر رہی تھی۔ بار بار منظر بدل کر جائزہ لے رہی تھی۔ آشنائی کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ سب کچھ اجنبی تھا۔ سوچنے لگی۔ ”کاش! اس فلم میں میں ہیرو بن نہ ہوتی۔“

ایسی خواہشیں بھاڑ میں جانے کیلئے ہوتی ہیں۔ جو ہو چکا تھا، وہ دعا سے بدلنے والا نہیں تھا۔ ڈسک نکال کر توڑنے لگی تھی کہ سوچ میں پڑ گئی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اُس نے ڈسک کو سنبھال کر رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اُسے اپنی الماری کے خفیہ خانے میں رکھ دیا۔ الماری بند کر کے بیڈ پر گر گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکی تھی۔

رحمت بی نے کھانا لگانے کی اطلاع دی۔ اُس نے کہا۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم لوگ کھاؤ۔ میرے لئے چائے بنا کر لے آؤ۔“

ایسی پریشانی میں کیا کھایا پیا جاسکتا ہے؟..... وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے کوئی قصور نہیں کیا تھا۔ کوئی غلطی نہیں کی تھی مگر اُسے بہت بڑی سزا دی جا چکی تھی۔ جس نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا اور اس کام پر اتنا خرچ کیا تھا، بلاوجہ نہیں کیا تھا۔ سوچنے لگی کہ اُس سے کیا طلب کیا جائے گا؟ کیا اُسے ہر روز ایسے ہی مسہری پر سجانے کیلئے یہ منصوبہ بنایا گیا تھا؟ دل نے کہا۔ ”ایک پر شتاب اور جان کش لڑکی سے اور کیا طلب کیا جاسکتا ہے؟ تمہیں ہر روز اسی صلیب پر لٹنا پڑے گا۔ تم نے اپنے لئے جیتے جاگتے جہنم خرید لیا ہے۔“

وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ دماغ بہت تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ سوچا۔ ”مجھے پایا کو بتا دینا چاہیے۔ اُن کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ اتنی بڑی گستاخی کرنے والے کو پاتال سے بھی نکل لانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ وہ اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

ٹھنک گئی۔ لمبے ہاتھ پاتال تک پہنچنے سے پہلے اُس کی گردن تاپیں گے۔ اُس سے پوچھا جائے گا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی مجرم قرار دی جاتی کیونکہ فلم دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ گن پوائنٹ پر نہ تو لائی گئی تھی اور نہ ہی جبراً سب کچھ کیا گیا تھا۔ پایا اُس سے بہت پیار کرتے تھے۔ یہ بھی جانتی تھی کہ جتنا پیار کیا جاتا ہے، نفرت بھی اتنی زیادہ ہوتی ہے۔ سر جھٹک کر فون اٹھا کر پایا کا نمبر میموری سے نکالنے لگی۔

اُس نے سوچ لیا تھا کہ جو بھی ہو، مجھے پایا کو مطلع کرنا چاہیے۔ ہر روز بے غیرتی اور بے حیائی کی تیج پر سجنے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ پھانسی کے پھندے پر جھول جائے۔ کال کرنا ہی چاہتی تھی کہ اُس کا فون گنگنا اٹھا۔ سکریں پر ڈسک بھیجنے والے کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ کال ریسیو کرتے ہوئے بولی۔ ”میں بول رہی ہوں۔ کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟“ پیکر سے وہی گھٹی گھٹی آواز برآمد ہوئی۔ ”تم نے فلم دیکھ لی ہوگی اور اب ہمیں دل ہی دل میں داد دے رہی ہوگی کہ ہم نے کتنے اچھے منظر کو ہمیشہ کیلئے محفوظ کر لیا ہے۔“

وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ”یہ حرکت تم لوگوں کو بہت مہنگی پڑے گی۔ بہر حال! بتاؤ۔ کیا کہنے کیلئے فون کیا ہے تم نے؟“

وہ بولا۔ ”صرف یہی کہنے کیلئے کہ ہم نہیں چاہتے کہ یہ فلم ری پیکچرائز کی جائے اور نہ ہی

ہم تمہیں بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”تو پھر کیا کرنے کیلئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے؟“

”صرف اور صرف تمہارا غرور توڑنے کیلئے۔“ اُس نے عام سے لہجے میں کہا۔ ”تلم اہل لئے بنائی ہے تاکہ تم کسی سے اس کا تذکرہ نہ کر سکو۔ ڈسک اور اس ڈرامے کو پوری طرح فراموش کر دو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ گڈ بائی!“

وہ جیلو جیلو کرتی رہ گئی۔ کال بیک کرنے کا نتیجہ حسب سابق برآمد ہوا۔ فون بند کر دیا گیا تھا یا سیلولر سم نکال دی گئی تھی۔ وہ سر تھام کر رہ گئی۔ اُس کی دسترس میں سوائے وکھی ہونے کے کچھ بھی نہ رہا تھا۔ پایا کو فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے سوچنے لگی۔ ”ایسا ممکن تو نہیں ہے کہ مجھے اغوا کرنے والوں کا کوئی اور مقصد نہ ہو، مگر مجھے ابھی ملی کے تھیلے سے باہر نکلنے کا انتظار کرنا چاہیے۔“



عالمگیر رات کو فلموں کی ایڈیٹنگ کر دیا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ طویل سفر اور لاہور میں درپیش آنے والی بے تحاشا مصروفیت نے اُسے بری طرح تھکا دیا تھا۔ اُس نے بشیر خان کو تاکید کر دی تھی کہ اُسے ہرگز جگایا نہ جائے۔ گیارہ بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ تیار ہونے میں کچھ وقت لگا۔ کھانا کھا کر سردار کی حویلی میں پہنچ گیا۔ سردار اُسے دیکھ کر اپنے فطری جوش کو دباتے ہوئے بولا۔ ”سنا بھی عالمگیر! لاہور سے خوشخبری لایا ہے۔ لاؤ اپنا بنایا ہوا شاہکار دکھاؤ۔ تمہارے کھلے ہوئے گل کو دیکھیں۔“

اُس نے صوفے میں ٹانگیں پسار کر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”کام مکمل کرا کر لایا ہوں مگر میں اسے دیکھنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔“

سردار کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ ٹپ کر بولا۔ ”تم کون ہوتے ہو مجھے اجازت دینے یا نہ دینے والے۔ ادھر لاؤ۔ میں ابھی دیکھ کر تمہیں واپس کر دیتا ہوں۔“

اُس نے ڈسک والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ تختی سے بولا۔ ”سردار! میں نے کہہ دیا ہے۔ تم خواہ غصہ دکھاؤ یا تھوئیاں لگاؤ۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پہلی بار تمہارے حکم پر ناپسندیدہ کام کیا ہے۔ اب نہیں کروں گا۔“

سردار چند لمحے اُسے شعلہ بارنگا ہوں سے دیکھتا رہا، پھر ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ ”ایک تو تمہارے قاعدے قانون بھی عجیب ہیں۔ جو چیز تم نے بنائی ہے، متعدد بار دیکھی ہے، مجھے دکھاتے ہوئے تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔ چلو یونہی سہی۔ ہمیں آم کھانے سے غرض ہے۔ وہ تم لے ہی آئے ہو۔“

وہ بولا۔ ”کیا خیال ہے سردار؟ چوہدری باسٹا اسے دیکھ کر سپر ڈال دے گا؟“

اٹھائے کمرے میں داخل ہوا اور اُس کے سامنے میز پر پھینک کر بولا۔ ”اتنے پیسے شیر و اُستاد نے بڑی سرکار سے اٹھ لئے ہوں گے۔ پُر تم لوگوں کا پیٹ بھرے گا تو ہمارا کام ہوگا۔“

پورے ایک لاکھ روپے ہیں۔ باقی خود رکھ لینا۔“

اُس نے پیسے اٹھا کر کوٹ کی جیب میں اُڑس لئے۔ ہاتھ ملا کر باہر نکل آیا۔ اُس کے چہرے پر عجیب معنی خیز سی مسکراہٹ تھی۔ سوز و کی کے انجن کو اشارت کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں سردار فضل خان! پنڈ میں ایک کی چادر سر سے سرک جائے تو سب کے سر نیگے ہو جاتے ہیں۔“

ٹھکانے پر پہنچ کر اُس نے ڈسک کو لفافے میں پیک کیا۔ ایک کارندے کو ذرے کر شہر روانہ کر دیا۔ شہر سے ہی لفافہ کو ریسرورس کے ذریعے چوہدری باسط کے گھر پہنچنا تھا۔ چائے پی رہا تھا جب سردار نے فون پر حکم دیا کہ وہ فوری طور پر بڑی سرکار سے فون پر رابطہ کرے۔ اُس نے بڑی سرکار کا نمبر ملایا اور بولا۔ ”جی بڑی سرکار! کیا حکم ہے؟“

انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”حکم میرے آقا! چراغ کا جن حاضر ہے۔“

بڑی سرکار کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”لاہور کے حالات کیسے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”سب کچھ ٹھیک ہے۔ اپوزیشن والے دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پہلے کی طرح ہمارے بڑے کسی کو گھاس نہیں ڈال رہے۔“

سردار مظفر علی خان نے تہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”گھاس ڈالنے سے گھوڑے کا پیٹ بھر جاتا ہے اور اُس کی سرکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بھوکا رکھ کر ہی اُسے سر جھکانے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ اچھا چھوڑو اس فضول تذکرے کو، سناؤ! تمہارے مشن کا کیا بیانا؟“

اُس نے تفصیلی رپورٹ دی۔ بڑی سرکار نے مطمئن ہو کر رابطے میں رہنے کا حکم صادر کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ بشیر خان اُس کے ساتھ چار پائی پر بیٹھا ہوا تھا، بولا۔ ”عالمگیر! یہ کام ٹھیک ٹھاک انداز سے ہو چکا ہے۔ واردات کو کئی دن گزر چکے ہیں۔ ابھی تک لڑکیوں نے اپنے لب نہیں کھولے۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”عزت دار لڑکیوں کو لب کھولنے پر مجبور کر بھی دیا جائے تو بھی وہ اپنی بے حیائی کو ہونٹوں پر نہیں لاتیں، رسی کے پھندے میں جھول جاتی ہیں۔“

بشیر خان نے تائید کی۔

”واہ عالمگیر واہ!“ سردار فضل نے استہزائیہ انداز میں ہاتھ نچا کر کہا۔ ”یہ کوئی معمول بات ہے جو وہ سراکڑائے کھڑا رہے گا۔ اُس کے خاندان کی عزت پر بیٹہ لگ جائے گا۔ اُس نے ہماری پارٹی میں شمولیت اختیار نہیں کی۔“

عالمگیر نے کہا۔ ”یہ دھیان میں رکھنا کہ اگر اُس نے فلم دیکھنے کے باوجود ہمارا مطالبہ نہیں مانا تو میں اسے نشر نہیں کرنے دوں گا۔ بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ جو فضل خان جائے، وہی کاٹنی پڑتی ہے۔ میری بات کو سمجھ رہے ہوتاں؟“

سردار سمجھ سکتا تھا اگر سمجھنے کی کوشش کرتا۔ وہ مکاری سے بولا۔ ”بھئی ہم نے ڈرلاؤں ہے، بلیک میل کر کے اُس کی گردن کا سر یہ نکالنا ہے۔ اُس کی بیٹی کو بدنام کرنے سے ہم کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

چائے پی کر عالمگیر نے اپنا فون سیٹ نکالا۔ سامنے والی جیب سے کاغذ میں لپیٹا ایک سیلولر بسم نکالی۔ اُسے فٹ کر کے چوہدری باسط کا نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ہونے پر ہونٹوں کو کچھ کر عجیب سے لہجے میں بولنے لگا۔ ”چوہدری باسط! میں تمہارا خیر خواہ بول رہا ہوں۔ کئی کورئیر کے ذریعے تمہیں ایک لفافہ ملے گا۔ اُس میں ایک دڈیو ڈسک ہوگی۔ اُسے پورا توجہ سے دیکھ کر توڑ دینا۔“

دوسری طرف سے کچھ کہا جانے لگا۔ سردار پوری توجہ سے عالمگیر کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے لفظوں کے ساتھ ساتھ ہی اُس کے چہرے کے تاثرات معنی خیز انداز میں بدل رہے تھے۔ وہ بولا۔ ”چوہدری! یہ بتانا کوئی ضروری نہیں ہے۔ جو کہہ رہا ہوں، اُسے توجہ سے سنو۔ فلم تین بجے تک ڈسک تنہائی میں بیٹھ کر دیکھ لینا۔ میں چار بجے اسی نمبر پر رابطہ کروں گا۔“

یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔ کھول کر بسم باہر نکال لی اور کاغذ کی چٹ میں لپیٹ کر جیب میں ڈال لی۔ مسکرا کر سردار سے مخاطب ہوا۔ ”لو سردار! سمجھو تمہارا کام تو ہو ہی گیا۔ اس کام پر پچاس ساٹھ ہزار روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ یہ رقم میں نے بشیر خان سے لی تھی۔ اُس نے کل گھر جانا ہے اس لئے مہربانی کر کے مجھے دے دو۔“

سردار جانتا تھا کہ وہ بے ایمانی کر رہا ہے۔ اُسے بے ایمان کہہ کر جھٹلا نہیں آتا تھا۔ لاکھوں کا منافع حاصل کرنے کیلئے لاکھوں ہی انویسٹ کرنا پڑتے ہیں۔ گھر کے اندر گیا۔ غریب و وڈر کو چند نوالے نہ دے سکنے والا چند منٹوں کے بعد بڑے نوٹوں کی ایک لکڑی

نے بھیڑ کو نہیں، شیر کو ختم دیا تھا۔ شیر گھاس نہیں کھاتا۔ تمہیں مجھ پر فخر ہونا چاہیے کہ میں شیر بن کر بھی ہروں اور بھیڑ بکریوں کا بدن نہیں پھاڑتا۔ درندوں کی کھوہ میں گھس کر انہی کے اسلحے سے انہی کا ماس کھاتا ہوں۔ ڈاکو کو لوٹنا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔“

”ارے داد!“ ماں نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر کہا۔ ”بت حرام نہیں ہوتا، بت کی پرستش حرام ہوتی ہے۔ تم سے یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ برے کو قتل کرنے پر کوئی ذرا غم عائد نہیں ہوتی، قتل کرنا جرم ہے۔ تم نے ایک نہیں، دو بے قصور اور معصوم لڑکیوں کی زندگی جاہ کر دی ہے۔ کیا اُن کا جرم یہی تھا کہ وہ بڑے لوگوں کی بیٹیاں تھیں؟ خدا بھی برے کے گناہوں کی سزا اُس کی اولاد کو نہیں دیتا۔ تم کون ہوتے ہو ایسا کرنے والے؟“

وہ بے بسی سے بولا۔ ”ماں! ایسا کرنے پر میرا ضمیر مطمئن نہیں تھا۔ اس غلاظت کو منہ لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا مگر تم فکر نہ کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اُن کی زندگی بچا نہیں ہونے دوں گا۔“

وہ بیٹھ موڑ کر ہنسنے لگی۔ جاتے ہوئے بولی۔ ”تم کہتے ہو کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کہتی ہوں کہ ابھی تو شروعات ہیں۔ تو نہیں جانتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اگر انسان کو مستقبل کی آگہی مل جائے تو وہ بدل جائے۔ اُس کی دنیا ہی بدل جائے۔ ہر بار کی طرح تمہیں صیحت کرتی ہوں کہ بڑھے ہوئے قدموں کو پیچھے کھینچ لو۔ ورنہ قیامت تک پیچھتاتے رہو گے۔“

وہ آنکھیں جمائے، نظر کی آخری حد تک دور جاتے وجود کو دیکھتا رہا۔ ہر بار کی طرح ماں ڈراؤنی باتیں کر کے رخصت ہو گئی تھی۔ سر جھٹک کر سوچنے لگا۔ ”ماں ٹھیک کہتی ہے۔۔۔۔۔۔ مگر میں بھی غلط نہیں کر رہا ہوں۔ وہ اُن پڑھ اور گوشہ نشین عورت تھی، میں جوان جہان مرد ہوں۔ برا بھلا جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ کیا کر رہا ہوں اور مجھے اپنے مقاصد کے حصول کیلئے کیا کرنا چاہیے۔“

دریائے مجسموں کی ایک کشتی اُلٹے رخ پر جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ چار سیاہ بدن جاکٹس چوڑوں پر جان مار رہے تھے۔ اُن کے بدن کے بالائی نصف حصے ننگے تھے جو سورج کی کڑکروں میں چمک کر عجیب دکھائی دے رہے تھے۔ جب کشتی عین اُس مقام پر پہنچی جہاں پر عالمگیر کی نگاہیں دریا کے مرتعش پانی میں ڈوبتے ہوئے سورج پر جمی ہوئی تھیں تو

شیر علی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ چوہدری زیادہ سے زیادہ انتخابات میں حصہ نہ لے پر رضامند ہوگا۔ وہ کبھی بھی بڑی سرکار کی پارٹی جانن نہیں کرے گا۔ دیکھ لیتا!“

بشیر خان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”دیکھ لیں گے بھی! کڑو فر والا بندہ ہے۔ بڑی پرداغ دیکھ کر فوراً سیاست کی گچڑی بدل لے گا۔“

شیر علی نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گچڑی کو چولھے میں پھینک کر تمام ننگے سر پھرنے کا تہیہ کر لے۔“

اچانک جیسے سردی کی ایک لہر عالمگیر کے تن بدن میں پھر گئی۔ اُس کے دل میں خیال آیا تھا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ گچڑی پر لگا داغ دیکھ کر چوہدری اپنا سر ہی پکڑ دے۔۔۔۔۔۔ نہ ہاں نہ بچے بانسری!“ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ ایسی باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں، سمجھنے کی ہوتی ہیں۔ یہاں کوئی سمجھنے والا نہیں تھا۔

اگلے دن چار بجے تک انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ حسبِ عادت دریا کی طرف نکل گیا۔ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر دریا میں ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کرنے لگا۔ چند ہی منٹوں میں دریا کی سطح سے منعکس ہونے والی سرخی مائل کرنوں نے اُس کی آنکھوں کو تھکا دیا۔ وہ رخساروں تک ڈھلک آنے والے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”بہ تک علم دین تھا، سکون میں تھا۔ جب سے عالمگیر بنا ہوں، پیروں کے آبلوں نے کہیں تک کر بیٹھنے نہیں دیا۔ ماں ٹھیک کہتی تھی۔ سیدھے راستے پر چلنے والے ہمیشہ سکھی رہتے ہیں۔ انگلیاں میڑھی کر کے گھی نکالنے والوں کے راستے بھی میڑھے اور پر پیچ ہو جایا کرتے ہیں۔ ماں شاید یاد کئے جانے کے انتظار میں ہی کھڑی تھی۔ فوراً نظروں کے سامنے آگے آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ غمزہ دکھائی دیتی تھی۔ ملامت کرنے کے سے انداز میں بولا۔ ”تمہیں خدا نے بہن نہیں دی۔ تمہارے ہاتھوں کی لمبائی میں اتنا اضافہ کرنے سے پہلے سے تمہاری ماں بھی چھین لی اور تمہیں دنیا کے تمام رشتوں سے آزاد کر دیا۔ شیطان کا بھی دنیا میں کوئی سگ نہیں ہے۔ اگر کوئی ہوتا تو کہیں نہ کہیں اُسے سر جھکانا پڑ جاتا۔ تم بھی انسان سے شیطان بن گئے ہو۔ تمہاری رسی بھی دراز کر دی گئی ہے۔“

سوچنے لگا کہ یہ آج ماں کو کیا ہو گیا ہے؟ اُسے شیطان قرار دیتے ہوئے اُسے یہ خیال بھی نہیں رہا تھا کہ اُسے شیطان کہہ کر خود کو شیطان کی ماں قرار دینے لگی تھی۔ وہ بڑبڑایا۔

والے نے کسی بہت بڑے مقصد کیلئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ توقف کے بعد بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ اس حد تک پست ذہنیت رکھنے والے مجرم پیشہ لوگ ہوتے ہیں۔ تم بھی ایسے ہی ہو۔ یہ نہیں جانتی کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ یہ سوچ سوچ کر تمام رات جاگتی رہتی ہوں۔ تم مجھے اس پریشانی سے نکال کیوں نہیں دیتے؟“

وہ زیر لب مسکرانے لگا۔ سوچنے لگا کہ مچھلی کے حلق میں کانٹا چھ گیا ہے۔ بولا۔ ”میرا تم سے کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ میرے بڑے تم سے کچھ چاہتے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں؟ یہ مجھے علم نہیں ہے۔ جب وہ منہ کھولیں گے، میں تمہیں مطلع کر دوں گا۔“

وہ زچ ہو کر بولی۔ ”تمہارے بڑے جب منہ کھولیں گے، تب کھولیں گے۔ میں ابھی کولے دیتی ہوں۔ وہ حرامزادے ہیں۔ انہیں بتلا دینا کہ میں معمولی باپ کی بیٹی نہیں ہوں۔ ان کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گی اور سڑکوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر ان کے کئے کی سزا دوں گی۔“

وہ بے ہنگم انداز میں ہنسنے لگا۔ کانٹا حلق میں چھب جائے تو مچھلی اُسے اگلنے کیلئے تڑپنے لگتی ہے۔ اپنا پورا زور صرف کرتی ہے۔ وہ بھی پھڑ پھڑا رہی تھی۔ تلملا کر کہہ رہی تھی۔ ”تم اتنی ہتکڑی سے ہنس کر میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ یہ حرکت تمہیں اور تمہارے مالکوں کو بہت ہنگامی پڑے گی۔“

وہ بولا۔ ”مس شاہانہ فضل! میں نے سونا، ہیرا اور دنیا بھر کی تمام چمکتی ہوئی چیزوں کو دیکھا ہے۔ تمہیں دیکھنے کے بعد پتہ چلا کہ آنکھیں صرف جیتے جاگتے چمکتے وجود کو دیکھ کر ہی خیرہ ہوتی ہیں۔ اس نظارے کی کتنی قیمت چکانا پڑتی ہے، مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ تم اپنی پرواہ کرو۔“

اُس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ عالمگیر کے طعنے سنے۔ مجبوراً سن رہی تھی۔ اُس کا کڑ بولی۔ ”کوئی کارآمد بات کرنا چاہتے ہو تو کرو ورنہ میں فون بند کر رہی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”او کے! میں تمہیں بتلانا چاہتا تھا کہ میری چنگیر میں روٹی ڈالنے والے کا قد تمہارے باپ سے کہیں بڑا ہے۔ اس زعم میں مبتلا ہو کر کوئی احمقانہ حرکت نہ کر ڈالنا۔ تمہارا اہل بیاں سے باپ میرے بڑوں کو سر جھکا کر سلام کرتا ہے۔“

وہ کریدنے لگی۔ پوچھنے لگی کہ عالمگیر کے پیچھے کس بڑے کا ہاتھ ہے۔ اُس کے تجسس کو

یکبارگی اُسے یوں لگا جیسے کشتی میں آگ بھڑک اُٹھی ہو۔ وہ بغیر کوئی وقت ضائع کئے بغیر کھڑا ہوا۔ نگاہوں کا زاویہ بدلا تو اپنی احمقانہ سوچ پر بے ساختہ مسکرا دیا۔ کشتی صبح سلاسل آگے بڑھ گئی تھی جبکہ سورج دریا اور آفتاب دونوں میں ڈوب کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ کابلی سے اٹھا اور حویلی میں آگیا۔ ایک قطار میں بنے ہوئے کمروں کے آگے بنے ہوئے سالن پر آمدے میں چلتا ہوا آخری کمرے کے دروازے تک آیا۔ بشیر خان! آواز دی۔ قریب آنے پر اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بشیر خان! میں اس کمرے میں مصروف ہوں۔ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔“

بشیر خان نے سر ہلایا۔ پوچھا۔ ”کیا تمہیں چائے کی ضرورت پڑے گی؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یار! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“

وہ چلا گیا۔ عالمگیر کمرے میں داخل ہوا۔ کھڑکی کھول کر اندھیرے کو بھگایا اور ایک دہانے کے ساتھ لگی چار پائی پر براجمان ہو گیا۔ سوچنے لگا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ چند لمحے خالی فکری کی کیفیت میں بیٹھا فرش کو گھورتا رہا۔ سر جھٹک کر کسی فیصلے پر پہنچا۔ اُسے یاد آ گیا تھا کہ اُس نے ایک خاص فون کرنے کیلئے تنہائی چاہی تھی۔

فون سیٹ کی بسم بدلی۔ نمبر ملا کہ فون کان سے لگا لیا۔ لہروں کے دوش پر سفر کرتی ہوا شانی بی بی کی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”ہیلو! تم مجھ سے بات کرنے کے بعد فون بند کر دیتے ہو۔ یعنی جب سنانا چاہتے ہو، سنالیتے ہو اور جب میں سنانا چاہتی ہوں تو فون بند کر لیتے ہو۔ کیوں؟“

وہ بھینچی بھینچی آواز میں بولا۔ ”تمہارے پاس بتلانے کیلئے کچھ نہیں ہوتا۔ میں نہیں آنے والا حالات سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”تم میرے مخلص ہرگز نہیں ہو۔ پھر بھی تمہاری بات سن لیتی ہوں۔ کہو! اُس نے کہا۔ ”بار بار فلم کا تذکرہ کر کے تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ یہ ضرور ہوں کہ تم اپنے دشمن تک پہنچ سکو۔ تمہیں علم ہوتا چاہیے کہ کون تمہارا مفاد چاہتا ہے۔ تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑنا چاہتا۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ اُس کی جوانی سے چند گھنٹے چرانے والا مطالبہ اُس کے سامنے رکھنے والا ہے۔ اتنا تو اُسے علم تھا ہی کہ اُسے اغوا کر کے لے جائے

اُس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ فون بند کر کے زیر لب معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ ہم بدل کر سردار فضل سے بات کرنے لگا۔ ”سردار! مجھے لاہور میں اپنے ایک پرانے سنگتی نے اطلاع دی ہے کہ شانی بی بی یونیورسٹی میں پڑھنے والے کسی رئیس نامی لڑکے میں انٹرسٹ لے رہی ہے۔“

”تو پھر؟“ سردار نے چونک کر پوچھا۔

”میں نے اپنے دوست کے ذمہ لگایا ہے کہ وہ رئیس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں مکمل تفصیلات حاصل کر کے مجھے رپورٹ دے۔“ عالمگیر نے آواز نرم رکھ کر کہا۔ ”ممکن ہے کہ وہ فراڈ یا ہواور تمہاری جائیداد ہڑپ کرنے کے چکر میں شانی بی بی کے پیچھے پڑا ہو۔“ فون خاموش رہا۔ سردار کی دھکتی رگ پر ہاتھ پڑا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ”تم نے ٹھیک کیا۔ جونہی رپورٹ ملے، مجھ تک پہنچا دینا۔ ایک بات کا دھیان رکھنا کہ شانی بی بی کو پتہ نہ چلے ورنہ وہ ناراض ہو جائے گی۔“

اُس نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک عود کر آئی۔ ایسی چمک جیسے کی آنکھوں میں شکار کے قریب آنے پر ابھرتی ہے۔ بشیر خان چائے دینے کیلئے کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے یوں بیٹھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ بولا۔ ”کہیں دل تو نہیں لگا بیٹھے؟“

وہ نفی میں سر ہلا کر لمبی آہ سینے میں اتارتے ہوئے بولا۔ ”او نہیں یار! اپنی قسمت میں کسی حسینہ کی دراز سیاہ زلف نہیں ہے، گناہ کی نہ ختم ہونے والی اندھیری رات ہے۔“

بشیر خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چائے کی پیالی کو چار پائی کے بڑے سروالے پائے پر رکھ کر اُسے قدموں کمرے سے نکل گیا۔ اُس کے جانے کے بعد عالمگیر پھر کسی اتھاہ سوچ میں غرق ہو گیا۔

طالب علم کو امتحان میں اپنا لکھا ہوا یاد ہوتا ہے۔ نتیجے کا پتہ ہوتا ہے پھر بھی نتیجہ برآمد ہونے کے دنوں میں انتظار اور کشمکش مل کر اُس کے ذہن و بدن میں اضطراب بھر دیتے ہیں۔ اُس نے یہ مضطرب دن بڑی مشکل سے گزارا۔ دو بجے کے قریب اُس کی بے چینی میں شدید اضافہ ہو گیا۔ چوہدری باسط اس وقت فلم دیکھ رہا ہوگا۔ عالمگیر دل ہی دل میں اُس کے متوقع رد عمل کو تخیلاتی پیکر دینے میں مصروف تھا۔ اُس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ چار بجے

ہوا دینے کے بعد بولا۔ ”میرا ملک بہت بڑا آدمی ہے۔ با اختیار سیاسی اکابر اُس ڈیرے پر اجازتیں لینے کیلئے حاضری دیتے رہتے ہیں۔ وہ بے عہدہ ہو کر عہدے پڑا ہے۔ میرا دوسرا بڑا بہت بڑے عہدے پر براجمان ہے۔ اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر ہمارا کرسی تک پہنچ جاتا ہے، جس پر بیٹھنا چاہتا ہے۔“

وہ اکتا کر بولی۔ ”تعریفیں ہی کرتے جاؤ گے یا کسی کا نام بھی لو گے؟“

وہ تہقیر لگا کر ہنسنے لگا۔ بولا۔ ”بڑی بھولی بنتی ہو۔ جو پوچھنا چاہتی ہو، میں وہ نہیں چاہتا۔“

”تو پھر فون کس لئے کیا ہے؟“

”یہ پوچھتے کیلئے کہ کیا تم نے کسی کو اپنے راز میں شریک کیا ہے؟“

”نہیں..... مگر ضرورت پڑنے پر ایسا ہی کروں گی۔“

”میرا مشورہ یہی ہے کہ جب تک کہو تر تمہارے ہاتھ میں رہے گا، تب تک خط بند رہے گا۔“ وہ بولا۔ ”اُڑا بیٹھو گی تو عمر بھر بیچھتاؤں کو گلے لگاتی پھرو گی۔ اور ہاں! تمہارا باپ نے بھی ایک کتاب پال رکھا ہے۔ بھلا سا نام ہے اُس کا۔“

سوچنے کی اداکاری کرنے لگا۔ وہ بے تاب ہو کر بولی۔ ”ہاں! تم کسی کتے کا ذرا کر رہے تھے۔“

وہ بات بناتے ہوئے بولا۔ ”یاد آیا..... عالمگیر..... جانتی ہو اُسے؟“

”ہاں!“ وہ چونک کر نفیس لہجے میں بولی۔ ”وہ تمہاری طرح کا ہی کتا ہے۔ شکاری پر کاٹنے کو دوڑ پڑتا ہے۔ پچکارنے پر ڈم ہلا کر وفاداری کا یقین دلانے لگتا ہے۔“ وہ اپنا غصہ دباتے ہوئے بولا۔ ”اُس اُلو کے پیٹھے کو ہوا بھی نہ لگنے دینا ورنہ نمانا کا ذمہ دار ہو گی۔“

وہ ڈرنے کی بجائے ہنسنے لگ گئی۔ طعنہ دینے کے انداز میں بولی۔ ”کیوں؟ اُسے ڈرتے ہو؟“

وہ پھاڑ کھانے کے سے انداز میں بات اُچکتے ہوئے بولا۔ ”بے وقوف لو کی ایمان تمہیں پہلے بھی کہا ہے کہ تمہارا باپ اور اُس کے چیلے ابھی تک قدم میں ہمارے گٹھن اوچے نہیں ہوئے۔ جو کہا ہے، اُس پر توجہ دو۔“

دل گہرانے لگا تھا۔ اپنی محنت کے ضائع جانے پر افسوس ہو رہا تھا۔ بڑ بڑایا۔ ”قیمت راز کی لٹی ہے۔ راز راز نہیں رہا، قیمت دینے والا بھی شاید نہیں رہے گا۔“

دل میں یہ چھپن بھی تکلیف دے رہی تھی کہ اُس خاندان پر پڑنے والی اس افتاد میں اسی کا ہاتھ تھا۔ وہ اگر کھل نہ کھلاتا تو یہ چراغ گل نہ ہوتا۔ ہاتھ ملتے ہوئے مشترکہ کمرے میں آ کر اپنی چار پائی پر لیٹ گیا۔ سر کے نیچے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اگر چوہدری باسط جانیر نہ ہو سکا تو پھر اُسے کیا کرنا ہوگا؟

کھانا کھا کر ہاتھ دھو رہا تھا کہ سردار نے فون پر رابطہ کیا۔ بتایا۔ ”چوہدری کی حالت نازک ہے۔ ڈاکٹر کوئی امید نہیں دلا رہے ہیں۔ میں چند منٹ پہلے سی سی یو میں پڑے ہوئے چوہدری کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے یہ اندازہ بھی لگایا ہے کہ اُس کے خاندان کے کسی فرد کے ہاتھ فلم نہیں لگی۔“

وہ متعجب لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ہو چکا ہے۔ اس پر مزید سوچنا بے کار ہے۔“ سردار نے کہا۔ ”تم صبح خان والا بستی میں جاؤ گے۔ شام پانچ بجے مجھے وہاں کی ایک تقریب میں مدعو کیا گیا ہے۔ انتظامات چیک کرو گے اور مجھے گرین سگنل دو گے۔ ویسے میں نے انتظامیہ سے کہہ کر وہاں پولیس کی بھاری نفری تعینات کروالی ہے۔“

وہ بولا۔ ”کس سلسلے میں تقریب کا انعقاد کیا جا رہا ہے؟“

”بستی میں گذشتہ تین دنوں سے کھیلوں کے مقابلے جاری ہیں۔“ سردار نے تفصیل سے آگاہ کیا۔ ”آج فائنل میچ ہے اور انعامات کی تقسیم کی تقریب منعقد کی جا رہی ہے۔ گاؤں کے تمام لوگ شامل ہوں گے۔“

اُس نے مطلوبہ تفصیلات حاصل کر کے فون بند کر دیا اور اپنے ساتھیوں کو اُن کا کام سمجھانے لگا۔ اُسے اندازہ تھا کہ آنے والا دن خاصا مصروف گزرے گا۔ خیال آنے پر اُس نے مزید تھکانے سے فون پر رابطہ کیا۔ پتہ چلا کہ وہ چوہدری باسط کے ساتھ ہسپتال گیا تھا۔ ابھی تک وہیں تھا۔ بولا۔ ”یار عالمگیر! چوہدری کی زندگی خطرے میں ہے۔ ہسپتال میں پوری ہستی ملک فرید سمیت چوہدری کی زندگی کیلئے دعائیں مانگ رہی ہے۔“

”ہارٹ ایکٹ کسی پریشانی یا ناگاہ ذہنی جھٹکے پر ہوا کرتا ہے۔“ عالمگیر نے اُسے کریدنے

کے قریب اُسے فون کرے گا اور اُس کی کیفیت کا جائزہ لے گا۔ تین بجے کا وقت ہی ہوا تھا کہ اُس کے موبائل فون کا بزر بول اٹھا۔ سردار فغسل اُس سے رابطہ کر رہا تھا۔ اُس نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔ ”ہیلو! عالمگیر بول رہا ہوں۔“

سردار کی گہرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”غضب ہو گیا ہے عالمگیر! چوہدری باسط کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ ملک فرید اور چوہدری کے بیٹھے اُسے اٹھا کر شہر کے سول ہسپتال میں لے گئے ہیں۔“

عالمگیر کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ نتیجہ برآمد ہو گیا تھا مگر اُس کی توقع کے عین برعکس۔ وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔ ”یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔ اگر وہ مر گیا تو سارا کھیل چو پٹ ہو جائے گا۔ اُسے مرنا نہیں چاہیے۔“

”ہر کوئی دشمن کے مرنے کی دعائیں مانگتا ہے۔ یہ کیسی بے بسی ہے کہ ہم اپنے دشمن کی زندگی کی بھیک سوہنے رب سے مانگنے پر مجبور ہیں۔“ سردار کی آواز سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بہت زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے بڑی سرکار سے ہسپتال کے ایم ایس کو کھلوادیا ہے کہ وہ چوہدری باسط کے علاج اور نگہداشت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑے۔“

”اچھا کیا۔ ایک اچھائی اور بھی کرو۔ ہسپتال جا کر اُس کی عیادت کر آؤ اور صورت حال بھی دیکھ آؤ۔“

سردار نے حامی بھر کر فون بند کر دیا۔ عالمگیر سر ہٹا کر بیٹھ گیا۔ چوہدری باسط کی بیٹی نے کہا تھا کہ اُس کا ابا دل کا مریض ہے۔ بیٹی کے اجڑنے کی خبر سن کر زندہ نہیں رہے گا۔ تب اُس نے یقین نہیں کیا تھا۔ اب یقین ہو گیا تھا مگر سردار کی باسط اُلٹ گئی تھی۔ وہ بھی دل کا مریض تھا۔ اُس کے زندہ رہنے کی دعائیں مانگنے لگا۔ اچانک دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔ سوچنے لگا۔ ”چوہدری فلم دیکھ رہا تھا جب اُسے دل کا دورہ پڑا۔ اُسے پلیسر اور ٹی وی بند کرنے کی مہلت نہیں ملی ہوگی۔ کمرے میں داخل ہونے والوں کو دل پر اترنے والا قیامت کا بھی پتہ چل گیا ہوگا۔“

اُسے چوہدری سے کوئی ہمدردی نہیں تھی اور نہ اپنی گردن کے شکنجے میں آنے کا کوئی ڈر تھا۔ اُس نے کاروائی اتنی صفائی سے کی تھی کہ اپنے پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ پھر بھی

مسند صدارت کا جائزہ لے رہا تھا، عین اُسی وقت سردار فضل چہرے پر درور سے دکھائی دینے والے گہرے دکھ کے عکس سجائے چوہدری باسط کے خاندان کا دکھ بانٹنے میں برسرِ پیکار تھا۔ عالمگیر پانچ بجے اڑھائی تین سو بندوں کے مجمع میں پل پل رنگ بدلنے والے سیاسی گرگت کا برسوں سے دیکھا بھلا بہروپ ملاحظہ کر رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی یہ منظر بار بار دیکھ چکا تھا۔ اُسے ہر بدلتے پل کی پیشگی خبر تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ جونہی صدارتی خطبہ دینے کیلئے سردار فضل خان تالیوں کی گونج میں سٹیج پر نمودار ہوا، اُس کے کارندے کھڑے ہو کر استقبالی نعرے لگانے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ جب تقریر شروع ہوئی تو انہی کارندوں نے مخصوص باتوں پر تالیاں بجا کر داد کے ڈونگرے برسائے۔ تقریر اختتام کو پہنچی تو اسی گاؤں میں رہنے والے سردار کے ٹاؤٹ منظور نے کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہا۔

”سردار صاحب! آپ ووٹ لینے کیلئے ہر مرتبہ یہاں آ جاتے ہیں۔ ہم تمام بستی والے آپ کے انتخابی نشان پر مہر لگا کر انتظار کرنے لگتے ہیں کہ کب آپ آئیں اور ہمارے لئے لاہور سے ہوا کا نرم جھونکا لائیں۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا۔“

سردار فضل نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ ”مجھے تم لوگ یہاں بلاتے ہی کب ہو؟ پہلی مرتبہ تم لوگوں نے مجھے بلایا اور میں بغیر کسی رد و کد کے چلا آیا۔ جب تک تم لوگ مجھے اپنا کوئی مسئلہ بتلاؤ گے ہی نہیں، میں کیا مدد کر سکوں گا۔ کیوں بھی خان والا کے لوگو! بتلاؤ۔ کیا ماں خاموش لینے ہوئے بچے کے منہ میں دودھ ٹپکتی ہے؟“

سردار کے کارندوں نے بیک زبان کہا۔ ”نہیں!“

شور مچ گیا۔ ناظرین ہنسنے لگے۔ ٹاؤٹ پلٹ کر ہنسنے والوں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کراتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔ ”چلو مان لیا سردار صاحب کہ ہم نے آج تک کچھ نہیں مانگا۔ آج مانگ کر دیکھ لیتے ہیں۔ ہماری بستی میں لڑکیوں کیلئے سکول نہیں ہے۔ بچیاں ہر روز چار پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے قریب کے گاؤں میں پڑھنے کیلئے جاتی ہیں۔ ہمیں زمانہ سکول چاہیے۔“

سردار فضل نے کچھ ساعتیں سوچنے کی اداکاری کی۔ اُس کی بہترین اداکاری کو دیکھ کر عالمگیر کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ تیر گئی۔ وہ جانتا تھا کہ پچھلے ہفتے محکمہ والوں نے سردار

کی کوشش کی۔ ”میرا خیال ہے کہ چوہدری کو کسی قسم کی پریشانی لاحق نہیں تھی۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”گھر والے بتلا رہے ہیں کہ دورہ پڑنے سے قبل وہ کافی دیر تک اپنے کمرے دروازہ بند کئے پڑا رہا۔ باہر نکلا تو چہرہ سرخ تھا۔ ہاتھ سینے پر رکھ کر درد سے دوہرا ہوتا گیا۔ اب اللہ کی اللہ ہی جانے۔ ویسے بھی آج کل دل کے دورے کی شکایت عام ہو گئی ہے۔“ وہ دل ہی دل میں اطمینان محسوس کرنے لگا تھا۔ بولا۔ ”میرے لائق اگر کوئی خدمت ہے تو بلا جھجک کہو۔ مجھے ذاتی طور پر چوہدری باسط سے ہمدردی ہے۔ اپنے علاقے میں ایک ہی تو غریب پرور بندہ ہے۔ وہ نہ رہا تو پوری بستی یتیم ہو جائے گی۔“

منیر نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔ بولا۔ ”یہاں تو سوائے ڈاکٹروں کے کسی کی ضرورت نہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ضرور مطلع کروں گا۔“

سیانے کہتے ہیں کہ قسمت کا دارالحق ہوتا ہے۔ انسان پر ایک لمحہ ایسا وارد کر دیتی ہے جس پر اُس کی زندگی کا دار و مدار سُرُکڑ کر نفع سے دائرے میں سمٹ آتا ہے۔ اُس لمحے میں کوئی حادثہ انسان کو جان سے گزار دیتا ہے، اُسی لمحے میں لاعلاج مریض کو شفا یاب دوائی میسر آ سکتی ہے۔ ایسا ہی ایک لمحہ مستقبل کو ٹیکس بدل دیتا ہے۔ کوئی طالب علم اُس لمحے میں اختیاری مضمون کا چناؤ کرتا ہے، کوئی ذہبا بن کر اپنی شریک سفر کا انتخاب کرتا ہے، کیا سیاست دان کے ہونٹوں سے جملہ نکل کر اُسے تخت پر لا بیٹھاتا ہے اور کسی کو ایسا ہی انقلاب پرور لمحہ زمین کی اتھاہ پستیوں میں دفن کر دیتا ہے۔ چوہدری باسط پر وہ لمحہ مسلط کرنے والا عالمگیر تھا۔ اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ غیور باپ کو بیٹی کی بربادی کا منظر دکھا کر اُس نے باپ کی زندگی کو موت کے تھکے پر پلٹ دیا تھا۔

اُس نے دو تین مرتبہ چوہدری باسط کا نمبر ملانے کا ارادہ کیا۔ جرأت نہ پا کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ سوچ کر دل ڈر گیا کہ متوقع موت نے گھر کو قبل از وقت ہی بین زدہ کر رکھا ہوگا۔ ایسے میں رابطہ کرنا خود کو مزید شرمسار کرنے کے مترادف تھا۔

صبح اُٹھتے ہی اُسے ایک جاناکہ خبر کا سامنا کرنا پڑا۔ چوہدری باسط رات کے پچھلے ہی زندگی اور موت کی مسلسل جاری جنگ میں ہار گیا تھا۔ اُس کی میت گھرائی جا چکی تھی جس؛ روایتی انداز میں کہرام کا قیامت انگیز سایہ تھا۔ وہ جس وقت خان والا میں سردار فضل کیلئے

”لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہماری حکومت سکولوں کی منظوری کا کوئی مکمل کر چکی ہے۔ اب اگلے سال جون جولائی میں منظوری مل سکتی ہے۔ اس سے پہلے نہیں۔“

سردار لہجے میں خفگی سموتے ہوئے بولا۔ ”آپ یہ بات مجھے سمجھا سکتے ہیں، میں اپنے حلقہ داروں کو نہیں سمجھا سکتا۔ مجھے سکول چاہیے۔ ایک پرائمری سکول مانگ رہا ہوں، کانچ یونیورسٹی کا مطالبہ نہیں کر رہا ہوں۔“

”دیری ساری سردار صاحب! ایسا ممکن نہیں ہے۔ آپ لاہور آئیں گے تو آپ کو بہترین لوکیشن پر پلاٹ دیا جائے گا۔ سکول والی کسر نکل جائے گی۔“

سردار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ بولا۔ ”اگر مجھے خان والا میں سکول نہیں دیا جاتا تو پھر مجھے پارٹی جان کر نے کا کیا فائدہ ہوا؟ صاحب! مجھے اپنے لئے کروڑوں کا پلاٹ نہیں چاہیے۔ اپنے حلقہ داروں کی بچیوں کیلئے سکول چاہیے۔ اگر اتنا معمولی سا کام بھی نہیں ہوا تو پھر سمجھیں تعلق نہیں نبھا۔“

”سردار صاحب! آپ خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ ہم نے کہا تو ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ ہوتا تو.....“

سردار نے بات کاٹ دی۔ بولا۔ ”اگر دو ہفتے کے دوران یہاں سکول کی تعمیر کا کام شروع نہیں ہوا تو میرا استعفیٰ آپ تک پہنچ جائے گا۔ جو لوگ مجھے منتخب کر کے اسمبلی تک پہنچاتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا حق نہ دلا سکا تو مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔“

نمبردار اور ٹاؤٹ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہاں موجود ہر آدمی ستائش بھری نگاہوں سے سردار کے لال بھجھو کا چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اُن کا لیڈر اُن کیلئے اقتدار کولات مار رہا تھا۔ فون سے آواز ابھری۔ ”ٹھیک ہے سردار صاحب! ہم اپنے ذاتی کوٹے سے دو ہفتوں کے اندر اندر سکول بنوا دیتے ہیں۔ اب تو خوش ہیں ناں؟“

سردار کا چہرہ کھل اٹھا۔ فاتحانہ نظروں سے اطراف میں کھڑے دیہاتیوں کو دیکھنے لگا۔ فون بند کر کے عالمگیر کو پکڑا یا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا جیسے معرکہ مار کر میدان سے نکلا ہو۔ سردار نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ چوم لئے۔ قربان صدقے کی صدا آئیں ابھریں اور بکے بکے ہو گئی۔

عالمگیر جانتا تھا کہ اگلے دن تک اس فون کال کی رپورٹ مرچ مصالحے سمیت گاؤں

فضل کو قبل از وقت آگاہی دے دی تھی کہ ٹھکے کے بڑوں نے خان والا میں زمانہ سکول کھولنے کی اجازت دے دی ہے۔ دو ہفتوں بعد تعمیر کا کام شروع ہونے والا تھا۔ سردار فضل نے کچھ دیر کے توقف کے بعد مائیک کو درست کرتے ہوئے کہا۔

”مردہ بولتا ہے تو کفن پھاڑ دیتا ہے۔ تم لوگ بھی بولے ہو تو وہ مطالبہ کیا جو بڑوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ بہر حال! میں تم لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہر کام پس پشت ڈال کر ایک دو ہفتوں میں سکول کی منظوری لے آؤں گا۔ میں آج سے ہی اس کام کو ہاتھ میں لینے کا ارادہ کرتا ہوں۔“

تالیاں بجنے لگیں۔ سردار شیخ سے اتر آیا۔ نمبردار، ٹاؤٹ اور چند معززین کو اپنی ہمراہی میں لے کر نمبردار کے ڈیرے پر آیا۔ عالمگیر اُس کے ہمراہ تھا۔ ڈیرے پر پہنچ کر اپنے لئے سچائے گئے کھانے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے نمبردار سے مخاطب ہوا۔ ”کیا تم لوگوں کو واقعی زمانہ سکول کی ضرورت ہے؟“

نمبردار کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اُس کی برسوں کی خالی جھولی میں مراد گر نے والی تھی۔ بولا۔ ”سردار صاحب! آپ جیسے بڑوں کے آگے سوال کیا جاتا ہے تاکہ جھولی بھر جائے۔ اگر جھولی خالی رہے تو دست سوال کو نام کرنے کا کیا فائدہ؟“

سردار فضل نے کھانے سے ہاتھ روک کر عالمگیر کو دیکھا۔ ”عالمگیر! وزیر اعلیٰ صاحب کا نمبر ملاؤ۔ سکول حاصل کرنا ہمارا حق ہے اور اپنے حق کیلئے لڑنا مردوں کا کام ہے۔“

عالمگیر نے شہر علی کا نمبر ملایا اور مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ”جناب پی اے صاحب! سردار فضل خان ممبر اسمبلی جناب وزیر اعلیٰ صاحب سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

دوسری طرف کی بات سن کر اُس نے وائڈ سپیکر آن کر دیا اور فون سردار فضل کی طرف بڑھا دیا۔ شہر علی کی گھمبیر آواز فون کے سپیکر سے برآمد ہوئی۔ ”جی سردار صاحب! آج کیسے بھول کر ہمیں یاد کر لیا۔ مزاج کیسے ہیں؟“

سردار نے اپنا لہجہ اپنے ہی کارندے کے مقابل میں مؤدبانہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جی صاحب! ایک نہایت ضروری اور ارجنٹ کام آن پڑا ہے جس کی وجہ سے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ میرے حلقے میں خان والا بستی کے دو مرنانہ سکول مانگ رہے ہیں۔ بچیوں کی تعلیم کا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس کی وجہ سے لوگ بہت پریشان ہیں۔“

کے ہر فرد تک پہنچ جائے گی۔ جب دو ہفتوں کے بعد سکول کی تعمیر کیلئے بلڈنگز والے پہنچیں گے تو ہر کوئی یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ سردار نے کروڑوں کا پلاٹ ٹھکرا کر اُن کیلئے سکول منظور کروایا ہے۔ سردار نے پانچ دس ہزار روپے کے کڑکڑاتے نوٹ محکمہ تعلیم کے عہدیدار کی جیب میں ڈال کر سکول اپنے کھاتے میں ڈال لیا تھا۔ سکول پر اُس کے نام کی افتتاحی تختی نصب کر دی جائے گی جو خاموش رہ کر سکول میں داخل ہونے والے کم فہموں پر ہنسا کرے گی۔ یہی کچھ ہوتا رہا ہے، یہی کچھ ہوتا رہے گا۔

دایبسی پر سردار نے اُسے اپنے ساتھ گاڑی میں بیٹھا لیا۔ رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ”لاہور سے کوئی نئی رپورٹ موصول ہوئی؟“

وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں سردار! مصروف ہونے کی وجہ سے رابطہ نہیں کر سکا۔ اگر کوئی ضروری بات سامنے آتی تو لاہور والے مجھے مطلع کر دیتے۔“

”چوہدری باسط کے جنازے میں ملک فرید سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بدلا بدلا دکھائی دے رہا تھا۔“

”میں سمجھا نہیں!“

”اُس کا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔ مجھے شک ہے کہ اُسے پس پردہ معاملے کی بھٹک پڑی ہے۔“

نہایت آہستگی سے سر کو دائیں بائیں پھیرتے ہوئے عالمگیر نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم نے کہیں بھی غلطی نہیں کی۔“

”ہو سکتا ہے کہ تمہاری بھیجی ہوئی ڈسک کسی کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔ فلم دیکھنے کے بعد چوہدری کو پڑنے والے ذل کے دورے تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“

”اگر ایسا ہو بھی گیا ہو تب بھی ہماری ذات پر شبہ کرنے کا جواز نہیں بنتا۔ یہ حرکت تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔“ عالمگیر نے کہا۔

وہ بلا جواز گھبرار ہے تھے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ چوہدری باسط کے کمرے سے یوں نکلے کے فوراً بعد اُس کی بڑی بیٹی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اُس نے ٹی وی پر چلتی ہوئی فلم کو

ایک نظر دیکھ کر ہی باپ کی بگڑی ہوئی کیفیت کا راز پالیا تھا۔ اُس نے فوری طور پر پلیئر سے ڈسک نکال کر اپنی تحویل میں لے کر ہر کسی کی نظر سے پوشیدہ کر دی تھی۔ باپ کا جنازہ اٹھ

گیا تھا، باپ کی عزت کا جنازہ اٹھنے سے پہلے ہی اُس نے روک لیا تھا۔ وہ غیر معمولی وصلے والی لڑکی تھی۔ لیکچر ہونے کے ناتے حادثے کو ہر پہلو سے جانچ رہی تھی۔ اپنے طور پر کید میں لگی ہوئی تھی کہ اُس کے باپ کو مارنے والا کون ہو سکتا ہے؟ اُسے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ اُس کے باپ کو بلیک میل کرنے کیلئے اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالا گیا تھا۔ سوچ رہی تھی کہ اُس کے باپ کی شخصیت کس پر کس انداز سے اثر انداز ہو رہی تھی۔ رسی کے سرے کو پکڑ کر تہہ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ باپ کی فوجیگی کی رسومات کی ادائیگی میں مصروفیت کے باعث اُس نے اس معاملے کو آنے والے فارغ وقت پر ٹال رکھا تھا۔

سردار اپنی کونھی کی پارکنگ میں گاڑی سے اترنے ہی لگا تھا کہ عالمگیر کے فون کا بزر بول اٹھا۔ اُس نے فون آن کر کے کان سے لگا کر کہا۔ ”کیسے ہو میرے یار! لاہور سے بول رہے ہو یا کسی اور طرف نکلے ہوئے ہو؟“

مسلل دو منٹ خاموش رہ کر دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔ پھر اُو کے کہہ کر، فون بند کر کے سردار کی طرف پلٹا۔ ”سردار! لاہور سے رپورٹ آئی ہے کہ کوئی گینگ شانی بی بی کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا ہے۔ اُس کی مسلسل نگرانی ہو رہی ہے۔ بہ صد کوشش اُن کے مقاصد کا علم نہیں ہو سکا۔“

سردار کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ متفکر انداز میں اُسے دیکھنے لگا۔ بولا۔ ”یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“

وہ سوچنے لگا۔ توقف کے بعد بولا۔ ”یونیورسٹی میں ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ تمہاری بیٹی ہے۔ اسی طرح ہر ایک کو تمہاری دولت کا بھی اندازہ ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اُسے اغوا کر کے تالان حاصل کرنا چاہتا ہو۔ کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔“

سردار کا چہرہ متحیر ہو گیا۔ قدرت نے اُسے سیر بنا کر انسانیت کے ترازو میں رکھا تھا۔ وہ زفون بن کر سوا سیر بننے کے چکر میں پڑا رہتا تھا۔ یہ بھول گیا تھا کہ رعشہ زدہ ہاتھ جگنو نہیں پکڑ سکتے۔ ذن ہونے والے ہر جانور کو قربانی کا اعزاز میسر نہیں آتا۔ جیسے ہر سیر پر سوا سیر ہوتا ہے، ایسے ہی ہر سوا سیر پر ڈیڑھ سیر براجمان ہوتا ہے۔ وہ بولا۔ ”یہ تو بہت بری خبر ہے۔ اُسے لاہور سے بلالیا جائے تو پڑھائی کا حرج ہوگا۔ وہیں رکھا جائے تو اغوا ہونے کا ڈر لگتا ہے گا۔ تم ہی بتلاؤ! ایسے میں کیا کرنا چاہیے؟“

وہ بولا۔ ”آپ اس بارے میں پوری یکسوئی سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ میں لاہور گیا تو یہاں کی فضا ناگوار ہو جائے گی۔“

تو یہاں کی فضا ناگوار ہو جائے گی۔ ہاتھ ملا کر تقبیبی انداز میں سردار نے سر ہلایا اور کوشی کے اندرونی حصے میں گھس گیا۔ وہ معنی خیز انداز میں سیٹی بجاتے ہوئے کوشی سے نکل آیا۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر اس نے شانی بی بی کو فون کیا۔ ”ہیلو شاہانہ! میں تمہارا مخلص بول رہا ہوں۔“

شاہانہ کی اکتائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ہاں بولو! میں سن رہی ہوں۔“ وہ اپنے بدلے ہوئے لہجے کو نسبتاً سخت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں کہا تھا کہ ہمارے بڑوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ تمہارے باپ کی سرگرمیاں ہماری نگاہوں میں ہیں۔ تمہارے باپ کا کتا ذبح ہونے والے جانور کی بوسہ گھتا پھرتا ہے۔ تم نے راز کو راز نہیں رکھا، اب راز کو راز رکھنے کی ذمہ داری ہم پر بھی عائد نہیں رہی۔ سمجھیں تم؟“

وہ گہرا کر بولی۔ ”مگر میں نے تو کسی سے تذکرہ تک نہیں کیا۔ تم کہہ رہے ہو کہ.....“ ”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ وہ بات کاٹ کر خفگی سے بولا۔ ”ہمارے ملک صاحب کو رپورٹ ملی ہے۔ وہ بہت خفا ہیں۔ مس شاہانہ! تم نے اپنی بے وقوفی کے باعث بہت بڑی مصیبت مول لی ہے۔ تمہارا پورا خاندان ملک بھر میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گا۔“

وہ گہرا کر رونے لگی۔ منتیں کرنے لگی۔ منت سماجت سے سر پر منڈلاتی مصیبت پرے نہیں ہٹتی۔ قیامت ملنے کیلئے نہیں آتی۔

اُس نے کچھ کہے بغیر رابطہ منقطع کر کے فون آف کر دیا۔ اُسے یقین تھا کہ اب وہ ڈر کر اپنے پاپا سے رابطہ کرے گی۔ اُس سے بہت کچھ چھپا کر سیکورٹی طلب کرے گی یا گھر آنے کی اجازت مانگے گی۔ شکاری اُس کی شہ رگ تک پہنچنے والا تھا یا وہ خود چچان سے آ کر گرانے والی تھی۔

وہ سگراتا ہوا بشیر خان کے پیچھے چل دیا۔ آج وہ اُس کی پسندیدہ جگہ پر بیٹھ کر دریا کے پانی کے مسلسل بہاؤ کا نظارہ کر رہا تھا۔ دونوں بیٹھ کر آنے والے وقت کا لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔ عالمگیر اُسے حلقے کی سرگرمیوں کی تفصیل بتلانے لگا۔ اکثر معاملوں کا بشیر خان کو علم

عالمگیر نے اپنی دانست میں بہترین مشورہ دیا۔ ”لاہور میں ایک عدد کچی فون کال کر اُس کیلئے سیکورٹی مانگ لیں۔“

جس قلعے کی بنیادیں اپنے ہاتھوں سے کھوکھلی کر دی جائیں اُس پر اعتبار کرنے کو نہیں چاہتا۔ سردار نے اپنی پولیس کی کارگزاریاں دیکھ رکھی تھیں اُس لئے انکار کر دیا۔ عالمگیر نے کہا۔ ”یہاں پر پبل پبل میں حالات بدل رہے ہیں۔ کب کیا ہو جائے، خبر نہیں۔ ورنہ میں خود لاہور چلا جاتا۔ ساتھ میں بشیر خان یا بشیر کو لے جاتا۔“

سردار کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ اس دوران وہ دونوں ہم قدم چلتے ہوئے اندرون کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ ملازم کو چائے لانے کا حکم دے کر آٹے سانے بیٹھ گئے۔ سردار نے کہا۔ ”شان بی بی کو اغوا کر کے کیا مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اغوا برائے تاوان کے عادی مجرم کبھی اتنی لمبی چوڑی نگرانی اور پلاننگ نہیں کرتے۔ بس آنا فانا بندہ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔“

عالمگیر دل ہی دل میں اُسے سراہنے لگا۔ گھبرائے ہوئے سردار کی عقل نے کام کا شروع کر دیا تھا۔ بولا۔ ”یہ بات تو ٹھیک ہے سردار! مگر کیا ہم شانی بی بی کی حفاظت کا بجائے اسی سوچ بچار میں پڑے رہیں گے کہ کون یہ واردات کر سکتا ہے؟..... نہیں! ہمیں عملی طور پر میدان میں اُترنا ہوگا ورنہ کبھی پورا نہ کیا جاسکے والا نقصان اٹھانا پڑے گا۔“

سردار نے عنایت دیا۔ ”کیا اُسے یہاں بلوایا جائے؟“ ”یہاں بلوانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“ عالمگیر نے کہا۔ ”سانپ سے ہمیشہ کیلئے خوف رہنا تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب ہم سانپ کو کچل ڈالیں۔ وہ یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ ویسے بھی شانی بی بی کو کوشی میں قید تو نہیں رہ سکتی۔“

چائے پینے تک اُن کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ سردار ماتھے پر ہاتھ رکھے گہرا سوچ میں غرق رہا۔ عالمگیر عجیب سی نظروں سے اُسے گھورتا رہا۔ سردار اٹھتے ہوئے بولا۔ ”عالمگیر! تم اپنے بیٹی بندوں سے مسلسل رابطہ رکھو اور پبل پبل کی خبر مجھ تک پہنچاؤ۔ یہاں چارج بشیر خان کو سنبھال دو اور خود لاہور جانے کی تیاری پکڑو۔ چونکہ یہ مکمل طور پر ہمارا گھریلو مسئلہ ہے اس لئے میں تمہارے علاوہ کسی کی صلاحیتوں اور خلوص پر اعتماد نہیں کر سکتا۔“

تھا۔ جن کا علم نہیں تھا، یکسوئی سے سمجھنے لگا۔

عالمگیر کی توقع کے عین مطابق سردار نے نوبے کے قریب اُسے فون کیا۔ ”عالمگیر! بی بی کا فون آیا تھا۔ اُسے بھی شاید اپنی نگرانی کا اندازہ ہو گیا ہے۔ بہت گھبرائی ہوئی تھی کہہ رہی تھی کہ مجھے فوراً کوٹھی بلوایا جائے۔“
وہ بولا۔ ”تو کیا سوچا آپ نے؟“

”یہی کہ تم فوری طور پر لاہور چلے جاؤ۔“ سردار نے کہا۔ ”میں نے شانی بی بی سے کہہ دیا ہے کہ میں اُس کی حفاظت کیلئے عالمگیر کو بھیج رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری نگرانی حفاظت کیلئے جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرو گے۔“

اُس نے کہا۔ ”سردار! اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ میری زندگی میں کوئی اُس کو بچہ نہیں سکے گا۔ مرنے کے بعد کچھ ہوا تو اُس پر پیشگی معافی چاہوں گا۔ میں کل دس گیارہ یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

فون بند کر کے اُس نے لاہور جانے کی تیاری کرنا شروع کر دی۔ زیر لب مکرانے ہوئے گنگنانے لگا۔ ”ہر ایک کشتہ تاحق کی خاشی کو سلام ہر ایک دیدہ پرغم کی آب دہاں کی خیر!“

سردار کے اس فیصلے نے اُس کے انگ انگ میں مسرت کی لہر دوڑادی تھی۔ بانی کہتے ہیں کہ کوئی ایک فیصلہ زندگی بھر کی بساط کو پلٹ سکتا ہے۔ زندگی کی فیصلہ کن گھڑیاں گائیو نہیں اچانک وارد ہو کر لمحوں میں گزر جاتی ہیں۔ بہت بعد میں لمحاتی فیصلے کی گھڑیاں کل کر مستقبل کے سوت سے ہر لباس کا دھاگہ بننے لگتی ہیں۔ اُس کا یہاں کافی کام باقی تھا کہ رفیع اللہ جیسے تھائیڈار کے آنے پر وہ عملی طور پر ناکارہ ہونے والا تھا۔ اس دوران وہ لاہور میں رہ کر اپنے ادھورے امور بہ آسانی سرانجام دے سکتا تھا۔ ابھی وہ پر عزم اور خوش تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ سردار کے اس فیصلے کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔



ہم دھاکے میں دو تین افراد جان سے گزر گئے تھے۔ ان گنت لوگوں کو زخم آئے تھے۔ اکثر لوگوں کے زخم مندمل ہو چکے تھے، باقیوں کے ہونے والے تھے۔ شاہانہ کو ہم دھاکے میں کوئی جسمانی ضرب نہیں لگی تھی، روح کا گھاؤ لگا تھا جو ہر آنے والے دن میں اپنی تکلیف بڑھاتا جاتا تھا۔ کوئی مرہم کارگر نہیں تھا بلکہ سرے سے مرہم دستیاب ہی نہیں تھا۔ کئی مرتبہ ڈسک دیکھ کر دیوانہ وار روئی۔ آنسو دل کا غبار ہلکا نہیں کر پائے، ایسے زخم سے تکلیف کوئیں جن سکتے۔ متعدد بار فون کرنے والے نے اُس کی بے چینی کو بڑھانے کیلئے رابطہ کیا تھا۔ وہ نادان نہیں تھی۔ جانتی تھی کہ اُس کی بے مقصد گفتگو کا مطلب کیا تھا؟..... وہ اُسے پریشان کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے مقصد کو پورا کر رہی تھی۔ کلاس سے مسلسل غیر حاضریاں کر رہی تھی۔ ایک کمرے تک محدود رہتے ہوئے اُس نے خود کو کافی بیزار کر لیا تھا۔

مجبوراً اُس نے اپنے پاپا کو فون کر کے جھوٹ بولا کہ اُس کے ارد گرد کچھ مشکوک لوگ دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اپنے بدن سے لپٹی ہوئی بدنامی کی انشیں لے کر گھر جانے میں بہت سے خطرات لاحق تھے۔ اُس کے پیچھے پیچھے اُس کے دشمن بھی وہاں پہنچ کر اُسے منہ دکھانے کے لائق نہ چھوڑتے۔ وہ یہیں رہنا چاہتی تھی۔ اُس کی مرضی کے عین مطابق پاپا نے عالمگیر کو اُس کی حفاظت کیلئے بھیجے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُس نے اپنے پاپا کی زبان سے عالمگیر کی دلیری اور ذہانت کے بہت سے قصے سن رکھے تھے۔ دل میں یہ اندیشہ سرسرا رہا تھا کہ عالمگیر کو اُس کی پریشانی کا سبب معلوم ہونے پر کیا ہوگا؟ وہ اپنے مالک کا وفادار تھا۔ وفاداری کا تقاضا نبھاتے ہوئے بل بل کی خبر کوٹھی تک پہنچائے گا۔ خبر کے ساتھ ساتھ اُس کی رسوائی گھر تک پہنچے گی۔ پھر کیا ہوگا؟..... سوچتے سوچتے اس

خدا۔ جہانی کے عالم میں سمیرا کے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔ ”یہ رئیس کب سے ہمارے گردپ میں شامل ہوا ہے؟“
وہ جواباً آواز آہستہ رکھ کر بولی۔ ”ہم نے گاڑی اور ڈرائیور کی سہولت کیلئے اس امیر زادتہ کی خدمات حاصل کی ہیں۔“

باتیں کرتے ہوئے وہ اُس کے کمرے تک آئے۔ گارڈ، رحمت بی اور ڈرائیور بھاگ بھاگ کر اُن کی تواضع کا بندوبست کرنے لگے۔ صوفوں پر براجمان ہو کر انہوں نے باقاعدہ طور پر اُس کی عیادت کی۔ نپئی ٹکی اداکاری دیکھ کر وہ دل ہی دل میں شرمسار ہو رہی تھی۔ بظاہر سنجیدہ بیٹھی اپنی طبیعت کی خرابی کے بارے میں بتلا رہی تھی۔ رئیس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”قدرت بڑی حسن پرور ہے۔ بخار چڑھا کر لڑکیوں کو مزید خوبصورت کر دیتی ہے۔ ایک ہم ہیں، ادھر بخار چڑھا، ادھر رنگ سیاہ اور جلد بے رونق ہو گئی۔ ہر کوئی کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ میاں! کل تک تیر تھے، آج بیڑ بنے بیٹھے ہو۔ ایسے میں گرل فرینڈ بھی کہتی ہے کہ ڈارلنگ! تم کل تک تیر تھے، آج کوئے دکھائی دے رہے ہو۔“

سبھی ہنسنے لگیں۔ رحمت بی نے ڈانٹنگ ٹنیل پر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ انہیں لے کر ٹنیل پر آ گئی۔ برتن کھٹکنے لگے۔ ایسے میں اُس کے فون کا بزنس آٹھا۔ وہ معذرت کر کے اپنے کمرے میں آئی۔ فون اٹھا کر سکرین کو گھورنے لگی۔ نمبر اجنبی نہیں تھا بلکہ دل کی دھڑکن بڑھادیے والے اجنبی کا تھا۔ وہ بولی۔ ”اب کیا ہے؟ تمہیں بھی رہ رہ کر دھمکیاں یاد آتی ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی بار فون کر کے مجھے اچھی طرح دھمکا لو اور میری جان چھوڑ دو۔ یا مہینے میں کوئی ایک دن مخصوص کر لو۔ میں پورے اہتمام سے تمہاری بکواس سننے کیلئے تیار رہوں۔“

وہ خفا ہونے کی بجائے جاہلانہ انداز میں ہنسنے لگا۔ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”تم نے میرے روکنے کے باوجود عالمگیر کو اپنی حفاظت کیلئے طلب کر لیا ہے۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ تمہیں اس غلاب سے نکال لینے میں کامیاب ہو جائے گا۔“

وہ حیران رہ گئی۔ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اُس کا واسطہ عام لوگوں سے نہیں بلکہ غیر معمولی دسترس رکھنے والے مجرموں کے کسی منظم نیٹ ورک سے پڑ گیا تھا۔ ابھی تک عالمگیر کے لاہور میں آنے کی بات اُس کے اور پاپا کے درمیان تھی۔ انہیں کیسے پتہ چل گیا۔ اپنی

نتیجے پر پہنچی کہ کسی کے ہاتھ میں کھلونا بننے کی بجائے اُسے عالمگیر کو اعتماد میں لے کر پڑا بات بتلا دینے میں ہی فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہو گیا کہ وہ عالمگیر کو اعتماد میں لے سکے گی؟ اعتماد پیار سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پیار ہم پہلے انسان سے کیا جاسکتا ہے عالمگیر اُس کے باپ کا ملازم تھا، اُس کیلئے بھی ملازم کا مرتبہ رکھتا تھا۔

دنیا کے ہر بڑے کی طرح جانتی تھی کہ نوکر کو سر پر چڑھا لیا جائے تو وہ سر کی دھڑا چوہے کی طرح کترنے لگ جاتا ہے۔ سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ بھائی نہ دینے پر اُس نے عالمگیر کی آمد پر آئندہ کالائج عمل تیار کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے خود کو غیر متعلق کر لیا۔
سمیرا سے فون پر رابطہ کر کے باتیں کرنے لگی۔ اُس نے دریافت کیا۔ ”تم کافی دیر سے کیمپس سے غیر حاضر ہو، کیا وجہ ہے؟“

وہ بولی۔ ”طبیعت کچھ ناسازی رہتی ہے۔“
سمیرا نے چٹکی لی۔ ”اس عمر میں طبیعت کی ناسازی بلاوجہ نہیں ہوتی۔ کیا تم دل میں پہچان پیدا کرنے والی وجہ کے بارے میں مجھے نہیں بتلاؤ گی؟“

وہ جھینپ کر بولی۔ ”میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا۔ آج بھی کہتی ہوں کہ جب بھی کال میری زندگی میں داخل ہوا، تمہیں سب سے پہلے مطلع کروں گی۔“
سمیرا نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا گردپ آج تمہارے پاس پہنچنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ سب متفق ہیں کہ ملکہ عالیہ کو پورے پرنٹو کول کے ساتھ یونیورسٹی لایا جانا چاہیے۔“
وہ ہنسی۔ ”کیوں؟ میں نے کونسا تیر مار لیا ہے؟“

”تو لاکھ چھپے رے گوری قہم قہم کے.....“ سمیرا نے مزہ لیتے ہوئے گنگنا کر کہا۔ ”دلہ بیتی ہوئی واردات کا قصہ سننے کیلئے سبھی بے تاب ہیں۔ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ مابدولت بالکل ٹھیک ہیں مگر وہ ماننے پر تیار ہی نہیں۔ میں کیا کر سکتی ہوں؟“
او کے! ملنے پر مزید باتیں ہوں گی۔“

رابطہ منقطع ہونے پر وہ اٹھی اور دوستوں کے استقبال اور اُن کی خاطر مدارات! بندوبست کرنے لگی۔ اچھا تھا، کمپنی میں دل بہل جاتا۔

سہیلیاں مہمان بن کر اُس کی کونھی میں اتریں تو وہ ایک غیر متوقع چہرہ دیکھ کر ہلکا سا ہلکا ہو گئی۔ سمیرا، فرح اور سعدیہ رئیس کی بڑی سی کار میں بیٹھ کر آئی تھیں۔ رئیس اُن کے

حیرانی پر قابو پا کر بولی۔ ”جب تمہیں ہر بات کا پتہ چل جاتا ہے تو یہ کیوں پتہ نہیں چلا؟“ عالمگیر میرے بلانے پر نہیں، پایا کے بھیجنے پر یہاں آ رہا ہے۔“

وہ بولا۔ ”تم جھوٹ بولتی ہو۔ بہ ہر حال! تم منگوا رہی ہو یا تمہارا باپ بھیج رہا ہے۔ ایک ہی ہے۔ جو کام سالوں کے بعد ہونا طے تھا، وہ اُس کے آنے پر چند دنوں میں شروع کر دیا جائے گا۔ تم ترازو تھام کر بیٹھ جانا اور دونوں پلٹوں میں رکھا ہوا وزن دیکھ کرنا۔ سردار صاحب بھاری پڑتے دکھائی دیتے ہیں یا ملک صاحب!“

وہ لہجے میں بے بسی سموتے ہوئے بولی۔ ”پھر؟ میں کیا کر سکتی ہوں تمہارے لیے؟“ وہ مخصوص جاہلانہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”کچھ بھی نہیں۔ کرنے والا کام خود کر لیتے ہیں۔ تم زندگی انجوائے کرو۔ گڈ لک!“

رابطہ منقطع ہو گیا۔ پہلے کی طرح اُس نے گفتگو میں پیش رفت نہیں کی تھی۔ اُسے فہم ہو گیا کہ وہ صرف اُس کی اعصاب شکنی کیلئے رابطہ کرتا ہے۔ ابھی تک اپنے مفادات حصول کیلئے اُس نے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا اور نہ ہی اُسے بتلایا تھا کہ اُس کے ”ملک“ صاحب کی ترجیحات کیا تھیں۔ اپنے طور پر اُس نے یہ رائے قائم کر رکھی تھی۔ ”ملک“ کی سیاسی وڈیرا اُس کے باپ کو نیچا دکھانے کیلئے یہ گھٹیا چال چل رہا ہے۔ وہ سیاسی وڈیرا ہو سکتا ہے؟ اس بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

عادت کے مطابق اُس نے کال بیک کی۔ رابطہ نہیں ہوا۔ فون سیٹ بند کیا جا چکا تھا۔ زیر لب بڑبڑائی۔

”کینے میں اتنی دلیری بھی نہیں کہ فون کرنے کے بعد اپنا نمبر چالور رکھ سکے۔“ سوچنے لگی۔ ہو سکتا ہے کہ فون کرنے والے کو نمبر کے ٹریس کئے جانے کا ڈر ہو۔ مسکرانے لگی۔ ایسا کیسے ممکن تھا۔ نمبر کی لوکیشن اور ملکیت ٹریس کرنے کیلئے فون کا آن لائن ضروری نہیں ہوتا۔ آج کل ویسے بھی بغیر رجسٹریشن کے نمبر کھلے عام بازار میں دستیاب ہیں۔ عام آدمی اپنی رجسٹریشن نہیں کراتا، ایسے لوگ کس طرح اپنا نقش پا چھوڑ سکتے ہیں؟ یہی سوچتی ہوئی ڈائمنگ ٹیبل پر آئی۔ سب نے استفہامیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ معذرت کرتے ہوئے بتلانے لگی کہ اُس کے گھر سے فون آیا تھا۔ سیرا بولی۔ ”نہیں، تمہیں آگے دو گھر ہوتے ہیں۔ ایک وہ جہاں سے آتی ہے، ایک وہ جہاں پر جاتی ہے۔“

عمر سے فون تو نہیں آیا جہاں تم جانے کا ارادہ رکھتی ہو؟“ سب ہنسنے لگے۔ وہ جھینپ کر بولی۔ ”ابھی یہ طے ہی نہیں ہوا کہ میرا دوسرا گھر کون سا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اُس نے کنکھیوں سے اپنے سامنے رکھی ہوئی پلیٹ سے نبرد آزما ریس کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ سیرا نے اُس کی آنکھوں کی چوری پکڑ لی۔ آنکھوں سے ہی طعنہ زن ہوئی۔ ”پلو سے باندھ کر دوسرے گھر کی راہ دکھانے والا نگاہوں میں اڑا بیٹھا ہے۔ دل میں کان کی بجائے آنکھ کے راستے سے اترنا چاہتا ہے۔“

بات ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اُس پر طعنہ زنی کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ وہ منہ پھیر کر سعدیہ سے جو گفتگو ہو گئی۔ کچھ دیر خوش گپیوں میں مشغول رہنے کے بعد اُس سے اگلے دن کیسے پہنچنے کا وعدہ لے کر چاروں رخصت ہو گئے۔ جاتے ہوئے ریس نے ایک جاندار مسکراہٹ اُس کی طرف اچھال دی تھی۔ اپنی آمد کا دیر اثر ثبوت دے کر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

وہ اُس کے بارے میں سوچتے ہوئے لان میں آن بیٹھی۔ گارڈ اُس کے قریب پہنچ کر مؤبانہ لہجے میں بولا۔ ”سردار سائیں کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کل عالمگیر یہاں مستقل رہنے کیلئے آ رہا ہے۔ میری سمجھ میں اُس کی یوں ہنگامی بنیادوں پر آمد کا سبب نہیں آیا۔ خیر تو ہے ناں بی بی جی!“

وہ بولی۔ ”پاپا کو یہی علم ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ پاپا اپنی مشکلات میرے ساتھ تو کیا، کسی کے ساتھ بھی شیر نہیں کرتے۔“

”بس یہ پوچھنے کیلئے آیا تھا کہ عالمگیر کیلئے کون سا کمرہ تیار کر دوں؟“ وہ نخوت سے بولی۔ ”گراؤنڈ فلور پر کچن کے سامنے والے کمرے میں اُسے ٹھہرا دینا۔ اُس کیلئے کوئی خصوصی اہتمام تو کرنے سے رہے۔“

وہ ”جی بی بی جی“ کہہ کر رخصت ہو گیا تو وہ عالمگیر کے بارے میں سوچنے لگ گئی۔ اُسے والا پہنچنے سے قبل ہی موضوع گفتگو بن گیا تھا۔ اُس کے پاپا نے اُسے اہمیت ہی اتنی دے رکھی تھی کہ خواہ مخواہ اُس سے ملنے کا دل میں تجسس رہتا تھا۔

اگلے دن اپنی آب و تاب کو ہمیز کر کے کلاس میں پہنچی تو یوں لگا جیسے زمانہ بدل چکا ہو۔

سیرانے واقعی ٹاپک بدل دیا۔ اب وہ سعدیہ کیلئے پچھلے دنوں آنے والے رشتے کے بارے میں بول رہی تھی۔ کیفے سے اٹھ کر کلاس روم کی طرف آ رہی تھیں کہ رئیس سے ٹکراؤ ہو گیا۔ تینوں گھاس پر آن بیٹھے۔ سیرانے سعدیہ کو لے کر آنے کا ارادہ ظاہر کیا اور اٹھ گئی۔ رئیس نے مسکرا کر کہا۔ ”بڑی جذبات شناس ہڈی ہے۔ کباب کو تو کتا دیکھ کر آپوں آپ نکل گئی۔“

وہ چونک کر بولی۔ ”میں کچھ سمجھی نہیں؟“

وہ مسکرانے لگا۔ جانتا تھا کہ وہ اتنی نادان نہیں تھی کہ سامنے کی بات کو سمجھ نہ پاتی۔ سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔ ”میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں کھل کر گفتگو کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”کہو!“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اُس کیلئے تمہارا موڈ موزوں نہیں ہے۔“

”پہیلیاں کیوں بکھو رہے ہو؟“ وہ پیشانی پر بل سجا کر بولی۔ ”جو کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہہ دو۔ یہ فلمی ڈائلاگ کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھو۔“

وہ سوچنے لگا۔ فوسیدگی پر رشتوں کی بات نہیں کی جاتی۔ شادی میں شکوؤں کو زور نہیں سمجھا جاتا۔ جاں بہ لب مریض کے سرہانے بیٹھ کر کرکٹ کی کنسٹری کرنے والے کو احق کہا جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہوئے بھی دل کی بات کہنا چاہتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ سننے کے موڈ میں نہیں۔ کہے یا نہ کہے؟ اسی ادھیڑ بن میں ہی تھا کہ بے اختیار منہ سے نکل گیا۔ ”میں تم سے محبت کرتا ہوں..... تمہیں مجھ سے محبت ہے یا نہیں۔ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس یہی کہنا تھا۔“

وہ ہنپٹا کر اُسے دیکھنے لگی۔ یوں بے دھڑک محبت کے اظہار پر غصہ آیا۔ بولی۔ ”اپنی اس محبت کا سیریل نمبر بھی بتلا دو تو مجھے یاد رکھنے میں آسانی رہے گی۔“

اُس کا چہرہ بگھ گیا۔ طنز نے روح میں دور تک گھاؤ لگا دیا تھا۔ کئی ساتتیس خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”میں درخت پر چڑھ کر شیر آیا، شیر آیا کا شور مچاتا رہا اور لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرتا رہا۔ شیر کو موجود نہ پا کر سب لوگوں کی طرح تم بھی مجھ سے بدگمان ہو گئی ہو۔ اب شیر اچکا ہے اور تمہیں میری صدائے حق پر اعتبار نہیں رہا۔ مجھے بتلاؤ کہ ایسی صورت میں مجھے کیا

دل نے کہا۔“ زمانہ وہیں زکا ہوا ہے، تم کپڑے بدل کر آئی ہو۔ نئے لباس میں سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔“

کچھ دیر تک عجیب سی کیفیت طاری رہی۔ دل کا چور چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ کیرا نے پوچھا۔ ”تم کچھ آپ سیٹ دکھائی دیتی ہو۔ خیریت تو ہے ناں؟“

وہ مسکرا کر خاموش رہ گئی۔ سیرا اُس کا ہاتھ پکڑ کر کلاس روم سے باہر آ گئی۔ تراشیدہ گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے بولی۔ ”سچ بتلاؤ شانی! تم کافی بدلی بدلی دکھائی دے رہی ہو۔“

وہ کچھ بتلانا نہیں چاہتی تھی۔ سیرا چہرے پر لکھی کنکاش پڑھ کر غمزدہ سی ہو گئی۔ بولا۔ ”آل رائٹ! میں سمجھ گئی ہوں کہ تم مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتی ہو۔ میں یہ ضرور کہوں گی کہ رئیس میں دلچسپی لینے لگی ہو۔ تمہاری پیش و پس کا سبب بھی جانتی ہوں۔ تمہاری نظر میں بھوزا مزاج شخص ہے۔ یہی بات ہے ناں؟“

وہ چادر کے کونے کو پکڑ کر پہلو تک پہنچ گئی تھی۔ شاہانہ طویل سانس حلق میں انداز بولی۔ ”غلط سمجھی ہو۔ میری پریشانی کا سبب رئیس نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا ہے؟“

وہ عجیب سے انداز میں اُسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ آنکھیں کھد رہی تھیں کہ جب تم سمجھو کہ میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تو کریدتی کیوں ہو؟

سیرا شرمساری ہو گئی۔ اُسے اٹھا کر کیفے کی طرف چل دی۔ ہم قدم چلتے ہوئے کہے لگی۔ ”شانی! محبت کرنا جرم نہیں۔ محبت میں حد سے گزرتا جرم ہوتا ہے۔ گھٹ گھٹ کر بیچ کا دور تمام ہو چکا ہے۔ تعلیم ہمیں شعور دیتی ہے کہ ہم اپنی پسندیدگی کو جنون بنانے کی روکیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے کہ بیماری کے پہلے حملے کو محسوس کرتے ہی ڈاکٹر سے رجوع کر لیا جائے۔ سمجھ رہی ہوں میری بات؟“

وہ رک کر اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ لفظ سینٹ کر بولی۔ ”پلیز سیرا! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں واقعی پریشان ہوں مگر میری پریشانی کی وجہ رئیس ہرگز نہیں ہے۔ مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کیونکہ میں اپنی پریشانی کا سبب نہیں جانتی۔ تم کوئی اور بات کرو۔“

اس نے شکوہ کناں نگاہوں سے اُسے دیکھا اور بولی۔ ”میں اسی لئے تمہیں گھاس نہیں ڈالتی تھی کہ تم پھٹے ہوئے ڈھول ہو۔ بات کا بٹنگڑ بنانے میں کمال رکھتے ہو۔“
 سیرا ہنسنے لگی۔ بولی۔ ”ڈھول بارات کی دھماچوڑی میں بچتا ہے۔ بجے گا تو باراتی اکٹھے ہوں گے، تمہاری ڈولی اٹھے گی اور.....“
 ”بس بس.....“ وہ جھینپ کر بولی۔ ”میری ڈولی سے پہلے تمہارا جنازہ نہ اٹھ جائے۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔“

سیرا کا خیال کئے بغیر رئیس نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ چومتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں حال دل بتلا کر کوئی جرم نہیں کیا۔ کسی نامحرم کو چھونے کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ پوری دنیا کو بتلانے کی جرأت کی ہے کہ تم میری ہونے والی بیوی ہو۔ میں تمہارا ہونے والا شوہر ہوں۔“

وہ بھونچکا رہ گئی۔ ہاتھ چھڑانے کی جرأت معدوم ہو گئی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر دوسرے ہاتھ کو بھی گرفت میں لے لیا۔ ”جن کے من میں کھوٹ ہوتی ہے، وہ چھپ چھپ کر محبت کے اظہار کا اعادہ کرتے ہیں۔ میں ان لغویات میں پڑنے کی بجائے کھلم کھلا اعلان کرتا ہوں کہ تم میرے نام کا لیبل لگ چکا ہے۔ تم میری ہو.....“

یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اُسے بھی گھسٹ کر کھڑا ہونا پڑا۔ رئیس نے اُس کے دونوں ہاتھ چھوڑ دیے۔ پوری وسعت میں بازو کھول کر کھڑا ہو گیا اور اونچی آواز میں بولا۔ ”میں اعلان کرتا ہوں کہ تم میری ہو..... میں تمہارا.....“

سیرا نے جلدی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دبی ذبی آواز میں سرزنش کرنے لگی۔ ”رئیس! ہوش کے ناخن لو۔ تم مرد ہو، جو جی میں آئے بک سکتے ہو۔ ہمارا خیال کرو۔“
 شاہانہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے بدن میں سرگرداں خون آخری قطرے تک نچڑ گیا۔ منہ کھولے کبھی رئیس کو، کبھی سیرا کو دیکھتی رہی۔ رئیس ہنستا ہوا بھاگ گیا۔ سیرا اُسے بیٹھاتے ہوئے بولی۔ ”گھبراؤ مت شانی! کسی نے اُس کی بکواس پر توجہ نہیں دی۔“
 وہ بے جان مورتی کی طرح بیٹھ گئی۔

”کہاناں! ٹیک اٹھ ایزی شاہانہ۔“ سیرا نے دلا سہ دیا۔ ”ایسے بڑبولے من کے سچے ہوتے ہیں۔ کسی سچے مرد کیلئے اتنی سی تکلیف برداشت کر لینی چاہیے۔“

کرنا چاہیے؟“

وہ ایک ٹک اُس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی زبان اور دل کے بیانات کا موازنہ کر رہی ہو۔ وہ بولا۔ ”ایسے کیا دیکھتی ہو؟ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اگر مجھے کسی لڑکی کی ضرورت ہوتی تو تمہارے علاوہ کسی اور کے پیچھے بھاگتا۔ مجھے علم ہے کہ تم اُن تمام لڑکیوں سے مختلف ہو جن سے مختلف اوقات میں میرے تعلقات استوار ہوئے۔ میں دوست کی نہیں، شریک سفر کی تلاش میں بھٹکتا ہوا تم تک پہنچا ہوں۔“

سچائی اور اداکاری..... دونوں ہم پلہ ہو گئیں۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ رئیس جھوٹ بولا ہے، رئیس سچ کہتا ہے، حقیقت کیا ہے؟ چند لمحے دیکھتی رہی پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ”رئیس! تم اچھے خاندان کے فرد ہو۔ اچھائی سچ کا لباس پہنے تو چلتی ہے۔ جھوٹ پہن کر آئے تو اپنے مقام سے گر جاتی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم سچ کہو!“

وہ اُس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”میں سچ کہتا ہوں مگر اپنے سچ کو ثابت کرنے کیلئے کہاں سے دلیل ڈھونڈ کر لاؤں جو تمہیں مطمئن کر دے۔“

وہ مسکرانے لگی۔ پہلی مرتبہ اُس کے سامنے کھلی تھی۔ بولی۔ ”اوکے! میں یقین کے راستے پر چل دیتی ہوں۔ خود کو سچا ثابت کرنے کیلئے تمہیں وقت دیتی ہوں۔ جہاں بھی ڈمگناؤ گے، چھوڑ کر دور ہو جاؤں گی۔“

چاہنے والا خوش ہو گیا۔ جھومتے ہوئے بولا۔ ”آئی لو یو شانی! میں اپنے اس دعوے کو ثابت کر دوں گا۔“

وہ آنکھوں کو آدھا میچ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”کیسے؟“
 اُس کی اس ادا پر شاید وہ بے قابو ہو کر اُسے محبت کا یقین اُسی لمحے فراہم کر دیتا مگر جانتا تھا کہ کوئی بھی نازیبا حرکت تعلقات کی شروعات پر ہی برا اثر ڈال دے گی۔ بہ وقت تمام خود پر قابو پا کر خاموش رہا۔ ایک ٹک دیکھتا رہا اور اپنی آنکھوں سے بول کر نہ نہ کرتے مانتے والی پر فدا ہوتا رہا۔ سیرا واپس آئی تو دونوں کو خاموش بیٹھا دیکھ کر بولی۔ ”بات شروع نہیں ہوئی یا شروع ہو کر تمام بھی ہو گئی؟“

دونوں کی محویت ٹوٹی۔ چونک کر اُسے دیکھا۔ رئیس نے کہا۔ ”تمہاری دوست جیت گئی، میں ہار گیا۔ عشق میں ہارنے والا درحقیقت فاتح ہوتا ہے۔“

وہ طویل سانس حلق میں اتار کر رہ گئی۔ اُس کی غم آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میرا نے پوچھا۔ ”تمہارا چہرہ بتلاتا ہے کہ رئیس کی گستاخی تمہیں بری لگی ہے۔ ایسا ہی ہے؟“ وہ اُسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ بولنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اُن کی آنکھوں نے دل کا حال کھلی کتاب بنا کر میرا کے سامنے رکھ دیا تھا۔

جانے والا جا چکا تھا۔ اپنے پیچھے ایک دل کی دھڑکن تیز کر گیا تھا۔ دل خود پر قابو پانے کی کوشش میں اُسے بے چین کر رہا تھا۔ سمجھا رہا تھا کہ عورت کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جسے وہ عمر بھر اوڑھنا چاہتی ہے۔ تم پر بھی وہ لمحہ آن اُتر اے۔ اپنی تھیلیوں میں پیار کے جگنو کو ہمیشہ کیلئے قید کر لو۔ اس ننھی سے لو سے تمام زندگی حرارت پاتی رہے گی۔ یہی سچ ہے۔

اٹھنے لگی تو پتہ چلا کہ بدن ساتھ دینے پر آمادہ نہیں۔ لہرا کر بدقت اٹھی اور کلاس روم میں جانے کی بجائے پارکنگ میں کھڑی کار کی طرف بڑھ گئی۔ سبق نیا نہیں تھا، کتاب نئی نہیں تھی مگر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سب کچھ پہلی مرتبہ بیت رہا ہو۔ چمکتی کار تک پہنچ نہیں پائی تھی کہ پرس میں مُردے کی طرح لیٹا فون جاگ پڑا۔ زک کر موبائل نکالا۔ سکرین پر پریشان کرنے والا نمبر جل بچھ رہا تھا۔ اُن کر کے کان سے لگا۔ ”ہیلو! کوئی نئی دھمکی یاد آگئی کیا؟“

دوسری طرف سے حسبِ روایت اعصاب شکن قہقہے کی آواز سنائی دی۔ قہقہہ تھا تو ہوا۔ ”تمہارے راستے میں پڑنے والے ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوں۔ سیدھی چلی آؤ۔ تم آج کھل کر بات ہو جائے تو اچھا ہے۔“

اُس کے بولنے سے پہلے اُس نے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتلایا۔ وہ نفرت سے ہونٹ بھیج کر بولی۔ ”میں تم سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اگر چڑھے سورج تلے خواب دیکھنے کے عادی ہو تو بھلے دیکھتے رہو۔ میں نہیں آؤں گی۔ جو کہنا چاہتے ہو، فون پر ہی کہہ دو۔ میں سن رہی ہوں۔“

اُس کے غیر متوقع جواب نے اُسے مشتعل کر دیا۔ پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کجا تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ مجھے انکار کرنے پر تمہارا کیا حشر کیا جاسکتا ہے؟“ وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ”تمہیں بھی یاد نہیں رہا کہ میں کسی ایرے غیرے کی بیٹی نہیں

ہوں بلکہ۔۔۔۔۔“

بات کاٹ کر اُسے تباہ و برباد کرنے کی دھمکیاں دے کر دھمکانے والے نے فون بند کر دیا۔ غصے اور ڈرنے اُس کی حالت خاصی مخمخوش کر ڈالی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی گاڑی تک آئی اور ڈرائیور سے مخاطب ہوئی۔ ”سیدھے راستے کی بجائے متبادل لین لے کر گھر چلو۔“

ڈرائیور نے تعمیل کی۔ وجہ پوچھنے کی گستاخی نہیں کی۔ گاڑی کی رفتار خاصی تیز رکھتے ہوئے وہ بیس پچیس منٹوں میں کوشی پہنچا۔ کار پورچ میں کھڑی کر کے گاڑی کی طرف چلا گیا۔ پرانا آدی تھا۔ شانی بی بی کے خوف کو بھانپ گیا تھا۔ ایسی حالت میں گاڑی کو الارٹ کرنا اُس کی ذمہ داری تھی۔

وہ کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ طبیعت مکدر تھی۔ فون پر دھمکانے والے نے اُسے رئیس کے خیال میں گم رہنے کا لطف پوری طرح حاصل کرنے نہیں دیا تھا۔ اُسے ذہن سے جھٹک کر رئیس کے بارے میں سوچنے لگی۔ انسان بھی بڑی عجیب شے ہے۔ روتے ہوئے ہنسنے کا جواز پیدا کر لیتا ہے۔ قہقہوں میں مضطرب کرنے والے آنسوؤں کو یاد کر بیٹھتا ہے۔ اُسے پوری یکسوئی سے اپنی شخصیت پر لپٹے ہوئے جال کی ڈوروں سے جان چھڑانے کی ترکیب کرنا چاہیے تھے۔ وہ کبوتر کی طرح خطرے سے آنکھیں چرا کر عشق کی تخیلاتی دنیا میں مگن ہونا چاہ رہی تھی۔ ایک طرف پریشانیوں کا ریلہ اُسے بہا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر کر رہا تھا تو دوسری طرف وہ چاہے جانے کی خواہش میں رئیس کے خوابوں کا شہد آنکھوں میں ٹپکا رہی تھی۔

عشق کی بلی تب تھیلے سے باہر آتی ہے جب انسان مکمل طور پر خردمند اور آسودہ ہو۔ جب تھیلے سے نکل آتی ہے تو خرد سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ نادان کو عشق نہیں ہوتا۔ عشق والا دانا نہیں رہتا۔ عجیب کھیل ہے۔ کھیلنے والا جان پر کھیل جاتا ہے۔ نہ کھیلنے والا بے جان زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔

ایسے میں اُس کے باپ کا فون اُس کی توجہ سمیٹنے لگا۔ غصے سے آلے میں سردار فضل کا جادوؤں والا وجود آواز بن کر سمٹ آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”جان پدر! آج کسی وقت عالمگیر تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ تمہیں بالکل گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہاری طرف میلی

جڑ میں ڈھیر ہوا پڑا ہے۔ اُس پردے کے تلے دبا ہوا اُس کا وجود ابھی تک وہیں ڈھیر ہوا محسوس ہونے لگا، آہستگی سے اٹھ کر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ پردہ سر کا باہر دیکھنے لگی۔ رحمت بی جائے دینے کیلئے آئی تو وہ بڑے انہماک سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ جائے کاکپ تھاتے ہوئے بولی۔ ”عالمگیر کیلئے کمرہ تیار ہے؟“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

کھڑکی میں اُسے سامنے والی کونٹھی کا لان دکھائی دے رہا تھا۔ پہلے خالی تھا، اب آباد ہو چلا تھا۔ اُبلے لباسوں میں ایک جوڑا جوانی کی مست اُلت انگھیلیاں کرنے میں مشغول تھا۔ ایک بچہ اُن کے قریب ہی اچھلتا کودتا پھرتا تھا۔ وہ جائے پینے کے دوران جیتا جاگتا منظر دیکھتی رہی۔ اُس نے سینکڑوں ازدواجی جوڑے دیکھے تھے۔ جوڑوں کی خلوت میں جمائے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آج قدرت اُسے ایک لباس میں پھنسے ہوئے دوانسانوں کی خلوت سے آشکار کر رہی تھی۔ دونوں یہ سمجھ رہے تھے کہ انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔ محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بھیڑ میں بھی دل تنہائی ڈھونڈ لیتا ہے۔ وہ بڑی محویت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

اچانک اُس کی نظر دھندلا گئی۔ سر جھٹک کر نظروں کا فوکس درست کیا تو چونک پڑی۔ اُس کے سامنے رئیس اور شاہانہ کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دنیا و مافیہا سے غافل دکھائی دے رہے تھے۔ رئیس، شانی کی زلفوں میں انگلیوں کی کنگھی پھنسا کر تشنہ ہونٹوں کی پیاس بجھاتے ہوئے بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ لان میں کھڑی شانی اور ونڈو میں کھڑی شانی کے محسوسات الگ تہ نہیں تھے۔ لان میں رئیس کا ہاتھ سرخ پیر بن میں ملبوس شانی کے جسم کے جس حصے کو چھوتا، کھڑکی میں کھمبے کی طرح ساکت کھڑی شانی کے جسم کے اُن حصے کو انگارہ بنا دیتا تھا۔ انگارہ جلا کر خاکستر کر دیتا ہے، یہ کیسا دکھتا ہوا انگارہ تھا جو روح میں طمانیت اور ہیجان بھر دیتا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ شانی لان میں کھڑی ہے یا کھڑکی میں کھڑی ہے؟ کس طرح بدن کا پیغام بغیر کسی تار کے اُس تک پہنچ رہا ہے؟

رئیس نے اپنے ایک ہاتھ سے اُس کا ننھا سا ہاتھ تھاما۔ دوسرے ہاتھ سے آستین کا کپڑا فولاد کیا۔ کلائی سے کچھ اوپر والہانہ نظروں سے کسی چیز کو دیکھتا رہا۔ پھر ہونٹوں سے لگا کر جوئے لگا۔ کھڑکی میں کھڑی شانی کا سانس دھونکی کی طرح چلنے لگا۔ بازو میں اُسی جگہ

آنکھ اٹھانے والے کے چہرے سے آنکھیں نوج کرتھیں بھرے شہر میں محفوظ کر دے گا۔ وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولی۔ ”پاپا! آپ نے پہلے بھی مجھ پر ایک گارڈ تعینات کر رکھا ہے۔ ڈرائیور اور دو محافظوں کے جلوس میں جب چلوں گی تو تماشا بن جاؤں گی۔“ باپ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”اے وی آئی پی پروٹوکول کہا جاتا ہے۔ جب تمہارا باپ کہیں جاتا ہے تو اُس کے آگے پیچھے محافظوں کی قطار ہوتی ہے۔ دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا ہے۔“

”کیا یہ سب کچھ کرنے سے ہونی کو ٹالا جاسکتا ہے؟“

”آنکھ پر سیاہ چشمہ لگا کر دھوپ کی شدت سے بچا جاسکتا ہے۔ اونی کوٹ پہن کر برقی سے بدن کو بچایا جاسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح اپنے ارد گرد کھمبیوں کی طرح گئیں گاؤں موت بن کر آنے والے کو موت کے گھاٹ اتار کر زندہ رہا جاسکتا ہے۔“ سردار فضل نے اُسے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ ”تم فکر کیوں کرتی ہو؟ تمہارا باپ ابھی زندہ ہے۔ ہم پر اٹھے ہوئے ہاتھ کو کاٹ دینے کی قدرت رکھتا ہے۔“

وہ ہنکارا بھر کر رہ گئی۔ کہنا چاہتی تھی کہ سیاہ چشمہ لگانے کے باوجود آنکھ سے آن دیہاڑے سرمہ چرایا جا چکا ہے۔ اونی کوٹ پہن لینے کے باوجود سینے کی حدت کو باہر کی سردی نے چاٹ لیا ہے۔ خاموش رہی تو سردار نے دلا سہ دیا۔ ”شانی بیٹا! عالمگیر بن ہو شیار آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُس کی ایک جھٹک دیکھ کر تمہیں نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھنے والے وہ علاقہ ہی چھوڑ دیں گے۔ ایک خیال رکھنا۔ وہ میرا سر چڑھا ملازم ہے۔ اُن کی کوئی عادت ناگوار گزرے تو درگزر سے کام لینا۔“

”جی پاپا! میں اُسے ناراض نہیں کروں گی۔“

”اُسے پوری تفصیل سے آگاہ کر دینا۔ تعاقب کرنے والوں کی نشاندہی کر دینا۔ اگ کام وہ خود کر لے گا۔“

پاپا نے فون کو چوم کر رابطہ منقطع کر دیا۔ اُس نے رحمت بی کو چائے لانے کا حکم دیا۔ کھینچ کر سینے تک اوڑھ لیا۔ پہلے سارا دن ٹی وی پر پروگرام دیکھا کرتی تھی۔ اپنی فلم دیکھ کر سکرین سے ہی متنفر ہو گئی تھی۔ اُسے کوئی سین بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ کھڑکی کی طرف دیکھا۔ پردہ کب کا درست کر کے لٹکایا جا چکا تھا مگر اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی تک دیوار کی

پورے بس سے تل کو سہلانے لگی، بہلانے لگی، سلانے لگی۔ جتنا ہسکتی، اتنا ہی بے چین ہو کر گرے دکھانے لگتا۔ سوچنے لگی۔ ”بدن کی سفید چمکتی چادر پر لگے ہوئے اس کالے دھبے کو اتار پھینکتے کیلئے کتنے جتن کئے مگر اس نے جان نہیں چھوڑی۔ ماں کہتی ہے کہ نویں نکور عمارت کو نظر بد سے بچانے کیلئے منڈیر پر پرانی کالی ہنڈیا رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ آج کیا ہوا ہے؟ بد نظروں سے بچانے والا کالا دھبہ ہی پورے بدن کی عمارت میں سو ہنا لگ رہا ہے۔ کہیں اسے نظر نہ لگ جائے۔“

دیکھنے والا کمرے کے دروازے پر پہنچ کر دستک دینے لگا۔ اُس نے چونک کر دروازے کی سمت نگاہ اٹھائی۔ اُدھ کھلے دروازے میں عالمگیر کھڑا دربارِ حسن میں حاضری دینے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ وہ جلدی سے کف برابر کر کے ننھے سے سیاہ تل کو چھپانے لگی۔



چوہدری باسط کا اصول شناس بدن منوں مٹی میں اتر چکا تھا۔ اُس کی دستار اُس کی زندگی میں ہی مٹی میں مل گئی تھی۔ ایسے میں مقدر کا شکوہ کیا جاتا ہے۔ جب اُس نے مرنا ہی تھا تو اُسے زندگی کا اتنا المناک نظارہ دکھانے کی کیا ضرورت تھی؟ مقدر شکوے سنتا رہتا ہے۔ جواب نہیں دیتا۔ جواب دینے والا ہلکا پڑ جاتا ہے۔ آشکار ہو جاتا ہے۔ وہ کسی پر آشکار ہونے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ دنیا والے آواز کی لے کو پکڑ کر صدا کا رتبہ پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

موت کی پرچائیاں چند دن تک گھر کے درود یوار پر چھائی رہتی ہیں، پھر غیر محسوس انداز میں حالات معمول پر آ جاتے ہیں۔ زندگی اپنی ڈگر پر رواں ہو جاتی ہے مگر چوہدری باسط کے ڈیرے پر درختوں کے پتوں نے زمین بھر دی تھی۔ ان کرب آلود پتوں کو چننے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ زنان خانے میں دونوں بہنیں چند مزارعوں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ چھوٹی باتیں کر رہی تھی۔ بڑی ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ’میری ماں نے میرا نام بتول رکھا تھا۔ میں بتول نہیں رہی بلکہ ببول بن کر باپ کا سینہ چھلنی کر چکی ہوں۔ میری بد قسمتی تو یہ ہے کہ میرے باپ کے قتل کو طبعی موت قرار دیا جا رہا ہے۔ مجھے ہتھیار بنا کر میرے باپ کو قتل کرنے والے کو میں بھی نہیں جانتی۔ کوئی کیا جان پائے گا؟ ہائے اللہ! اس قیامت کی گھڑی میں میں کیا کروں؟‘

پرسر سراہٹ ہونے لگی۔ پھریوں لگا جیسے آگ لگ گئی ہو۔ اُس نے جلدی سے کف ہٹا کر کلائی کو دیکھا۔ وہاں ایک ننھا سا تل دکھائی دے رہا تھا۔ تل نے اس طرح سے آگ لگائی تھی کہ پورا جسم اُن کی آن میں دھکنے لگا تھا۔ ارد گرد نظر دوڑائی۔ کہیں پانی دکھائی نہیں دیا۔ آگ پر پانی ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔ اُس نے بازو اٹھا کر تل کو اپنی زبان سے لگایا۔ پھر سکون ملا۔ پھر زبان بھی سلگنے لگی۔ وہ دیوانوں کی طرح اپنے ہی تل کو چوسنے لگی۔ بہت دیر بچپن میں وہ زندہ رہنے کیلئے ماں کی چھاتی کو اسی طرح چوسا کرتی تھی۔ آج بڑی ہو کر نظر رہنے کیلئے اپنے ہی تل کو چوس رہی تھی۔ بجائے ٹھنڈا ہونے کے تل بخار پکڑتا جا رہا تھا۔ کئی چھاتی سے دودھ پس کر اُس کے شکم کو بھر دیتا تھا۔ آج طمانیت کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ کچھ ایسی چیز تھی جو تل سے نکل کر شکم کی بجائے دل اور پیچھے پھروں میں اترتی جا رہی تھی۔ اس شراب میں ایسا نشہ تھا کہ بوتل بھی تاپنے پر مجبور ہو گئی۔

ایسے میں اُن کا بچہ بھاگتا ہوا اُن تک پہنچا۔ ان سے لپٹ کر اپنے ہونے کا احساں دلانے لگا۔ وہ دونوں جھینپ کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے اور بچے کی ناز واریاں کرنے لگے۔ ان کی دنیا میں تیسرا آ گیا تھا۔ شانی کی دنیا میں بھی کوئی آ چکا تھا۔ گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز نے اُسے چونکا کر پورچ کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

عالمگیر ٹیکسی سے اترتا ہوا دکھائی دیا۔ ڈرائیور نے ایک اٹیچی تھام رکھا تھا جبکہ گاڑی ہاتھ میں ایک بڑا سا چرمی بیگ تھا۔ عالمگیر کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھرتیوں آئے پیچھے چلتے ہوئے برآمدے میں گھس کر اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ عالمگیر کے کپڑے جانے پر اُس نے خود کو نسبتاً زیادہ محفوظ پایا۔ کھڑکی سے ہٹ کر بیڈ پر آ گئی۔ ایک رسالہ اُڑا کر ورق گردانی کرنے لگی۔ کسی تحریر پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ نظر نے زندہ انسانوں کی کہانی جاگتے وجود کے ساتھ دیکھی تھی۔ مردہ لفظوں پر اعتبار کرنے کو جی نہیں مان رہا تھا۔ رحمت کمرے میں داخل ہوئی اور اُسے متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ ”شانی بی بی! عالمگیر آئے ہیں۔“

ہے۔ میں نے اُسے اُس کے کمرے میں پہنچا دیا ہے۔“

وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

رحمت بی جاتے ہوئے اپنے پیچھے دروازہ بند کر گئی۔ وہ رسالہ بند کر کے باتیں کر رہی تھی۔ چمکتے ہوئے تل کو دیکھنے لگی۔ جاندار جسم پر بے جان تل آج کتنا شوخ ہو گیا تھا۔ اُن کی آنکھیں

یاد اپنی عراور قد سے کہیں بڑی ہوگئی تھی۔ اُس نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اُسے زنی اور نزاکت کے خول سے نکل کر اپنی ارادوں کی ویواریں چننا ہوں گی ورنہ وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے بے سہارا خاندان کو بھی لے ڈوبے گی۔

رابطہ ہونے پر اُس نے دریافت کیا۔ ”کیا امجد صاحب لائن پر ہیں؟“
دوسری طرف سے باوقار مردانہ آواز سنائی دی۔ ”جی فرمائیے! میں امجد فرید بات کر رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟“

دہلڑی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں آپ کو جانتی ہوں۔ آپ بھی غائبانہ طور پر مجھے جانتے ہیں۔ میں چوہدری باسط کی بیٹی بتول بات کر رہی ہوں۔“

”اوہ بتول صاحبہ! کیسی ہیں آپ؟“ ملک امجد فرید نے اُسے پہچان کر کہا۔ ”مجھے چوہدری صاحب کے انتقال پر بڑا افسوس ہوا تھا۔ اپنے باپ اور بھائیوں کے ہمراہ کئی دن خیریت آپ کے گھر آتا رہا مگر آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ خیریت تو ہے؟“

ملک امجد فرید نے متفکرانہ لہجے میں استفسار کیا۔ ”آپ نے کچھ کہنے کیلئے فون کیا تھا۔ خاموش کیوں ہو گئیں؟“

وہ اپنی ہمت یکجا کر کے بولی۔ ”سر! وہ بات یہ ہے.....“

بات اوجھری رہ گئی۔ سنگٹل ڈیڈ ہونے کی وجہ سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ فون جھولی میں رکھ کر ہاتھ ہوتا تنفس قابو میں لینے لگی۔ چند ساعتیں گزر گئیں۔ سکرین پر ویکھا۔ سنگٹل نہیں آ رہے تھے۔ سوچنے لگی۔ ”نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا۔ کوئی لڑکی کسی اجنبی کو اس طرح فون نہیں کرتی۔“

دل نے کہنی چھوئی۔ ”وہ اجنبی ہے؟..... اگر ایسا ہے تو پھر تم اُسے مشکل پڑنے پر کیوں پکارنے لگی ہو؟ اجنبیوں سے ہمیشہ جان چھڑائی جاتی ہے۔ جن کو کوئی راہ دکھلائی جائے، وہ اپنی ہی نہیں رہتے۔“

کئی منٹ گزر گئے۔ نوکرانی نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ اُٹھ کر ڈائننگ روم میں آگئی۔ زینہ نے پوچھا۔ ”باجی! رابطہ ہوا ملک امجد فرید سے؟“

”ہاں!“

”ہاں! مگر بات ہونے سے پہلے ہی سنگٹل چلے گئے۔“

آتش زاد —
باپ کے مرنے کے بعد وہ اس گھر کی مالک تھی۔ ماں اُن پڑھ اور گھر کی عورت ہونے کی وجہ سے چارویواری کے باہر کے معاملات کو سمجھ نہیں سکتی تھی، سلجھا کیسے پاتی۔ اُس نے زمینوں اور لین دین کا حساب کتاب اپنے ہاتھ لیتے ہوئے خدا سے شکوہ کیا تھا۔ ”میں بھائیوں سے بھری پڑی ہے۔ ہمارے نوکروں کے گھروں میں بنگے دوڑتے پھرتے ہیں۔ میرے لئے ایک بھائی بھی آسمان سے نہ اتارا جاسکا۔ کیوں؟ کیا ہم انہیں نہیں اس قابل ہی نہیں تھیں؟“

سوچنے لگی۔ ”اگر ہمارا بھی کوٹھے جتنا بھائی ہوتا، شیر جیسی طاقت اُس کے بازو پر بھری ہوتی تو ہم یوں سرعام ون ویہاڑے اٹھائی نہ جاتیں اور باپ گرد میں لٹی پڑ اٹھانے کے چکر میں زمین میں نہ گر جاتا۔ ہائے اللہ! بے غیرتی اور بے بسی کے کس مقام پر مجھے کھڑا کر دیا گیا ہے کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو الزام تک نہیں دے سکتی۔ اگر تو میرا مدد نہیں کرنا چاہتا تو مجھ پر میرے باپ کے قاتل کا چہرہ ہی بے نقاب کروے!“

اُسے سوچوں میں گم و یکھ کر چھوٹی بولی۔ ”باجی! کیا سوچ رہی ہو؟“

”زنی! میں وہی کچھ سوچتی ہوں جو تم سوچتی رہتی ہو۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ ”کیا تمہارے پاس ملک امجد کا نمبر ہے؟“

زینہ نے کچھ سوچ کر بولی۔ ”ایک مرتبہ میں نے اپنی ہوم اکٹناکس کی کاپی پر لکھا تھا۔“

”ٹھہرو! دیکھتی ہوں۔“

وہ اُٹھ کر کمرے میں گئی۔ ماہی نے حیرانی سے پوچھا۔ ”ملک امجد فرید کا نمبر کیوں پوچھ رہی ہو؟ کوئی کام ہے اُس سے؟“

وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ”ہاں اماں!“

اماں پوچھنا چاہتی تھی مگر صحن میں بیٹھی عورتوں کی موجودگی کی وجہ سے خاموش ہو کر کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر زینہ نے اُسے پکارا۔ ”باجی! نمبر مل گیا ہے۔“

وہ اُٹھی اور زینہ کے کمرے میں گئی۔ اُس سے کاپی لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ سوچنے لگی۔ ”مجھے ملک امجد سے بات کرنی چاہیے یا نہیں؟ وہ کیا خیال کرے گا میرے بارے میں؟“

کچھ دیر صوفے پر بیٹھی سوچ میں گم رہی۔ فیصلے پر پہنچ کر رابطہ کرنے لگی۔ چند دنوں

کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ سستانا چاہتی تھی۔ کچھ نہ کر سکی۔
تھکن محسوس کرنے لگی۔ ایسے میں اُس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فون کا بزر جیج اُٹھا۔
اُس نے سکریں پر جلتے بجھتے ہند سے دیکھے۔ اُس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔
”سر! سنگل ختم ہونے کی وجہ سے بات ادھوری رہ گئی۔ معذرت چاہتی ہوں کہ آپ
فون کرنا پڑا۔“

وہ بولا۔ ”میں نے آپ کو فون اس لئے کیا ہے کہ میں اس وقت ڈیوٹی پر موجود ہوں۔
آپ شام کو آٹھ یا نو بجے فون کیجئے گا۔ بلکہ میں ہی آپ سے رابطہ کر لوں گا۔ ناراض نہیں
ہونا پلیز!“

اُس نے اوکے کہہ کر فون بند کر دیا۔ بولنے والا خاموش ہو چکا تھا مگر اُس کی ساعت
جیسے اُس کے الفاظ ڈھارس بن کر ثبت ہو گئے تھے۔ سوچنے لگی۔ ”بڑے باپ کا بیٹا ہے
کتی نرمی اور اخلاق سے بات کرتا ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ سول جج بول رہا ہے۔“

وہ خود بھی کسی گرے پڑے کی بیٹی نہیں تھی مگر ملک فرید کے خاندان کے مقابلے میں اُس
کا خاندان کم حیثیت رکھتا تھا۔ موبائل فون کو رخساروں پر بے دھیانی میں رگڑتے ہوئے
ملک امجد فرید کے بارے میں سوچنے لگی۔ برسوں قبل بچپن میں دیکھا تھا۔ جونہی باپ نے
پردے میں بیٹھا دیا، وہ اوجھل ہو گیا۔ اب کیسا ہوگا؟ جس طرح اُس کے جسم نے جوانی کا
بھٹی میں کوو کر تبدیلیاں پکڑ لی تھیں، اس طرح وہ بھی بدل چکا ہوگا۔ میٹرک کے بعد پڑے
کیلئے شہر والی کوٹھی میں منتقل ہو گیا تھا۔ بعد میں اُس کے لاہور جانے کی خبر بھی سنی تھی۔
مرنے سے چند دن قبل چوہدری باسط نے گھر والوں کو بتلایا تھا کہ سول جج بن کر فیصل آباد
میں تعینات کر دیا گیا ہے۔

ایک گھنٹہ سوچوں میں گزر گیا۔ زرینہ نہا کر اُس کے کمرے میں آگئی۔ ”جیے بالوں سے
قطروں کی صورت گرتے ہوئے پانی کو تو لیے میں سمیٹے ہوئے اُس کے قریب بیٹھ چکا
ٹکا کر قالین پر بیٹھ گئی۔ بولی۔ ”بابی! ملک امجد سے کیا بات کی ہے تم نے؟“
دونوں بہنیں عمروں کی تفاوت کے باوصف ایک دوسرے کی راز دار تھیں۔ بتول بولی۔
”میں اُس سے مدد لینا چاہتی تھی۔ اُس نے شام کو فون کرنے کا کہا ہے۔ دیکھیں! رابطہ کرنے
ہے یا نہیں۔“

”کیسی مدد؟“

”اباجی کو مارنے والوں کا محاسبہ کرنا چاہتی ہوں۔“

”تو کیا تم اُسے ساری بات بتلاؤ گی؟“

”ظاہر ہے۔“ وہ پر فکر لہجے میں بولی۔ ”پوری کہانی سنانے سے ہی اُسے کچھ پتہ
چلے گا۔“

”اس طرح تو ہمارا خاندان رسوا ہو جائے گا۔ نہیں بابی! تم اُس سے کوئی بات نہیں کرو
گی۔“ زرینہ رونے لگ گئی۔

وہ دلا سے دیتے ہوئے خود بھی رونے لگ گئی۔ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”میں پہلے بھی ایک
بہت بڑی غلطی کر چکی ہوں۔ غلطی کو دہرا نا نہیں چاہتی۔ اگر میں اباجی کو اُسی دن صاف
صاف ماجرا کہہ سنا تی تو وہ کبھی بھی مجھے قصور وار نہ سمجھتے اور گہرے دکھ سے انہیں ہارٹ اٹیک
نہ ہوتا۔ میرے بولنے سے میری پوزیشن صاف ہو سکتی ہے۔ میرے خاموش رہنے سے مجھ
پر ہائی ہوئی فلم میری بے حیائی کا ثبوت بن جائے گی۔“

جھوٹی نادان نہیں تھی۔ اُس کی بات کو بہ خوبی سمجھ رہی تھی مگر اُسے بدنامی اور رسوائی سے
ڈر لگتا تھا۔ سسکتے ہوئے بولی۔ ”ایک کو بتلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ پورے پنڈ کو خبر دی گئی
ہے۔ لوگ ہم پر تھو تھو کرنے لگیں گے۔“

”جن لوگوں نے ہم پر قیامت ڈھائی ہے، وہ کیا خاموش بیٹھ جائیں گے؟“ بتول نے
اندیشہ ہائے رسوائی کا اظہار کیا۔ ”وہ اپنے کئے کی قیمت وصول کرنے کیلئے میدان میں اُتر
چکے ہیں۔“

”اور ہم بہت بھاری قیمت دے چکے ہیں۔“ زرینہ کا اشارہ اپنے باپ کی موت کی
طرف تھا۔

”انگو کرنے اور یہ ڈراما رچانے سے قتل کرنا زیادہ سہل تھا۔ وہ اباجی کو مارنا نہیں،
ہمارے خاندان کو اپنے قدموں تلے جھکانا چاہتے تھے۔ اباجی کی غیر متوقع اور ناگہانی
نوبت گیری کے باعث اُن کے مقاصد ادھورے رہ گئے ہوں گے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بابی!“ زرینہ نے کہا۔ ”مگر ملک امجد ہماری کیا مدد کر سکتا ہے؟“
”وہ بہت بڑے عہدے پر فائز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اُن لوگوں سے میری بے حیائی

”کیا آپ ایک آدھ دن کی چھٹی لے کر یہاں آ سکتے ہیں؟“
 ”کیوں نہیں؟“ وہ زیادہ الجھ گیا۔ ”مگر بات کیا ہے؟“
 ”بات ایسی ہے کہ میں کہنے کی ہمت نہیں پارہی۔“

”نوں پر آواز سنائی دیتی ہے، چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ آپ ایسے میں بتلانے کی ہمت نہیں رکھتیں، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیسے کہہ پائیں گی؟“
 ”وہ جی..... آپ پلیز!“ بات نہ بن سکی تو گھبرا کر ہٹکانے لگی۔

”اوکے! میں آپ کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اجنبیت آڑے آرہی ہے۔ میں چھٹی لے کر آپ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انتظار کیجئے۔ نور پور پہنچ کر اطلاع کر دوں گا۔“

”اوہ تھینکس! میں کبھی بھی آپ کا احسان نہیں بھلاؤں گی۔“ اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ نون بند ہونے پر سوچنے لگی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جوفون پر نہیں کہا جاسکتا، وہ روبرو کہنا کتنا مشکل ہوگا۔ ارادہ مضبوط کرنے لگی۔ اُسے اپنے خاندان کی رہی سہی عزت کو بچانے کیلئے شعلوں کے بیچ سے کپڑے بچا کر گزرتا تھا۔ ذرا سی غلطی یا کوتاہی پر بدن سے لپٹا ہوا ریشم شعلے پڑ کر اُسے جھلسا سکتا تھا۔

اُسے ایک ترکیب بھجائی دی۔ ایک اجنبی کے سامنے کھل کر مدعا بیان کرنا مشکل ثابت ہوگا۔ بہت سی ایسی باتیں بھی ہوں گی جنہیں وہ غیر ارادی طور پر چھپا جائے گی۔ اس کا حل یہ تھا کہ وہ اپنے مدعا کو تفصیل کے ساتھ احاطہ تحریر میں لے آئے۔ خاموش رہ کر خود پر ہمتی ہوئی داستان تجزیات سمیت سناسکتی تھی۔

ترکیب اچھی تھی۔ جسم میں نئی توانائی محسوس کر کے اٹھی۔ بک شیلف تک گئی۔ ایک نوٹ بک اور پینل اٹھا کر سٹڈی ٹیبل پر آ گئی۔ ذہن میں جو کچھ تھا، نوٹ بک میں سمونے لگی۔
 جرم جتنی ذہانت اور چالاکی سے کیا جائے، کہیں نہ کہیں سقم چھوڑ جاتا ہے۔ پہنچنے والا ہاتھ پکڑ کر پہلو میں، پھر گردن تک آن پہنچتا ہے۔ جب وہ سوچ سوچ کر لکھ رہی تھی تو بہت کئی تزیات یاد آ رہی تھیں۔ پہلی کامیابی اُس نے حاصل کر لی تھی۔ اُسے ویگن کا نمبر دیکھنے کا موقع تب ملا تھا، جب ویگن دونوں بہنوں کو اسٹاپ پر اتار کر فرارے بھرتی ہوئی چلی گئی تھی۔ اُس کی عینی نمبر پلیٹ پر درج ہند سے اُسے یاد آ گئے۔ وہ آنکھیں بند کر کے چشم تصور

کے ثبوت حاصل کر کے ہماری اُن کمینوں سے ہمیشہ کیلئے جان چھڑانے میں کامیاب ہو جائے۔“
 ”اور اگر نہ ہو سکا تو؟“

زرینہ کے اس اندیشے کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اُسے خاموش پا کر زریزہ بولی۔ ”تو ہم اُس کی نظروں میں بھی برہنہ ہو جائیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اپنی زبان بندی کی قیمت مانگنے لگ جائے۔ ایسی صورت میں کیا ہوگا؟“

وہ جلدی سے بولی۔ ”نہیں زری! وہ ایسا نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا انسان ہے۔ میں کم از کم اُس کے بارے میں ایسا نہیں سوچ سکتی۔“

زرینہ اُس سے متفق نہ ہوئی۔ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ جاتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھا گئی۔ ”باجی! تم بڑی ہو، میں چھوٹی ہوں۔ بڑے کی عقل بھی بڑی ہوتی ہے۔ جو بھی کرنا، سوچ سمجھ کر کرنا۔ ہم کانٹوں پر ننگے پیروں چلنے والی بے ہارا لڑکیاں ہیں۔ باپ کے ہوتے ہوئے ہمیں سڑک پر سے اٹھا لیا گیا تھا۔ باپ کے بعد با ہم پر انگلیاں اٹھانے والوں کو روکا جاسکتا ہے؟“

اُس کے اوجھل ہونے پر وہ از سر نو اپنے تیار کردہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگی۔ بہت غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اُسے امجد فرید کو ہمارا زبنا کر اُس کے اختیارات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ رہی کھلنے کی بات، تو وہ پہلے ہی کھل چکی تھی۔ اُس کا باپ برہنہ بنی کو دیکھ کر ہمیشہ کیلئے آنکھیں موند چکا تھا۔ سب کچھ دیکھنے کے بعد اُس نے بیٹی کا سامنا کرنے کے عذاب کو نہ جھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور کچھ پوچھ کر کے اُسے صفائی کا موقع نہیں دیا تھا۔ اُس سے بڑی قیمت وہ نہیں چکا سکتی تھی۔

فون شام کو آتا تھا۔ وہ ابھی سے انتظار کرنے لگ گئی۔ لحاف اوڑھ کر فون کرنا ہی چاہتی تھی کہ وہ اُس کی خلوت میں آن پہنچا۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ ”بتول صاحبہ! آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“

وہ آزدگی سے بولی۔ ”سر! میں خود پریشان ہوں۔ ابھی کم پریشان کیا ہے، آنے والے وقت میں زیادہ پریشان کروں گی۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“
 ”جی! میں سن رہا ہوں۔“

نہیں آیا تھا۔ اُس نے اُس نمبر پر دائرہ لگا کر مخصوص کر دیا۔
مندرجات ایک باضابطہ کہانی کی شکل اختیار کرتے گئے۔ بارہ ایک بجے تک پورے
انتہاک سے لکھتی رہی۔ قطع و برید کے باعث بار بار تسلسل مجروح ہو جاتا تھا۔ جب تسلی ہو گئی
تو اپنے لکھے ہوئے کو صاف ستھری تحریر کی شکل دینے لگی تاکہ پڑھنے والے کیلئے کوئی دشواری
نہ رہے۔ پچھلا پھر طاری ہونے پر وہ اپنا کام ختم کر چکی تھی۔

دو دن گزر گئے۔ اُس کا انتظار ختم ہو گیا۔ امجد فرید بستی نور پور میں پہنچ چکا تھا۔ اپنی آمد کی
اطلاع اُس نے بتول کو فون پر دے دی تھی۔ عشاء کے وقت اُس سے ملنے کیلئے آنے والا
تھا۔ دل دھڑک اٹھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی زندگی میں پہلی مرتبہ اُس سے ملنے کیلئے
آنے والا تھا۔ اُس کے ساتھ کوئی جذباتی لگاؤ نہ ہونے کے باوصف جذبات اتھل پھٹل
ہورہے تھے۔ زرینہ نے ٹھوکہ دیا۔ ”باجی! تمہاری بے چینی کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ
تمہیں پسند کرنے کیلئے آرہا ہے۔“

وہ مکرانی۔ ”اطلاع دے کر آنے والے مہمان کیلئے بے چینی کا پایا جانا عین فطری ہوتا
ہے۔ میں کوئی خلاف فطرت کام تو نہیں کر رہی ہوں۔“
وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ بتول نے مصنوعی خشکی سے ٹوکا۔ ”اے! کیا ہے؟ ایسے منہ
بھاڑ کر کیوں ہنس رہی ہو؟“

وہ ہنسنے ہنسنے بولی۔ ”ایک فون کال پر کوئی کچے دھاگے سے یوں بندھا چلا آئے تو غیر
معمولی بے چینی کا پایا جانا بھی فطری رد عمل کہلاتا ہے۔“

وہ باز نہیں آ رہی تھی۔ اُس سے جان چھڑا کر تنہائی ڈھونڈنے لگی۔ دل کی چھان شیخ
کی۔ کہیں بھی مہمان کیلئے محبت کا جذبہ دکھائی نہیں دیا۔ سوچنے لگی۔ ”زری مجھ سے بھی بڑی
اتنی ہے۔ جو کچھ میں ملک امجد فرید کو بتلانے جا رہی ہوں، اُس پر مجھے اور زری کو کم از کم یہ
توق نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ مجھ پر قریفہ ہو جائے گا۔ وہ میرے وجود سے نفرت نہ کرے،
بلکہ غنیمت ہوگا۔“

دل میں بے چارگی بھر گئی۔ وہ بری نہیں تھی مگر بری بنادی گئی تھی۔ جیسی طور پر وہ کچی کلی
تھی، بدن گلاب کی طرح کھل کر اپنے اسرار کو بیٹھا تھا۔ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا
مگر دنیا والے قصور دیکھ کر نہیں، موقع دیکھ کر سزا دیا کرتے ہیں۔ وہ ملک امجد فرید سے تو کیا،

میں سڑک پر جاتی ہوئی دیکھ کر دیکھنے لگی۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ اُس نے ہندوسوں کو پھانسی
طرح از بر کر لیا تھا۔ ساتھ ہی اُس نے کاپی پر نمبر درج کر لیا۔

ایک بات کی طرف دھیان چلا گیا۔ اُس نے سوچا کہ اُس کے باپ تک فلم پہنچانے
والے نے فون پر رابطہ ضرور کیا ہوگا۔ اٹھ کر باپ کے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ کھولنے پر
ماں بیڈ کے کنارے پر گم صم بیٹھی دکھائی دی۔ وہ بیڈ کی دراز کھول کر فون نکالنے لگی تو ماں
چونک پڑی۔ اُسے اپنے مرحوم شوہر کا فون تھا مے دیکھ کر تعجب سے بولی۔ ”اس کا کیا کرنا
ہے؟ تمہارے پاس اپنا فون ہے تو سہی۔“

وہ بولی۔ ”کچھ نمبر باجی کے فون کی میموری میں محفوظ ہیں۔ انہیں کاپی پر لکھنا ہے تاکہ
ضرورت پڑنے پر بآسانی دستیاب ہو سکیں۔“

ماں نے تقہیبی انداز میں سر ہلایا۔ دھکی لہجے میں بولی۔ ”جسے ضرورت پڑتی تھی، وہ بہت
دور چلا گیا ہے۔ اُس نے جاتے ہوئے یہ بھی نہیں سوچا کہ ہم تین بے سہارا عورتیں کہاں
جائیں گی۔ میری تو خیر، کم از کم تم دونوں کا تو کچھ نہ کچھ کر جاتا۔ ہائے اللہ! میں بنگے سر کہاں
جاؤں، کہاں سے ان تنگ سری لڑکیوں کیلئے چادریں ڈھونڈ کر لاؤں۔“

وہ اپنی ماں کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔ منہ چومتے ہوئے بولی۔ ”اماں! دیکھ نہ ہا
کر۔ ہمارے مقدر میں جو لکھا ہے، وہ مل کر رہے گا۔ جو تمہیں ملنا تھا، مل گیا ہے۔ اللہ آگے
کی خیر کھائے۔“

ماں کے بوڑھے کانپتے ہونٹوں سے۔ ”آمین“ نکلا اور وہ بیٹی کو سینے سے لگا کر یاد
کرنے لگی۔ ایسے میں بیٹے کی کمی کا احساس فزوں تر ہونے لگا۔ پھٹیلی کی پشت سے آنکھیں
پونچھ کر بڑبڑائی۔ ”میری کوکھ نے بیٹا نہیں دیا، خدا مجھے دوسروں کی کوکھ سے بیٹے نکال کر
دے دے تو میرے دل در دور ہو جائیں گے۔ اے خدا! ان بے چاریوں کے نصیب بھلے
کردے۔ بیٹوں کی جگہ پر داماد کھڑے دیکھ کر ہی جی کو خوش کر لیا کروں گی۔“

وہ سنی ان سنی کرتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد ماں کے دل کو کچھ قرار آ گیا تو وہ اٹھ کر اپنے
کمرے میں آ گئی۔ فون میں ریسیو ہونے والی کالیں چیک کرنے لگی۔ اغوا ہونے سے لے
کر باپ کے دم توڑنے تک جتنی کالز ریسیو ہوئی تھیں، انہیں ایک کاغذ پر لکھ لیا۔ ایک کال
کے علاوہ تمام فون نمبر میموری میں ناموں کے ساتھ محفوظ تھے۔ ایک نمبر ایسا تھا جو پہلے کسی

پھر خود کو کونے لگا۔ غلط انداز سے سوچنے پر ضمیر نے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔
گھنٹہ بھر کی ملاقات کے نتیجے میں وہ، امجد فرید کی پروقار اور جاذبِ نظر شخصیت سے
خاصی مرعوب ہونے کے باوجود، کافی حد تک سنبھل کر پر اعتماد ہو چکی تھی۔ زرینہ اور بتول کی
معت میں وہ بتول کے بیڈروم میں آ کر براہِ جہان ہو گیا۔ بتول نے آنکھ کے اشارے سے
زرینہ کو باہر بھیج دیا۔ تنہائی پاتے ہی بولی۔ ”سر! میں نہیں جانتی کہ میں جو کہنے جا رہی ہوں،
مناسب بھی ہے یا نہیں۔“

وہ تسلی دینے کے انداز میں گویا ہوا۔ ”بتول صاحبہ! آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔
نتیجے کی پرواہ کئے بغیر کھل کر کہیں گی تو میں زیادہ اچھے طریقے سے آپ کی مدد کر سکوں گا۔ رہی
بات مناسب یا غیر مناسب کی، تو وہ حد آپ پار کر چکی ہیں۔ مجھے اپنے پاس بلا چکی ہیں۔“
وہ چند لمحے اُسے دیکھتی رہی۔ دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کرتی رہی پھر بولی۔ ”میرے ابا
جی کو قتل کیا گیا ہے۔ قتل کرنے والا کون ہے؟ میں نہیں جانتی۔ اس ضمن میں مجھے آپ کی مدد
کی ضرورت ہے۔ اگر میرے کام آئیں گے اور میرے دکھ کو اپنا دکھ جان کر دل میں دفن
کر دیں گے تو میں تمام عمر آپ کی ممنون رہوں گی۔ اگر مجھے تماشا بنا کر بیچ چوراہے لٹکا
دیں گے تب بھی میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بچانے والی چیزیں میں پہلے ہی لٹا
چکی ہوں۔“

وہ استعجاب اور اضطراب آنکھوں میں لئے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اب تک اُس نے نہ سمجھ
میں آنے والی باتیں کی تھیں۔ وہ بولا۔ ”مجھ پر اعتماد کیا ہے تو اپنے اعتماد کو برقرار بھی رکھیں۔
اور ہاں! میرا خیال ہے کہ ہمیں دوستی کا ماحول قائم کرنے کیلئے آپ جناب، سر اور صاحبہ
جیسے گفتگو سے چھٹکارا پالینا چاہیے۔“ پھر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔
”میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم بے جا تکلف کو چھوڑ دو۔ میں ملک امجد فرید ہوں، تم بتول
ہو، بس۔۔۔۔۔“

وہ آنکھیں پڑا کر اٹھی اور بک شیلف میں پڑی نوٹ بک اٹھا لائی۔ تحریر کا پہلا صفحہ
کھول کر کاپی اُس کی گود میں رکھ دی۔ کہنے کے باوجود اتنا جلد بے تکلف نہیں ہو سکتی تھی۔
لہجہ مؤدب رکھتے ہوئے بولی۔ ”بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں زبان پر لانا کسی بھی لڑکی
کیلئے ناممکن ہوتا ہے۔ ایسی ہی باتیں میں نے یہاں لکھ دی ہیں۔ آپ جب تک پڑھیں

کسی سے بھی محبت نہیں کرتی تھی۔ اُس نے تو آج تک ڈھنگ سے اپنے خیالات کو کسی
آئیڈیل پر منطبق ہی نہیں کیا تھا۔ یہی سوچ رکھا تھا کہ ماں باپ کان سے پکڑ کر جس کی
مسہری پر بیٹھا دیں گے، وہ اُسی کے پاؤں دھونے میں بخت جائے گی۔ والدین نے کسی کو
بیٹھا یا نہیں تھا مگر اُس کی ذات میں نقب لگائی جا چکی تھی۔ بھاگ دوڑ کر ملک امجد فرید کے
استقبال کیلئے انتظامات مکمل کرنے کے بعد اپنے آپ کو تیار کرنے لگی۔ آئینے کے سامنے
کھڑی ہوئی تو اپنی شکل دیکھ کر گھٹن آنے لگی۔ چہرے کی اجلی رنگت پر لگے سیاہ دھبے صرف
اُسے ہی دکھائی دیتے تھے۔ سوچنے لگی۔ ”کلک دنیا کی نظروں میں کلک گیا تو کیا ہوگا؟“

ہاتھ خاصی ست روی سے چل رہے تھے۔ ہلکا پھلکا میک اپ کر کے لباس تبدیل کرنے
لگی۔ ایسے میں باہر ہارن بجنے کی آواز سنائی دی۔ گزشتہ دو تین دنوں سے انتظار کرانے والا
اُس کی دلہیز پر ملک بن کر پہنچ آیا تھا۔ وہ جلدی سے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ چند ساعتوں
کے بعد ملک امجد فرید ملازم کی معیت میں کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے منظر پا کر سلام کرنا
چاہتا تھا۔ سراپا دیکھ کر تکلفات بھول گیا۔ چند ثانیے تک اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ وہ
جھینپ کر بولی۔ ”سر! السلام علیکم! میں بتول ہوں۔ ادھر تشریف لائیں۔“

اُس نے صوفے کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا تھا۔ وہ بیٹھ کر سانس برابر کرتے ہوئے
بولا۔ ”وعلیکم السلام! پہلی مرتبہ ملے ہیں۔ شاید اس لئے میں کچھ نزوسا ہو گیا تھا۔“

ملازم چلا گیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ ”بارہا مرتبہ اس کمرے میں آچکا ہوں۔ پہلی مرتبہ
آپ کو دیکھا ہے۔ بچپن کی بتول اور میرے سامنے بیٹھی بتول میں زمین آسمان کا فرق
ہے۔ آسمان کو دیکھا جائے تو زبان ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا
ہے۔ اماں جی کیسی ہیں؟“

وہ ہٹلانے لگی۔ ملازم نے ڈائنگ ٹیبل لگنے کی اطلاع دی۔ وہ بولا۔ ”آپ تو شاید
تکلفات میں پڑ گئی ہیں۔ میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔“

وہ بہ صدا صراہ اُسے ساتھ لے کر اندرونِ خانہ آ گئی۔ اُس نے تھوڑا کھایا، تعریفِ زیادہ
کی۔ اماں جی اور زرینہ سے ملاقات ہوئی۔ دل میں سوچنے لگا۔ ”چوہدری باسط کی زندگی
میں ممکن نہیں تھا کہ وہ ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ پار کرتا۔ اُس کے مرنے پر یہ دروازہ
کھلا ہے۔“

میں نے بارہا دیکھا ہے کہ ان مرحلوں سے جبراً گزاری جانے والی لڑکیاں خودکشی کر لیتی ہیں۔ تمہارے حوصلے سے متاثر ہوا ہوں۔“

ملک امجد فرید کا لہجہ ڈھارس بندھانے والا تھا۔ بدستور نظریں جھکائے ہوئے بولی۔ ”سرا! میں نے بھی بارہا ایسا کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔ اس لئے خودسوزی نہیں کی کہ جن انگلیوں کے اٹھنے کے خوف سے میں موت کو گلے لگاتی، وہ انگلیاں میرے مرنے کے بعد میرے خاندان پر اٹھنے لگتیں۔ خودکشی سے سچی اور جھوٹی بہت سی داستانیں پھیل جاتی ہیں۔“

وہ سائنسی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ نہ صرف پڑھی لکھی لڑکی تھی بلکہ سمجھ دار اور حوصلہ مند بھی تھی۔ بولا۔ ”تم نے جزئیات پر خاصی توجہ دی ہے مگر اس کے باوجود کوئی کلیو موجود نہیں ہے۔ لیکن کانبر اور سفید رنگ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ لامحالہ بات ہے کہ واردات کرنے والوں نے نمبر پلیٹ بدل دی ہوگی۔ ملک کی سڑکوں پر نوے فیصد دیکھنوں کا رنگ سفید ہے۔ تم نے بڑی تفصیل سے انوار کاروں کے حلیے لکھے ہیں۔ حلیے ایک سے ہوتے ہیں۔ سیلوفون نمبر سے کچھ مدد نہیں مل سکتی۔“

وہ امید بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

”ایک صورت مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔“ وہ عینک اتار کر رومال سے آنکھیں صاف کرتا ہوا بولا۔ ”جس کٹھنی میں تم دونوں بہنوں کو لے جایا گیا، اُسے تلاش کیا جائے۔ مل جانے پر وہیں سے تفتیش کا آغاز کیا جائے۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ اُسے سنتی رہی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”انوار کرنے کا طریقہ کار نیا ہے۔ کم از کم میں نے آج تک سنا پڑھا نہیں ہے۔ ایک نکتے پر غور کرو۔ کیا چوہدری صاحب کوئی ایسا کام کرنے چلے تھے جس سے کسی کو تکلیف پہنچ سکتی ہو؟“

”وہ بولی۔“ آپ کے ابو انہیں یونین کونسل کے ناظم کے انتخابات میں حصہ لینے پر مجبور کر رہے تھے۔ انہوں نے حامی بھی بھری تھی۔ سردار فضل خان چاہتا تھا کہ اباجی اُن کی پارٹی کے پلیٹ فارم پر الیکشن لڑیں۔ اباجی اور انکل نہیں مانے تھے۔“

”کیا سردار فضل نے کوئی دھمکی دی تھی؟“

”نہیں!“ وہ سوچ کر بولی۔ ”کم از کم میرے علم کے مطابق اُس نے کوئی دھمکی نہیں

گے، میں باہر رہوں گی۔ جب آپ کے سامنے آؤں تو آپ مجھے شرمسار کرنے کی بجائے اس سے آگے کی بات کریں گے۔ الزا اٹ او کے سر؟“

”او کے!“ اس نے تحیر آمیز لہجے میں کہا۔ وہ پلیٹ کو دروازے تک آئی۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے ملک امجد فرید کو دیکھا اور لہرا کر باہر چلی گئی۔ یوں لگا جیسے جاتے ہوئے اُس نے اپنے عکس کو دروازے میں ٹھہرا دیا ہو۔ چند لمحوں تک ملک اُس عکس کو دیکھتا رہا پھر کاپی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ عادتاً ہونٹ کاٹتے ہوئے پڑھنے لگا۔ چند ہی سطروں کو پڑھنے کے بعد اُسے پتہ چلا کہ اُس کے ہاتھ میں محبت نامہ نہیں تھمایا گیا، زندگی کی ایک لائنیل ابھرنے پر مشتمل نہایت دشوار پرچہ مل کرنے کیلئے دیا گیا تھا۔ اُس کی پیشانی پر فکر و تردید کی غماز لکیروں کا جال سا بن گیا۔ گزشتہ دو سالوں سے دیکھوں کی لکھی ہوئی درخواستوں اور کچلے مسلے گئے واقعات کو پڑھنے والے کے سامنے سچی تحریر رکھ دی گئی تھی جسے کسی وکیل نے نہیں، بلکہ مدعی نے گھرا کر پیش کیا تھا۔ وہاں سو جوٹ سن کر ایک حقیقت ملتی تھی، یہاں ایک فقرے میں چھپا ان گنت سچائیاں آنکھوں کے سامنے لہرانے لگی تھیں۔

وہ بہ کثرت مطالعہ کرنے کا عادی تھا۔ بتول کے آنے سے قبل وہ نہ صرف دو مرتبہ پڑھ چکا تھا بلکہ اس سے آگے کی سوچ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے اُس کے قریب آ بیٹھی۔ آزر وہ لہجے میں آہستگی سے بولی۔ ”سرا! میں نے اپنی آپ بیتی آپ کو پڑھا دی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ آپ میری مدد کر سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ بھی نہیں جانتی کہ کس حد تک میری مدد کی جا سکتی ہے۔ میں کسی سے کھل کر کہہ بھی نہیں سکتی کہ میرے باپ کو قتل کیا گیا ہے۔ یقین دلانے کیلئے مجھے یہی کہانی سنانا ہوگی جو میرے لئے تو کیا، کسی کیلئے بھی ممکن نہیں ہے۔“

وہ ایک طویل سانس لے کر اُسے دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا کہ اس نازک اندام لڑکی نے پوری دنیا میں اپنی مدد کیلئے اُسے ہی کیوں چنا تھا؟

زرینہ نے کمرے میں داخل ہو کر اُن کے سامنے خاموشی سے چائے رکھ دی اور اُلٹے قدموں کمرے سے نکل گئی۔ وہ چائے پینے کے دوران تیزی سے سوچنے لگا۔ خاصی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ کپ رکھتے ہوئے بولا۔ ”بتول! خدا جانے میں تمہاری امیدوں پر پورا اترتا ہوں یا نہیں۔ یہ ضرور کہتا ہوں کہ تم بہت مختلف لڑکی ہو۔ تم سے مل کر مجھے خوشی ہوئی۔“

دی تھی۔“

وہ چند لمحے بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر نوٹ بک اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے دروازے پر ٹک کر بولا۔ ”اگر تم اجازت دو تو میں یہ کاپی ساتھ لے جاؤں۔ میں اسے ایک مرتبہ پڑھنا چاہتا ہوں۔“

وہ اضطراب کے عالم میں انگلیاں جھٹانے لگی۔ منہ سے نکلے ہوئے لفظ ہوا میں گم جاتے ہیں۔ ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کندہ ہو کر دستاویز بن جاتی ہے۔ وہ سمجھا شاید انتظار کر رہی، بولا۔ ”بتول! میں ایک ذمہ دار انسان ہوں۔ نہیں جانتا کہ تم نے مجھ پر اتنا اعتماد کیوں کیا مگر یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ تم نے مجھے ہمزاد بنا کر ثابت کر دیا ہے کہ تمہیں سے زیادہ پیارا دنیا میں کوئی نہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟“

وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ ہونٹ کپکپا کر رسل گئے۔ وہ قریب آ کر بولا۔ ”کچن کہو۔ اُن کبھی سننے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ دشمن تم سے رابطہ کریں گے۔ تم نے اُن سے رابطہ پیدا نہیں کرنا بلکہ مجھ سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھانا۔ میں ایک دو ماہ کی جھڑپ کر دیا تین دن کے بعد آؤں گا اور پھر دونوں مل کر اس پر کام کریں گے۔“

وہ دیکھ رہا تھا کہ بتول کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ اب تک وہ بڑے حوصلے میں تھی۔ اب حوصلہ جواب دیتا جا رہا تھا۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کہتے ہیں کہ ہاتھ کا لکھا کلمہ حوالے کرنا ہاتھ کاٹ کر دینے کے برابر ہوتا ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر آپ سے حوالے کر دیے ہیں۔ صرف اس برتے پر کہ انکل فرید ہمیشہ بابا جی کو اپنا بھائی کہتے تھے۔ نیچی بیٹی کہہ کر میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ میں بس یہی کہہ سکتی ہوں۔“

نادان نہیں تھا، سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ بولا۔ ”اوکے! میں بہت زیادہ محتاط رہوں گا۔ تمہارے ساتھ ہوں، تم خود کو تنہا خیال نہیں کرو گی۔ اس احساس کو تقویت دینے کیلئے فون پر تم سے مسلسل رابطہ رکھوں گا۔ آئی کیئر باؤٹ یوس بتول!“

دلاسہ دے کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے جہاں کھڑی تھی، وہیں کھڑی رہی۔ چشم تصور میں اُسے اپنے قریب کھڑا دیکھتی رہی۔ اُس کے لباس سے پھوٹی ہوئی پرفیوم کی دل آویز خوشبو ابھی تک کمرے میں بھری ہوئی تھی اور اُس کی موجودگی کا شائبہ دے رہی تھی۔ ساری خوشبو کو ایک ہی سانس میں اپنے اندر اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے

سوچنے لگی۔ ”میں نے کوئی جرم نہیں کیا، میں نے کوئی غلطی نہیں کی مگر سزا مل گئی۔ شاید زرینہ ٹھیک کہتی تھی کہ مجھے امجد فرید سے ایسی باتیں نہیں کہنا چاہئیں تھیں۔“

پھر سر جھٹک کر بڑبڑانے لگی۔ ”اب تو جو ہوتا ہے، ہو کر رہے تو اچھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ میں اس کی نظروں سے گر جاؤں گی۔ ایک شخص کے سامنے جھکنا، پوری دنیا کے سامنے ننگا ہونے سے کہیں بہتر ہے۔“

زرینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کے قریب آ کر بولی۔ ”بابا جی! کیا رہا؟“

وہ زرینہ کو سینے سے لگا کر سسکنے لگی۔ ساتھ ساتھ اُسے ملاقات کی تفصیل سنانے لگی۔ پڑھا تھا کہ عورت عہد حاضر میں مرد کے شانہ بشانہ چل رہی ہے۔ تجربہ یہ ہوا تھا کہ ساتھ ساتھ چلنے کے باوجود عورت کو اپنے شانے بچانا پڑتے ہیں۔ وہ ٹکری کی محفل اب تک نہیں ہو سکی تھی۔



سوچنے لگی کہ گارڈ کی گن کی موجودگی میں اُسے سڑک پر سے اٹھا لیا گیا۔ نہ دکھائی دینے والا ہنر خاں خاک تحفظ فراہم کرے گا۔ کندھے اچکا کر بڑبڑائی۔ ”شاید میں ہی غلط انداز سے سوچتی ہوں۔“

عالمگیر کو پہلی مرتبہ قریب سے دیکھا تھا۔ بہت دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ اونچا لاٹاقتد، چوڑی چھاتی اور ٹھوس وجود۔ شکل سے معصوم دکھائی دیتا تھا۔ پہلی مرتبہ دیکھ کر سوچا تھا کہ پاپا جوت بولتے ہیں۔ اس شخص میں اتنی خوبیاں نہیں ہو سکتیں جتنی بتلائی جاتی ہیں۔

پارکنگ میں کار روک کر وہ نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ وہ انتظار میں تھی کہ اُس کا دروازہ کھل کر موبد انداز میں باہر آنے کا اشارہ کرے گا۔ اُس نے ایسا نہیں کیا تو جھلا کر باہر نکل اور بولی۔ ”میری سائیڈ کا گیٹ کیوں نہیں کھولا تم نے؟“

وہ چونک کر اُس کی جانب مڑا۔ حسن پر غصے کی پان چڑھی دیکھ کر زیر لب مسکرا کر بولا۔ ”اس میں فحاشی ہونے کی کوئی بات نہیں مس شاہانہ! تم بچی نہیں ہو کہ اپنے ہاتھوں سے دروازہ کھول ہی نہ سکو۔“

ایک ہی فحشے میں اُسے دوبار جھٹکے کا شکار ہونا پڑا تھا۔ اُس نے حکم نہیں مانا تھا، شانی کہنے سے روکنے پر مس شاہانہ کہہ کر مخاطب کرنے لگا تھا۔ وہ ادب سے بی بی کہلائے جانے کی عادی تھی۔ غصے کے عالم میں ہونٹ کاٹتے ہوئے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ”مس شاہانہ! میں جانتا ہوں کہ تمہارا مزاج خاصا شاہانہ واقع ہوا ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ آج کل ہر انسان اخلاقی طور پر برابری کی سطح پر براجمان ہو چکا ہے۔ تم مجھے بطور زرخیز غلام نہیں، بطور محافظ قبول کر چکی ہو۔ محافظ دوست ہوتا ہے۔ دوست سے بے تکلفی برتی جاتی ہے اور احترام دے کر احترام طلب کیا جاتا ہے۔“

وہ پیر پختے ہوئے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔ عالمگیر نے پیچھے سے آواز دے کر روکا۔ قریب پہنچ کر بولا۔ ”کیا میں یہیں رہ کر تمہارا انتظار کروں؟“

وہ تیزی پڑھا کر بولی۔ ”تو اور کیا؟“

”لو کہ مس شاہانہ!“ وہ اُس کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں مس کال دیتا ہوں۔ میرا نمبر فیڈ کر لینا۔ ضرورت پڑنے پر مجھے بلا لینا۔“

وہ تھک چکی انگیز لہجے میں بولی۔ ”کتنیں سے چائے یا کافی منگوانے کیلئے تمہیں فون

وہ کار کا دروازہ کھول کر کھڑی تھی۔ دیر ہونے کی وجہ سے بار بار کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عالمگیر نے ڈرائیور اور گارڈ کو کوشی پر تعینات کر دیا تھا۔ شانی کی فحاشی کیلئے اُس نے فقط اپنے بازوؤں پر اکتفا کیا تھا۔ ڈرائیور اور گارڈ روزانہ شانی کے نیچے اترنے کا انتظار کرتے تھے، وہ عالمگیر کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ پیچ و تاب کما کر سوچ رہی تھی۔ ”پاپا نے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ دس منٹ سے کھڑی اس نوب کے نیچے کا انتظار کر رہی ہوں اور وہ ہے کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔“

وہ فطرتاً انتظار کروانے والی تھی۔ ستا کر لطف کشید کرتی تھی۔ آج زیرِ مشق آکر کھڑا رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر کار تک پہنچا اور اُسے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”شانی پلیر!“

وہ سیٹ پر بیٹھ کر منہ بسور نے لگی۔ نوکر اُسے شانی کہہ کر مخاطب ہوا تھا۔ گیٹ سے نکل کر بولی۔ ”تم نے مجھے شانی کیوں کہا؟“

”برا لگا تو آئندہ احتیاط کروں گا۔“ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر لا پر داسی سے جواب دیا۔

”تمہارے پاس گن نہیں ہے کیا؟“

”گن کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چو کر بولی۔

”میرے پاس ہر وقت سائیکلسر لگا ریو اور موجود رہتا ہے۔ تمہیں فکر کرنے یا ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اُس نے جواب نہیں دیا۔ شیشے سے باہر جھانک کر بھاگتے ہوئے شہر کو دیکھنے لگا۔

کردو گی؟“

”ہم اس کی ایک جھلک دیکھ کر آپوں آپ ہٹ ہو گئی ہیں جبکہ اپنی ملکہ عالیہ تین سالوں سے اُسے دیکھ رہی ہیں اور سچی تک نہیں۔ ارے واہ! کیا شان بے نیازی ہے۔“

شاید اُسے چھپڑے جانے کا سلسلہ جاری رہتا مگر کلاس روم کے دروازے میں کھڑی شاید اُنہیں اٹھ کر باہر لے گئی تھی۔ وہ اُٹھ کر کلاس روم کی طرف چل دیں۔

نارغ ہو کر کار تک پہنچی تو عالمگیر کو غائب پایا۔ کار میں بیٹھنا چاہتی تھی مگر ڈور مقفل تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ گرا سی پلاٹ کے آخری سرے پر ایسا تادہ درخت کے نیچے بازو سر کے نیچے رکھ لیتا ہوا تھا۔ اُس نے آواز دی۔ وہ متوجہ نہیں ہوا یا بیدار نہیں ہوا۔ اُس کے سر پر ہینچ کر بولی۔ ”اے! کیا یہ سونے کا وقت ہے؟“

وہ آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ اُسے کوئی جواب دیے بغیر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ گٹ ان لاک کر کے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”سیدھا گھر جانا ہے؟“

وہ بولی۔ ”ہاں!“

گاڑی چل دی۔ وہ اُسے دیکھنے لگی۔ ہم جولیوں نے اُس پر باور کرا دیا تھا کہ وہ دیکھنے کے لائق تھا۔ سوچنے لگی۔ ”پاپا کہتے ہیں کہ یہ دوسرے ملازموں سے قدرے مختلف ہے۔ یہ نہایت زیادہ مختلف ہے۔ مجھے اس کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔“

خود کو ملامت کرنے لگی۔ پڑھ رکھا تھا کہ انسان برابر ہوتے ہیں۔ بڑے چھوٹے کا فرق دولت کے میزان پر نہیں نکالا جاتا۔ تھوڑا جھک کر بولی۔ ”عالمگیر! میں اپنے صبح والے رویے پر اہم ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں یہ رائے قائم کی تھی کہ تم بڑے باپ کی نامی بگڑی ہوئی اور مغرور بیٹی ہو اور تمہارے ساتھ خاصا خراب وقت گزرے گا۔ تمہاری نعمت دیکھ کر اپنی رائے تبدیل کر لیتا ہوں۔“

وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔ ”تم نے کوئی سرکاری نوکری کیوں نہیں کی؟“

”کی نہیں۔“

”کیا اب بھی کوشش کر رہے ہو؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

وہ ہنسنے لگا۔ بولا۔ ”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں حفاظت کے نقطہ نظر سے کہہ رہا ہوں۔“

وہ چند لمحے کھڑی اُسے گھورتی رہی پھر پلٹ گئی۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی کہ فون کا بزر بولنے لگا۔ رُک کر پرس میں سے فون نکالا۔ سکرین پر اچھی نمبر دکھائی دیا۔

مُڑ کر کار سے ٹیک لگا کر کھڑے عالمگیر کو دیکھا۔ اُس نے اشارہ کیا۔ اشارے سے کچھ گئی اُسی نے مِس کال دی ہے۔ فون پرس میں ڈال کر کلاس کی طرف بڑھ گئی۔ سوچا کہ کلاس میں آرام سے بیٹھ کر اُس کا نمبر فون کی میموری میں محفوظ کر لے گی۔

سمیرا آدھا گھنٹہ لیٹ پہنچی۔ شانی نے سرگوشی کی۔ ”تم کہاں آئی رہی ہو اب تک؟“ وہ بولی۔ ”تمہارے نئے ڈرائیور کو دیکھتی رہی ہوں۔ ہائے! کیا پر سنائی ہے اُس کی جی چاہتا ہے کہ باڑ کے پیچھے بیٹھ کر اُسے گھنٹوں دیکھتی رہوں۔“

وہ مصنوعی خفگی سے اُسے گھورتے ہوئے بولی۔ ”شرم کیا کر۔“

پیریلڈ فری ہونے تک کلاس کی تمام لڑکیوں تک سمیرا کی سرگوشی پہنچ چکی تھی۔ کچھ لڑکیاں روم سے نکل کر گرا سی پلاٹ میں آ گئیں۔ سعدیہ اُس کی گاڑی کے قریب گئی۔ ڈرائیور کچھ پوچھا۔ چند باتیں کر کے واپس آئی اور انگوٹھے اور انگلی کو جوڑ کر ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ”ہائے سمیرا! تم نے سچ کہا تھا۔ ایک دم قنڈاسنک ہے!“

ہم جولیوں کی باتیں سن کر وہ سوچنے لگی۔ ”سب ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ پوری کال ڈرائیور سمیت کوئی بھی اُس کے سامنے کھڑا چٹا نہیں ہے۔ ہائے کاش! وہ میری طرف سے باپ کا بیٹا ہوتا۔“

سعدیہ اُس کے پہلو میں کہنی چبھو کر متوجہ کر رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”کیا ہے؟“

”پڑھا لکھا لگتا ہے۔“

”ہاں! پاپا نے بتلایا تھا کہ وہ سول انجینئر ہے۔“

”تمہارے ہاتھ کہاں سے لگ گیا؟“ سمیرا نے پوچھا۔

”میرے ہاتھ نہیں، پاپا کے ہاتھ لگا ہے۔ تین سال سے ہمارے ہاں نوکری ہے۔“ وہ پر تقاضا انداز میں گویا ہوئی۔

”سنو بھی اس کی بات..... توجہ سے!“ سمیرا نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر کے

ہاں بھی اجنبی سا لگتا تھا۔ اسی دوران گاڑی کوٹھی میں داخل ہو کر پورچ میں رک گئی تھی۔ اُس کے اترنے سے پہلے ہی عالمگیر گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھ چکا تھا جہاں گاڑی اپنی گن اٹھائے گیٹ بند کر رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر پاپا کو فون کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر بولی۔ ”پاپا! عالمگیر کہہ رہا ہے کہ اُسے میری پرواہ نہیں ہے۔ یہ آپ نے کس قسم کا بندہ میرے سر پر مسلط کر دیا ہے؟ مجھے نہیں لگتا کہ وہ میرے ساتھ مخلص ہوگا۔“

پاپا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”پاپا کی جان! تم فکر نہ کرو۔ وہ ایسا ہی ہے۔ خدا نخواستہ کوئی پرابلم سامنے آئی تب تمہیں اُس کی خوبیوں کا پوری طرح علم ہوگا۔“

”وہ مجھے ایسے ٹریٹ کرتا ہے جیسے میں اُس کی مالکن نہیں، کوئی دوست ہوں یا کوئی عام لڑکی ہوں۔“

”بابا بس کرو تاں!“ پاپا نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں نے کہا تاں کہ وہ ایسا ہی ہے۔ مجھے بھی اپنا بیاریلی سمجھ کر مخاطب کرتا ہے۔ وہ زبان سے نہیں، دل سے عزت کرنے کا ناکل ہے۔“

وہ طویل سانس لے کر بولی۔ ”اور تو اور..... پاپا! اُس نے گاڑی اور ڈرائیور کو بھی ساتھ نہیں لیا۔ کہنے لگا کہ میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ اپنے ساتھ گن کی بجائے چھوٹا سا پستول لے کر گیا تھا۔“

باپ ہنستے ہنستے اُسے سمجھانے لگا۔ جو کچھ وہ جانتا تھا، اُس کی بیٹی نہیں جانتی تھی۔ باپ نے دریافت کیا۔ ”جو لوگ تمہارا تعاقب کرتے تھے، اُن میں سے کوئی آج کے دن میں تمہیں دکھائی دیا؟“

اُسے مجبوراً جھوٹ بولنا پڑا۔ ”نہیں پاپا! میں نے آج کسی کو نہیں دیکھا۔“

”بہر خود ہی سمجھ لو۔ عالمگیر کے آنے پر سبھی دُور دُور بھاگ گئے ہیں۔ یہی اُس کی خوبی ہے۔“

اُس نے ”ہونہہ“ کہہ کر فون بند کر دیا۔ باپ عالمگیر کی طرف فداری کا جھولا جھلاتے ہوئے بیٹی کی بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

”اب پیٹ بھرنے لگا ہے۔“

”تمہارا گھر کہاں ہے؟“

”نہیں ہے۔“

وہ بھونچکا رہ گئی۔ پُر استعجاب لہجے میں بولی۔ ”نہیں ہے..... کیا مطلب؟ تمہارا گھر والے کہاں رہتے ہیں؟“

وہ دائیں ہاتھ کی شہادت انگلی کار کی چھت سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”اوپر..... اللہ کے پاس!“

”کیا سبھی.....؟“

”ہاں سبھی مر چکے ہیں۔ تسلی کی بات یہ ہے کہ دنیا میں ایسا کوئی بھی نہیں جسے ملے کایہ اشتیاق ہو، جس کی کمی محسوس کروں، جسے میری پرواہ ہو یا مجھے اُس کی فکر ہو۔“ وہ عام لہجے میں بولا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ وہ تعجب سے بولی۔ ”کیا تمہیں میری بھی فکر نہیں ہے؟ پاپا تو کہہ رہے تھے کہ عالمگیر کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ پاپا نے تو یہ بھی کہا تھا کہ میری جانب اٹھنے والی انگلی کو کاٹ دو گے جبکہ تم کہہ رہے ہو کہ تمہیں کسی کی فکر نہیں ہے۔“ وہ مسکراتے لگا۔ بیک مر میں اُسے دیکھ کر بولا۔ ”مس شاہانہ! یہ میری ڈیوٹی ہے۔ اپنا فرض پوری ایمانداری سے نبھاؤں گا۔ تمہاری قسمت میں اگر کوئی تکلیف لکھی ہوگی، تو تمہیں ضرور ملے گی۔“

وہ اُس کی کہی ہوئی بات کو سوچنے لگی۔ نہ سمجھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”کیا تم یہ کہہ رہے کہ تمہیں میری پرواہ نہیں ہے؟“

”دل سے کہو۔ تمہیں میری پرواہ ہے؟“ جواب دینے کی بجائے اُس نے سوال دیا۔ وہ گڑبڑا گئی۔ جلدی میں کہنے لگی تھی کہ۔ ”ہاں! مجھے تمہاری پرواہ ہے؟“

بجائے دل میں سوچنے لگی کہ مجھے کیوں اس کی پرواہ ہونے لگی۔ یہ میرا لگتا بھی کیا ہے؟ شاہانہ کو خاموش پا کر اُس نے کہا۔ ”سچ بات تو یہ ہے کہ جو تمہیں پیار کرتا ہے، وہ تمہاری پرواہ کر سکتا ہے، میں نہیں۔“

وہ خاموش ہو کر نچلے ہونٹ پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ لپ سٹک کی تہ کی وجہ سے

ہاں گھر اُسے ایک ٹک دیکھنے لگا۔ اُس کی نگاہیں اُسے بدن پار کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔
گہرا کر نظریں چرا گئی۔ آہستگی سے بولی۔ ”تم شاید میری بات پر یقین نہیں کر رہے ہو؟“
وہ بولا۔ ”نہیں مس شاہانہ! ایسی بات نہیں ہے۔ گاڑی کا نمبر یاد ہے تمہیں؟“
وہ بولی۔ ”میں نے دیکھا ہی نہیں۔ شاید نمبر پلیٹ سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔“
”تم جھوٹ بولتے ہوئے اچھی نہیں لگ رہی ہو۔“
”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ پھر چیخ کر بولی۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ
میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔“

وہ مسکرانے لگا۔ ”ہاں مس شاہانہ! اپنے جھوٹ کو سچ کی چادر اوڑھاتے ہوئے اگر
ڈرائیور اور گارڈ کو بھی ہم خیال بنالیتیں تو میں تمہاری بات کو مان لیتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم
بلا سٹنگ کے بعد تمہارے غیب کے علاوہ کوئی پرابلم پیش نہیں آئی۔ کیا مجھے بتلا سکتی ہو کہ وہ
پانچ گھنٹے تم نے کہاں گزارے تھے؟“

اُس کی رگوں میں خون نمجد ہونے لگا۔ جس بات کو چھپانا چاہتی تھی وہ زبان کی نوک
سے پکڑی جا چکی تھی۔ وہ بولی۔ ”میں ہسپتال میں بے ہوش پڑی رہی تھی۔ مجھے جب ہوش
آیا تو میں اپنے کمرے میں..... اسی بیڈ پر..... لیٹی ہوئی تھی۔“

”بالکل ٹھیک۔ اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتلا دو کہ کس ہسپتال کے کس وارڈ میں تمہیں رکھا
گیا؟ تمہیں یہاں کون چھوڑنے آیا تھا؟“

وہ یاد کرنے لگی۔ یاد نہیں آیا تو زچ ہو کر بولی۔ ”یہ تم مجھ سے کس انداز میں پوچھ گچھ
کر رہے ہو؟ کیا وہاں کس کر بے ہوش ہو کر میں نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے؟“

وہ اتنے پر ہاتھ پھیلتے ہوئے سوچنے لگا۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی بہت گہری چیز کو
مخبر عام پر لانے کی جہت میں مشغول ہو گیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ نیم بیزار سے لہجے میں
بولا۔ ”کس! میرا دل کہتا ہے کہ تم سے کوئی جرم سرزد کر دیا گیا ہے۔ سرکاری ہسپتال اتنے
فعال ابھی تک نہیں ہوئے کہ وہ ایک بے ہوش لڑکی کو اٹھا کر ہسپتال لے جائیں۔ علاج
کریں۔ بالی داوے! تمہارے پاس کوئی ایسی دستاویز موجود تھی جس سے ہسپتال والوں کو
تمہارے گھر کا ایڈریس معلوم ہوا تھا؟“

ہوئی۔ بے حیائی کی داستان بار بار پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ٹی وی آن کر کے کیبل پر پڑ
والے چینل کنگھالنے لگی۔ دل کسی دلچسپی کو مان کر ہی نہیں دیتا تھا۔ ایسے میں اُس کا فون بول
اٹھا۔ نمبر دیکھا تو اتنے پر پل پڑ گئے۔ کان سے لگا کر بولی۔ ”ہاں! بول رہی ہوں۔“
دوسری طرف سے وہی بھٹی بھٹی ہنسی مخصوص آواز ابھری۔ ”میرے روکنے کے باوجود
نے عالمگیر کو خود سے چٹالیا ہے۔ ہم اُسے آگ پر رکھیں گے تو تم بھی جل جاؤ گی۔“
آج اُسے نسبتاً کم ڈر لگ رہا تھا۔ لہجے میں بے پرواہی سمو کر بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ
تم لوگ عالمگیر سے ڈرتے ہو۔ اب ہمت پکڑو اور سامنے آؤ تو جانوں کہ کس میں دم ہے
اور کون دم وبا کر بھاگتا ہے۔ ایک لڑکی سے بد معاشی کر کے طرم خان بننے والے کیا
دوبارہ مجھے فون نہ کرنا ورنہ بہت برا پیش آؤں گی۔“

وہ کچھ کہنے لگا تھا کہ شاہانہ نے فون کان سے ہٹا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر بیل بج اٹا۔
اُس نے فون کو پاؤں آف کر دیا۔ وہ اُس کی دھمکیوں کو سننا نہیں چاہتی تھی۔ فون بیڈ کی راہ
پر پھینک کر ٹی وی کی سکرین کی طرف متوجہ ہوئی۔ ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس
نے بلند آواز میں کہا۔ ”اندر آ جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔“

عالمگیر کو دیکھ کر گہرا گئی۔ اُس نے سوچا تھا کہ دروازے پر رحمت بی دستک دے رہی
ہوگی۔ وہ صوفے میں بیٹھ کر بولا۔ ”مس شاہانہ! تکلیف دینے پر معافی چاہتا ہوں۔ آنا
ضروری تھا کیونکہ ابھی تک تم نے خود سے درپیش مسئلے کو دسکس نہیں کیا۔ میں یہ جانا چاہتا
ہوں کہ تم کس قسم کے خطرات سے دوچار ہو؟“

وہ کمبل کی سرخ بردار پٹی کے ساتھ کھلتے ہوئے سوچنے لگی کہ اُسے کیا بتانے اور اُس
سے کیا چھپانے۔ پاپا کو جھوٹ بول کر اُس نے عالمگیر کو یہاں بلوایا تھا۔ اب اُسے
کرنا ضروری تھا ورنہ وہ سامان باندھ کر رخصت ہو جاتا۔ تجربہ ہو چکا تھا کہ اُس کی موجودگی
میں اُسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ قدرے توقف کے بعد بولی۔ ”میں تمہارے سوالوں کے قائل ہوں۔
جواب تو نہیں دے سکتی مگر اتنا بتلا سکتی ہوں کہ گزشتہ دو ہفتوں میں سفید رنگ کی ٹیوٹا،
میں چند اوباش گھر سے کیسپس اور کیسپس سے گھر تک میرا پیچھا کرتے رہے ہیں۔ تمہارے
آنے پر وہ کارکنیں دکھائی نہیں دی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کون لوگ ہیں، کیا چاہتے ہیں۔
مجھے کس قسم کا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

قیامت کو چھپا کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے مطمئن بیٹھی تھی کہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ آگے عافیت ہی عافیت ہے۔ اچانک ذہنی رو بہک گئی۔ اُس کے قیامت انگیز وجود کو چشم تصور میں سجا کر بھٹکنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ قلم صرف ایک بار پوری دلچسپی سے دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ قلم کو دوسری مرتبہ دیکھنے کی خواہش میں بے چین ہونے لگا مگر کمرے میں سی ڈی پلیئر موجود نہیں تھا۔

وہ عام لوگوں کی نسبت کم حسن پرست واقع ہوا تھا۔ جوان ہونے کے باوجود اُس نے کبھی عورت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور نہ ہی کوئی اُس کے خوابوں میں شب بھر کا عذاب بن کر اُترتی تھی۔ شاہانہ کو متعدد بار دیکھا تھا۔ آج قریب سے دیکھنے پر پتہ چلا تھا کہ پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ دیکھی ہوئی ہر چیز مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچے چلی جا رہی تھی اور وہ بے اختیار ہو کر کھنچا جا رہا تھا۔ یوں جیسے اُس کی کوئی مرضی ہی نہیں ہے، کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ بیڈ میں اٹھ بیٹھا۔ لحاف اتار کر پانکٹی کی جانب پھینک دیا۔ لمبے لمبے سانس سینے میں اتار کر جھٹکے لیتی ہوئی گاڑی کا انجن ٹھنڈا کرنے لگا۔ بیڈ سے اتر کر کمرے میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ٹھہرنے لگا۔ دل کو چین نہیں آ رہا تھا۔ بے چینی کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

دل گھبرانے لگا۔ گھبراہٹ میں کمرے میں روشن واحد نیلے ٹائٹ بلب پر نظر پڑی تو ٹھنک کر رک گیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ روشنی کا حالہ پھیلنے لگا ہو۔ اُس نے سر جھٹک کر غور سے دیکھا۔ نیلا حالہ خاصا پھیل چکا تھا۔ پھر ماں دکھائی دی۔ اُس کے سفید لباس پر نیلا ہٹ ماری تھی۔

ایک حد تک آ کر رک گیا۔ بولی۔ ”علم دین سے عالمگیر بننے والے شیطان! دیکھ لے کہ جس پھول کو تم نے اپنے گروگوں کے پیروں تلے روندنا تھا، اُسی پھول نے تمہارے ذہن و بدن میں آگ لگا کر رکھ دی ہے۔ تمہاری غیرت کو امتحان میں ڈالنے والی تم سے کئی گز کے فاصلے پر لیٹی ہے اور اپنے بدن کے شعلوں سے تمہیں جلا رہی ہے۔ تمہاری قسمت میں اُس کے پیچھے لپکتے اور بھاگتے رہنا لکھا ہے۔ دم لئے بغیر بھاگتے رہو اور اپنی غیرت کے سر پر جوتے مارتے رہو۔“

برکڑے وقت میں ماں اُس کی بے بسی کا تماشہ دیکھنے کیلئے آن وارد ہوتی تھی۔ وہ غصے

وہ گھر چکی تھی۔ اُسے ماننا پڑا کہ عالمگیر نہ صرف بہت خوب رو بلکہ بہت زیادہ چالاک اور فطین بھی ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دئے ہوتے۔ ”گھبرو! مجھے سوچنے دو۔ جب میں شاہنگ کیلئے گھر سے روانہ ہوئی تھی تو میرے پاس کوئی ایڈیٹیو نہیں تھی۔ خریداری کے بل شاہنگ بیگ میں تھے، میرے پاس نہیں تھے۔ اب نو! واقعی یہ تو پریشانی والی بات ہے کہ انہیں میرا پتہ کہاں سے ملا؟“

وہ خاموشی سے اُس کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ بری طرح گھبراہٹ اور اضطراب کا شکار ہو چکی تھی۔ خودکلامی کرنے لگی۔ ”ہائے! یہ مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے تم نے۔ اگر میں ہسپتال میں نہیں رہی تو پھر کہاں رہی؟ اس کا مطلب ہے کہ مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ پھر بغیر تاوان لئے اغوا کرنے والوں نے مجھے چھوڑ کیوں دیا؟“

دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بڑبڑائی۔ ”پلیئر عالمگیر! مجھے کچھ دیر کیلئے تنہا چھوڑ دو۔ برا دل گھبرا رہا ہے۔“

وہ دروازے تک آیا۔ پلٹ کر بولا۔ ”مس شاہانہ! جان بوجھ کر کچھ چھپاؤ گا۔ سراسر اپنا نقصان کرو گی۔ مجھ پر پوری طرح کھل جانے کی صورت میں فائدے میں رہو گی۔ آگے تمہاری مرضی!“

وہ دروازے سے باہر نکل کر چند ثانیے تک کھڑا رہا۔ کمرے کے اندر..... کمرے کے باہر..... دونوں ادا کار اپنے اپنے شارٹس کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ عالمگیر کے بگس شاہانہ نے خاصی بھونڈی ایکٹنگ کی تھی۔ شرم سے گڑی جا رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اُن نے اپنے بیان کو فول پروف بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں رکھا تھا۔ کسی کو اُن کا شک نہیں ہوا تھا۔ خامی پکڑنے والے نے ایک نہیں، ان گنت چور خانے پکڑ کر اُسے چرنا دیا تھا۔ جن باتوں پر اُس کے ڈرائیور اور گارڈ نے اطمینان کا سانس لیا تھا، انہی باتوں سے عالمگیر نے خطرے کی بوسونگھ لی تھی۔ بے اختیار بڑبڑائی۔ ”پاپا ٹھیک کہتے ہیں۔ عالمگیر نا آدمی نہیں ہے۔ مجھے اس سے محتاط رہنا پڑے گا۔“

دوسری طرف عالمگیر اپنے بیڈ میں لیٹ کر شاہانہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کی حماقتوں پر زیر لب مسکرانے لگا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

ہوئی تھیں۔ جوانی کا نشہ اور محبت کا جادو۔ وہ جتنا بھاگتا، اتنا ہی آگ پکڑے جنگل میں دور تک گھس جاتا تھا۔ بشیر خان نے ایک بار اُس سے دریافت کیا تھا کہ وہ کسی عورت کی محبت میں گرفتار تو نہیں۔ اُس کے انکار پر حیرت زدہ لہجے میں گویا ہوا تھا کہ پھر وہ بیٹھے بیٹھے اچانک گم کیوں ہو جاتا ہے؟..... اب بشیر خان کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ ہاتھ میں تھامی ہوئی موڑتی اچھل کر دل میں پڑا جگا کر بیٹھ گئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے کو گم صم کیے دے رہی تھی۔ یوں کہ اطراف کی خبر بھی نہیں رہی تھی۔

سوچنے لگا کہ اُسے کیا ہو رہا ہے۔ آج تک ایسی کیفیت سے روشناس نہیں ہوا تھا۔ دیوار پر پوری قوت سے مکا مارا۔ تکلیف کا احساس ہوا۔ ایسے میں یاد آیا کہ جب کبھی ماں اپنے نظرات سے چھٹکارا پانے میں ناکام رہتی تھی تو آخری حربے کے طور پر پانی کا بھرا ہوا جگ اپنے سر میں اندیل لیتی تھی۔ دماغ ٹھنڈا ٹھار ہو جاتا تھا۔ وہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑا شیشے کا جگ اٹھا کر سوچنے لگا۔ ”سردی بہت ہے۔ کہیں نمونیا نہ ہو جائے۔ ماں کہتی تھی کہ سردی میں سر میں پانی ڈالنے سے سر سام ہو سکتا ہے۔ کہیں سر سام نہ ہو جائے۔“

اُس نے سر سام کا کوئی مریض نہیں دیکھا تھا مگر سر سام کے مرض سے ڈرتا تھا۔ اُن دیکھی شے سے زیادہ ڈر لگتا ہے۔ وہ دیوار تک گیا۔ مکا مارنے سے تکلیف ہوتی تھی۔ پانی سر میں ڈالنے سے سر سام ہونے کا خدشہ دل دہلا دیتا تھا۔ خود پر لعنت بھیجنے لگا۔ اتنا بزدل وہ کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ پانی کا اُدھ بھرا جگ اٹھا کر سر پر پلٹ ڈالا۔ پانی زیادہ ٹھنڈا نہیں تھا مگر اُس کے تپتے ہوئے بدن پر تیزاب کی طرح پڑا اور جہاں جہاں تک گیا، اپنی خبر دیتا گیا۔ کچھ پانی قدموں کے قریب قالین پر گر کر جذب ہو گیا تھا۔ کچپی طاری ہو گئی مگر پیمانہ گم گیا۔ اُسے ماننا پڑا کہ ماں اپنے بدن کی منہ زور خواہشوں کو روندنے کیلئے پانی ڈالنے والا عمل ٹھیک ہی کرتی تھی۔

جگ میں تھوڑا سا پانی بچا تھا۔ اُس نے جگ منہ سے لگا کر پی لیا۔ کچھ پانی حلق میں اُڑا، کچھ ہونٹوں کے گوشوں سے اُڑ کر گردن سے ہوتا ہوا سینے تک پہنچ گیا۔ سینے کے گھنے بالوں میں سے راستہ بنا کر رینگتا ہوا پانی عجیب انداز سے بدن کو گلد گدار ہا تھا۔ وہ ایک جگر جھری سے اکر رہ گیا۔

گیلے بالوں سے قطرہ قطرہ ٹپکتا ہوا پانی ڈرپ کی نالی میں گرنے والے آبِ شفا کی

سے بولا۔ ”میری اپنی کچھ ترجیحات ہیں۔ تم مجھے بلاوجہ طعنے مت دیا کرو۔ مجھے اُس تراز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ اُس کے باپ کو نینچا دکھانے کیلئے اُسے استعمال کر رہا ہوں۔“

”احق ہو۔ لوگ سُن کر سمجھ لیتے ہیں۔ تم دیکھ کر بھی نہیں سمجھ پاتے ہو۔ اپنے سُن کو ٹوٹوڑ تمہیں صاف پتہ چل جائے گا کہ تم اُسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو رہے ہو جسے تم نے سینکڑوں فٹ پستی میں پھینک دیا تھا۔ تھوک کو چاٹتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ شرم تو شرم والوں کیلئے بنی ہے، تمہارے نزدیک کیا حیثیت رکھتی ہے۔“

وہ کچھ نہیں بولا بلکہ ماں کے طعنے کو سُن کر خود کو ٹوٹوڑنے لگا تھا۔ کہیں ماں سچ نہ کہتی ہو۔ دل میں اٹھل پٹھل ہو رہی تھی۔ کون اوپر، کون نیچے..... سر دست کچھ پتہ نہیں چلا۔ ماں اُس کی خاموشی پر طنز کرتے ہوئے بولی۔ ”کیوں؟ تمہاری بولتی کیوں بند ہو گئی ہے عالمگیر؟ تمہیں کہتی تھی ناں کہ سچ کو آج نہیں پہنچتی۔ تمہارے ظلم کا شکار ہونے والی بتول ایک چاہنے والے کو سچ بتلا رہی ہے۔ دونوں کے سچ کوئی جھوٹ حاصل نہیں ہے، دونوں کو ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ندامت نہیں ہوتی۔ تم جھوٹے ہو۔ تمہیں ملنے والی تم سے بڑی جھوٹی ہے۔ آئنے سامنے بیٹھ کر دونوں ہی جھوٹ بولتے ہو۔ ایک دوسرے کے جھوٹ پکڑتے ہو۔ یہ کیا زندگی ہے؟ اس سے موت بھلی ہے۔ خدا کرے کہ تم ایسی زندگی جینے کی بجائے میری طرح موت کو گلے لگا کر میرے پاس پہنچ جاؤ۔“

پتہ نہیں ماں دعا دے رہی تھی، بد دعا دے رہی تھی۔

وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے چیخا۔ ”مجھے معاف کر دے میری ماں! دعا دو یا بدعا دو..... میں وہی کروں گا جو میں نے ٹھان رکھا ہے۔ تم ناوقت پریشان کر کے ٹیپو توڑ دیتی ہو۔ جاؤ! مجھے تنہا چھوڑ دو۔“

ماں اُس پر رحم آمیز نگاہ ڈال کر معدوم ہو گئی۔

اُس نے سر جھکا لیا۔ کبھی کبھی نظر چرائینے سے مشکل گھڑیاں بن چھوئے گزر جاتی ہیں۔ اُس پر اُتری ہوئی قیامت بھی احسان کرتے ہوئے رخصت ہو گئی۔ جاتے ہوئے سمجھا گئی کہ بُرے کو کبھی اچھوں کی صحبت نہیں ملتی۔

دماغ پیش پکڑنے لگا تھا۔ ماں کی باتیں بھول کر وہ شانی کے خیال کی بھول بھلیوں میں سرگرداں ہونے لگا۔ نشہ اور جادو سر چڑھ کر بولتے ہیں۔ یہاں دونوں چیزیں اکٹھے حملہ آور

وہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دکھا دیتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں اُس نے ہاتھ رکھا تھا، وہیں اپنا ہاتھ رکھ کر سوچنے لگا۔ ”ماں ٹھیک کہتی تھی۔ تجھے بدن کو انگارے نے چھو کر پھر تپا دیا ہے۔ ایں..... یہ کیا ہوا؟ دل نے دھڑکنا کیوں بند کر دیا ہے؟“

ڈر کر سینے کو ٹٹولنے لگا۔ دھڑکن کو محسوس کر کے مسکرانے لگا۔ جانے والی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ بھی اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ لحاف اوڑھ کر بدن کو حرارت پہنچانے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے لحاف کے باہر بدن تپ رہا تھا۔ اب لحاف کی حرارت بھی کچھ نہ کر پاری تھی۔ محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ سوچنے لگا۔ ”کہتے ہیں کہ سوئی ایک کچے گھڑے پر تیر کر چناب کا رخ پانی پار کر گئی تھی۔ پہلے دل نہیں مانتا تھا، آج ماننے لگا ہے۔ انسان پر ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ بدن کسی سردی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ شاید مجھ تک وہ وقت آن پہنچا ہے۔“

رات پورے جہان پر ایک سی اتری تھی مگر دونوں کمروں میں اُس کا استقبال الگ انداز میں ہو رہا تھا۔

کلا کٹھی سے نگلی تو دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔ وہ جھینپ کر بولی۔ ”گاز کیوں روک لی ہے؟ چلو۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔“

وہ اپنی توجہ سامنے مرکوز کرتے ہوئے ایکسی لیٹر پر پاؤں کا وزن بڑھانے لگا۔ منزل پر پہنچنے تک دونوں خاموش رہے۔ وہ اترنے لگی تو قریب سے گزرتا ہوا رئیس رُک گیا۔ اُسے دیکھ کر ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔ ”ویکم مس شاہانہ فضل! آج میری طرح تاخیر سے پہنچی ہو۔“ وہ اُس کے نزدیک پہنچ کر بولی۔ ”ہائے رئیس! رات دیر تک فلم دیکھتی رہی اس لئے آگے سے کھلی۔“

”دونوں باتیں کرتے ہوئے قدم سے قدم ملا کر مرکزی عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ عالمگیر بڑی محویت سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ اُس کے لبوں پر چمکی ہوئی تھی۔ زیر لب بڑبڑایا۔ ”تو یہ ہے ملک زادہ..... رئیس..... میری مالکن کو دل کی ڈبیا میں بند کر کے سردار کی کروڑوں کی جائیداد ہڑپ کرنے کا منصوبہ بنانے والا۔“

دونوں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور وہ گرا سی پلاٹ میں آ بیٹھا۔ زیر لب کوئی گیت

طرح دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں دروازہ بے آواز طریقے سے کھلا اور دروازے کے پتھوں بچ کھڑی شانی دکھائی دینے لگی۔ وہ چونک گیا۔ اس وقت اُس کے کمرے تک چلے آنے کا سبب کیا تھا؟.....

وہ حیرانی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اتنی سردی میں گیلیا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ جلدی سے سر کو ادھر ادھر بٹخ کر بالوں کو خشک کرنے لگا۔ جگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”مس شاہانہ! پلیز کم ان۔“

وہ اندر داخل ہوئی۔ آنکھوں سے استعجاب عیاں تھا۔ کمرے کے وسط میں ٹھہر کر بولی۔ ”تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم نے سر میں پانی کیوں ڈالا؟“

وہ بولا۔ ”آگ بجھانے کیلئے پانی پھینکنا پڑتا ہے۔ تم نے کبھی فائر بریگیڈ والوں کو پائپ سے پانی چھڑکاتے نہیں دیکھا؟“

وہ اتنی نادان نہیں تھی کہ اُس کی بات کو سمجھ نہ پاتی۔ کرسی پر پڑا تولیہ اٹھا کر اُس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔ ”آگ بجھ چکی ہے۔ اب راکھ بھی پونچھ ڈالو۔“

اُس نے چونک کر دیکھا۔ دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ آنکھیں ٹھہر کر اضطراب دل کی کیفیت بیان کرنے لگیں۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے جانے کے بعد پھر مجھے سر میں پانی ڈالنا پڑے گا۔ اس لئے مجھ پر کرم کرو اور اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔“

اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یقین ہو گیا کہ اُس کے حسن نے عاشق کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ اچانک ایک اور خیال نے اُس کی آنکھوں کی چمک کو نگل لیا۔ سوچنے لگی۔ ”اپنے چاہنے والے کو اپنی کمزوری بیان کرنے کا نتیجہ بہت برا نکلتا ہے۔ میں جو کچھ کہنے کیلئے آئی ہوں، ابھی میرے سینے میں محفوظ ہے۔ اسے بے زبان ہی رہنا چاہیے۔“

پلٹ کر کمرے سے نکلنے لگی۔ دروازے کے بچ کھڑے ہو کر بولی۔ ”میں تمہیں بتانے کیلئے آئی تھی کہ مجھے اغوا کر کے میرے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا۔ تم اپنے حواس میں نہیں ہو، اس لئے جاری ہو۔“

وہ تیز تیز قدم اٹھا کر دروازے میں آیا۔ پہلو سے نکل کر سامنے کھڑا ہو کر بولا۔ ”مس شاہانہ! میں اب پوری طرح ہوش میں ہوں۔ چاہو تو بتلا سکتی ہو۔“

انوکھا روں کے بارے میں سوچنے لگی۔ فون پر رابطہ رکھنے والے کی باتوں کو دل ہی دل میں دہرانے لگی۔ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں اُس نے کہا تھا کہ وہ بڑے لوگوں کا کارندہ ہے۔ ایک موقع پر اُس نے ”میرا ملک“ کہہ کر بتلانا چاہا تھا کہ وہ کسی ملک نامی شخص سے وابستہ ہے۔ وہ رئیس کے باپ ملک ظہور کا ناتا فون کرنے والے انوکھا کار سے جوڑنے لگی۔ اپنے جذبات کو حتیٰ شکل دینے کیلئے اُس کے پاس کوئی دلیل یا ثبوت نہیں تھا۔ سیاسی باپ کی بنی ہونے کے ناتے سیاسی انداز سے ہی سوچ رہی تھی کہ رئیس کا خاندان پایا کی مخالف باپ پارٹی کا اہم رکن ہے اور پایا کو اپنی پارٹی کی دہلیز پر لانے کیلئے ایسے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔

دیکتے ہوئے جوان بدن کی مالکہ ہونے کے ناتے وہ رئیس کو بھی اسی ترازو پر رکھ کر نلے لگتی تھی۔ وہ اُسے حاصل کرنے کیلئے ایسی رقیق حرکت کر سکتا تھا۔ پھر بے ساختگی سے رکو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے سوچنے لگی کہ انوکھا کرنے کے بعد اُس نے تو اُسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ فلم میں وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایک اور کریہہ خیال نے اُس کے دماغ کی چولیس ہلا کر رکھ دیں۔ عین ممکن تھا کہ درندے نے پہلے اپنا پیٹ بھرا ہو، پھر اپنے طفلیوں کے سامنے اُسے پھینک دیا ہو۔ فلم صرف طفلیوں کی بنائی گئی ہو۔

وہ سرتھام کر بیٹھ گئی۔ جتنا سوچتی، اتنا ہی الجھنے لگتی۔ عالمگیر نے آکر اُس کے باقی ماندہ ٹیٹن کو بھی نہیں کھسک دیا تھا۔ بڑ بڑائی۔ ”ہائے کاش! میں پڑھنے کیلئے یہاں آئی ہی نہ ہوتی! اٹھانے پایا سے سیکورٹی طلب ہی نہ کی ہوتی۔“

جو ہوتا تھا، وہ وہ چکا تھا۔ ہونے والی کے بارے میں سوچنا فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔ اوست اُس نے فیصلہ کیا کہ عالمگیر کے سامنے منہ بند رکھے گی تاوقتیکہ کوئی صورت حال واضح ہو جائے، کوئی لائحہ عمل بن جائے۔

سہ پہر کے قریب رحمت بی نے اُسے اطلاع دی کہ رئیس اُس سے ملنے کیلئے آیا ہے۔ ”تیرائی سے بولی۔“ ”کیا اکیلا آیا ہے؟“

”ہاں بی بی جی!“ رحمت بی نے کہا۔ ”میں نے اُسے بتلایا کہ بی بی جی آرام کر رہی ہیں۔ وہ ابھی گئی تھی۔ بمشکل خود پر قابو کئے بیٹھی تھی۔ گھر پہنچنے پر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں جا کر مقید ہو گئی۔ عالمگیر نے اُس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے

گنگنا نے لگا۔

واپسی پر راستے میں اُس نے شاہانہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ”آج صبح جو شخص تمہیں ملتا تھا، وہ ملک رئیس ہے ناں؟“

وہ نخوت سے بولی۔ ”میں کسی ملک کو نہیں جانتی۔ وہ میرا کلاس فیلو رئیس ہے۔“

وہ ہنسنے لگا۔

”کیوں ہنس رہے ہو؟“

”تمہاری کم عقلی پر ہنسی آرہی ہے۔“ وہ پیچھے دیکھے بغیر بولا۔ ”اُس کے باپ کو پورا اثر جانتا ہے۔ ملک ظہور اسمبلی کا ممبر رہ چکا ہے۔ رئیس کا بڑا بھائی ملک انیس ظہور آج کل تخت پر براجمان ہے۔ کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر رال ٹپکاتا ہوا پیچھے پڑ جاتا ہے اور بس نہ چلے پڑا اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ یہ رئیس بھی اپنے بھائی اور باپ پر گیا ہے۔“

وہ خشکیوں نگاہوں سے اُسے گھورنے لگی۔ دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔ پوچھنے لگی۔ ”تم اُسے جانتے ہو؟“

”جانتا ہوں، تبھی تو تمہاری کم عقلی پر ماتم کرتے ہوئے ہنس رہا تھا۔“ وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ”ملک رئیس ظہور بستی نور پور کے ملک فرید کا سگا بھتیجا ہے۔ حیرت ہے کہ آج تک اُس نے تمہیں بتلایا ہی نہیں۔“

غیر معمولی تحیر اُس کے چہرے پر ثبت تھا۔ بڑ بڑائی۔ ”مجھے بھی حیرت ہے کہ اُس نے مجھے اب تک نہیں بتلایا۔ میں یہ تو جانتی تھی کہ وہ کسی بڑے سیاسی خاندان کا فرد ہے مگر یہ علم نہیں تھا کہ وہ ملک فرید کے بھائی کا بیٹا ہے۔ پایا نے کئی مرتبہ مجھے ملک فرید کے بارے میں بتلایا تھا۔“

وہ بولا۔ ”تمہیں ان لوگوں سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تمہارے باپ کی طرح یہ بھی لہجے ہاتھوں والے لوگ ہیں۔ انسان کو کتے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ سیانے کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی دوستی بھلی ہوتی ہے نہ ہی دشمنی۔ سانپ کی طرح کسی وقت بھی ڈس سکتے ہیں۔“

رہی تھی۔ عورت کے وجود کی بھول بھلیاں میرے لئے نئی نہیں۔ جسے چاہا، اُسے جھکا لیا یا توڑ دیا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا باپ صرف اُسی لڑکی کو اپنی بہو کے طور پر قبول کرے گا جو خاندانی طور پر ہمارے ہم پلہ ہو۔“ وہ ٹہلتے ہوئے، چائے پیتے ہوئے، اُس کی طرف بار بار دیکھتے ہوئے اپنی گفتگو آگے بڑھا رہا تھا۔ خالی کپ میز پر رکھ کر دھند میں آن کھڑا ہوا۔

”شہانہ! سچ کہتا ہوں کہ پہلی مرتبہ تم میں اُس وقت دلچسپی محسوس کی جب مجھے پتہ چلا کہ تم بھی میرے قبیلے سے تعلق رکھتی ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے منزل مل گئی۔ میں نے اپنی زندگی کی آوارہ منشی کو ترک کر کے تمہاری دہلیز پر سجدہ عشق بچھا دیا۔ شروع میں تم نے مجھے اہت نہیں دی، پھر میری لگن نے تمہیں رام کر لیا۔“ وہ اُس کی طرف پشت کئے بول رہا تھا۔ ایسے میں وہ سوچنے لگی۔ ”یہ ایسے الفاظ تو نہیں ہیں کہ جن کی ادائیگی پر رُخ پھیرنا ضروری ہو۔ یونیورسٹی میں میرے روکنے کے باوجود بائیں کھول کر محبت کا اعلان کرنے لگا۔ خاندانی میں سامنے کرنے سے کترانے لگا ہے۔ دال میں کچھ کالا ہے۔“

وہ اپنی بات کو بڑھانے لگا۔ ”غلطی یہ ہوئی کہ میں نے فوری طور پر اپنے گھر والوں کو تمہارے متعلق نہیں بتایا۔ تین دن قبل میرے چچا ملک فرید برسوں کے بعد ہمارے گھر آئے۔ دونوں خاندانوں میں طویل عرصے سے شدید نوعیت کے اختلافات چلے آ رہے تھے جن کی وجہ سے ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا موقوف تھا۔ میرے باپ نے بے بھائی کو آبائی جائیداد میں حصہ دیے بغیر گھر سے نکال دیا تھا۔ بعد میں اپنی غلطی کا ادر مانگی کی کمی کا شدت سے احساس ہوا مگر اس دوران بہت سا پانی پل کے نیچے سے گزر چکا تھا۔ میرے باپ نے بارہا اپنے بھائی سے معافی مانگی، اُس کا حصہ دینے کی کوشش کی مگر چچا نہیں مانا۔ تمہیں بتاتا چلوں کہ میرا چچا ملک فرید تمہارے باپ کے انتخابی حلقے میں واقع تھے تو پورے میں رہائش پذیر ہے۔“

وہ کن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ عالمگیر نے سچ کہا تھا۔

”میرے باپ نے اپنے بھائی کا استقبال والہانہ انداز میں کیا۔ وہ اُس کی خردمیوں کو مہمان پاتا تھا۔ دوسرے دن بیچانے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ اُس کا کوئی بہت ہی قریبی دوست دل کا دورہ پڑنے سے اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ اپنے پیچھے دو بیٹیاں چھوڑ گیا تھا۔ چچا پڑا تھا کہ ایک بیٹی کو اپنے بیٹے ملک امجد سے بیاہ کر وہ اپنے گھر لے جائے۔ ایک بیٹی

رحمت بی چلی گئی تو اُس نے جلدی جلدی خود کو تیار کیا۔ لباس کی شکلیں درست کرنے ہوئے نیچے آ گئی۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہ اُس کا منتظر تھا۔ بولی۔ ”اؤ رُک کر کیسے ہو؟“

اُس کے چہرے پر واضح طور پر پریشانی کے عکس لرزاں تھے۔ بولا۔ ”خیریت ہوئی تو یوں بھاگا چلا آتا؟“

دونوں آنسنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ استفہامیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ دوسرے جھکائے کچھ دیر سوچتا رہا پھر اٹھ کر براؤنضطرار انداز میں ٹہلنے لگا۔ اُس کی حرکات و سکنات سے ذہنی انتشار اور پیش و پس مترشح تھی۔ چند لمحوں کے بعد اُس کی طرف پلٹ آیا۔ بولا۔ ”شہانہ! زندگی میں کبھی بھی اتنا مشکل وقت مجھ پر نہیں آیا کہ میری زبان میرا ساتھ چھوڑ گئی ہو، میرا ذہن اپنا کام کرنا ترک کر دیا ہو۔ پہلی مرتبہ الجھا ہوں تو پتہ چلا ہے کہ مجھے سلجھانے کا طریقہ ہی نہیں آتا۔“

اُس کے انداز پر وہ بھی پریشان ہو گئی۔ گڑبڑا کر بولی۔ ”تمہاری مایوسی بھری باتیں نہ کر میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ پلیز کھل کر بات کرو۔“

اسی سے ڈرائیور چائے اور لوازمات سے لدی ٹرائی ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ چائے تیار کر کے میز پر رکھ کر اٹھے قدموں کمرے سے نکل گیا۔ وہ کپ میں چچ بھلاتے ہوئے بولا۔ ”میں خوابوں کو اہمیت نہ دینے والا انسان ہوں۔ خاصا حقیقت پسند واقع ہوا ہوں۔ تمہیں شروع سے پوری کہانی بتلاتا ہوں۔“

شانی سمجھ رہی تھی کہ وہ خود ابھی تک کسی نتیجے تک نہیں پہنچا تھا۔ تبھی اُس کی گفتگو رہا محسوس ہو رہی تھی۔ خاموش رہ کر اُسے اظہار کیلئے الفاظ مرتب کرنے کا موقع دیتی رہی۔ ”میرا باپ ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کا اہم ترین رکن ہے۔ میرا بھائی بھی اُسی پارٹی کے ٹکٹ پر اسمبلی میں پہنچا ہے۔ ملک بھر میں پھیلی ہوئی دولت پیدا کرنے والی فیکٹریاں ہمارے خاندان کی ملکیت ہیں۔ مجھ پر میرا باپ اور بڑا بھائی جان چڑھتے ہیں جو کہتا ہوں، مان لیتے ہیں۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ انہوں نے مجھے امتحان میں ڈال دیا۔ ذرا ٹھہرو! میں اُس بات کی طرف آ رہا ہوں جو تمہیں بتانے کیلئے اس طرح ہنگامی طور پر بھاگتا چلا آیا ہوں۔ میرے گھر والوں نے مجھے اپنا جیون ساتھی چنے کی مکمل آزادی دے

وہ ہنٹ کانٹے لگی۔ چاہنے والے نے پہلی مرتبہ کچھ مانگا تھا۔ وہ انکار کرنا چاہتی تھی مگر اس کی دل آزاری کے ڈر سے خاموش رہی۔ مانگنے والا اس کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ ”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم پر کوئی آج نہیں آئے گی۔ پلیز شاہانہ! آئی لو۔۔۔۔۔“

بارہانلوں میں سننے کے باعث یہ فقرہ گھسا پٹا لگنے لگا تھا مگر رئیس کے لبوں پر بارہا کی سی ہنسی بات یوں چلی تھی کہ اس کا دل اتھل پھٹل ہو گیا۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ”اوکے! میں تمہارے ساتھ چلوں گی مگر پلیز..... بے عزت نہ کروانا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ میرا زندگی بھر کیلئے محبت پر سے اعتماد اٹھ جائے۔“

اس نے والہانہ انداز میں اسے بانہوں میں بھر لیا۔ پیشانی پر بوسہ دے کر بے کراں نٹی کا اظہار کیا، ہاتھ کی پشت کو چوم کر شکریہ ادا کیا۔ رئیس کا رد عمل عین فطری دکھائی دے رہا تھا۔ اپنی چاہت میں دیوانگی کی سرحدیں عبور کرتا ہوا اسے بہت اچھا لگا۔ وہ بے خودی ہو کر مونے میں ڈھسے لگی۔

اُسے انتظار کرنے کا کہہ کر تیار ہونے کیلئے چلی گئی۔ آدھے گھنٹے میں کئے گئے خصوصی انتظام نے اس کو خاص بنا دیا تھا۔ دیکھنے والے کی نظر ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ نزاکت سے ایک ایک زینہ اترتی سیدھی رئیس کے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ اُسے اپنی آنکھوں لالہاتے ہوئے بولا۔ ”کہا جاتا ہے کہ تاریخ کی ہر فتح کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا جگہ لگتا ہو گا فرما ہوتا ہے۔ اس بات کی آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔ آج سمجھ آ رہی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کچھ ہی جاتی رہی ہے۔ میں تمہارے تعاقب میں دوڑتے دوڑتے دنیا کو فتح کرنے کے نبیبات دل میں محسوس کر رہا ہوں۔ ویل ڈن مائی شاہانہ! تم واقعی شاہانہ ہو۔“

تقریف ہر عورت کی کم زوری ہوتی ہے۔ مرد اپنا ہر ظلم تعریف کے دو بولوں کی پڑیا میں لپیٹ کر دور پھینک سکتا ہے۔

پورے آئی تو کچھ سوچ کر ٹھٹھک گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ کوئی بہت بڑی غلطی کرنے لگا ہو۔ غلطی بکڑی نہیں جاری تھی۔ ایسے میں عالمگیر اس کے قریب چلا آیا۔ اُسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کہیں جا رہی ہو مس شاہانہ؟“

ایسا کہ اپنی غلطی پکڑ کر مسکرانے لگی۔ وہ جلدی میں بغیر روٹو کوئل اور حفاظت کے گھر سے

عروسی جوڑا پہن کر ہمارے گھر میں آئے۔ وہ کہہ کر گیا ہے کہ دونوں بیٹیوں میں ایک کا انتخاب کر کے بہو بنالو، دوسری کو میں اپنے گھر لے جاؤں گا۔“

وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔ اُسے شانے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑتے ہوئے بولی۔ ”جب تک تم میری جانب منہ کر کے نہیں بولو گے، میں یقین نہیں کروں گی۔ مسئلہ فرید کو جانتی ہو، اس کے مرحوم دوست چوہدری باسط کو بھی جانتی ہوں اور چوہدری کی بیٹیوں بتول اور زرینہ سے متعارف بھی ہوں۔ دونوں بہت اچھی ہیں۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟“

وہ غیر یقینی انداز میں اُسے دیکھنے لگا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ میں اُن میں سے کی ایک سے شادی کر لوں؟“

”ہاں! اس میں اچھنبھے کی کیا بات ہے؟“ وہ بولی۔

”شاہانہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارے سوا کسی لڑکی کو اپنی زندگی میں دلہن نہ کر داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا باپ اپنے کھوئے ہوئے بھائی کی بازیابی پر اتنا خوش اور پُر جوش ہے کہ میری بات پر دھیان ہی نہیں دے رہا۔ وہ کی صورت میں بھی گھر چل کر آنے والے بھائی کو انکار نہیں کرے گا۔ مجھے غلطی نہیں ہوئی کہ میں نے انہیں مناسب وقت دیکھ کر بتلا نہیں پایا کہ میں نے اپنے لئے شریک جات چن لی ہے۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے شاہانہ!“

وہ حیرت آمیز نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ ”میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟“ وہ اُس کو دونوں شانوں سے پکڑ کر ملتیانہ انداز میں بولا۔ ”تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میں تمہیں اپنی فیملی سے ملوانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری من موہنی صورت کو دیکھ کر وہ سب اپنا ارادہ بدل لیں گے۔“

”اگر میں انہیں متاثر نہ کر پاتی تو؟“

”مجھے یقین ہے کہ تمہیں دیکھ کر.....“

وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے یقین کو آزماتے ہوئے میں اپنی خاندانی نجابت کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔“

”میرے لئے بھی؟“

نکلنے لگی تھی۔ بولی۔ ”ہاں! میں رئیس کے گھر تک جا رہی ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔“
رئیس اپنی گاڑی میں آیا تھا۔ دروازہ کھول کر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”سر! گاڑی میں تمہارے پیچھے پیچھے آ رہی ہوں۔ تم چلو!“

عالمگیر نے گاڑی اسٹارٹ کر کے رئیس کے تعاقب میں ڈال لی۔ راستے میں پوچھ کر ”اچانک رئیس کے محل میں جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“
وہ بولی۔ ”وہ مجھے اپنے گھر والوں سے ملوانا چاہتا ہے۔“
”کیوں؟“

”یہ میں نہیں جانتی۔“
وہ اُس کے احقانہ جواب پر ہنسنے لگا۔ وہ بولی۔ ”میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے تمہیں؟“
وہ بولا۔ ”لطیفے سے بھی زیادہ مضحکہ خیز جواب دیا ہے تم نے۔“
وہ بات بناتے ہوئے بولی۔ ”رئیس کی بہن مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ اُس نے بار بار پوچھا۔ اُس سے ملنے کیلئے جا رہی ہوں۔“

وہ پھر ہنسنے لگا۔
”اب کیا ہے؟“ وہ زچ ہو کر بولی۔
”رئیس کی تو کوئی بہن ہی نہیں ہے۔“ وہ بدستور ہنسنے ہوئے بولا۔ ”لو کیاں! چاہنے والے کیلئے جھوٹ بولتی ہیں۔ اُس چیز کو چھپانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں جو ان کا چھپ نہیں سکی۔“
وہ شرمسار ہو کر خاموش ہو گئی۔ خاموشی میں ہی عافیت تھی۔ ایک جھوٹ پر پردہ ڈالنے کیلئے دوسرا جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ عالمگیر کے سامنے جھوٹ بول کر وہ زبان کی نوک پکڑی جاتی تھی۔

شہر کے مضافاتی علاقے میں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی کاریں ایک عمل نما کوشی کے بنے آن رکیں۔ ہارن بجانے پر باوردی چوکیدار نے بغلی گیٹ کھولا۔ سلام کیا اور گیٹ کی کوٹھڑی میں گھس گیا۔ چند لمحوں کے بعد خود کار گیٹ کھل گیا۔
عالمگیر نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اُترتی شاہانہ کافرٹ سیٹ پر دھرا ہوا ہاتھ خانہ راز دارانہ انداز میں بولا۔ ”تم سردار فضل خان کی اکلوتی بیٹی شاہانہ ہو۔ تخت پر بیٹھی

انچہ گر پڑو گی تو پاؤں میں روندنے کے لائق بھی نہ رہو گی۔ میں اگر چاہتا تو شاہانہ رہو گی۔ نیچے گر پڑو گی تو پاؤں میں روندنے کے لائق بھی نہ رہو گی۔ میں اگر چاہتا تو تمہیں یہاں تک بھی نہ آنے دیتا۔ اب آگئی ہو تو یہ دھیان رکھنا کہ میں تم پر اٹھنے والی انگلی کو کاٹ بیٹھنے کا جذبہ اور اجازت رکھتا ہوں۔ تم میرا نمبر میموری سے نکال کر سکریں پر سٹینڈ بانی رکھو۔ ضرورت پڑنے پر کال ملانے والا مٹن پش کر دینا۔“
اُس نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔ اُس کے چہرے پر نظریں جمائے عجیب سے انداز میں بیٹھی رہی۔ اُس کے ہر لفظ کی معنویت کو بخوبی سمجھ رہی تھی۔ ہولے سے بولی۔ ”او۔ کے! میں خیال رکھوں گی۔“

اُتر کر رئیس کی طرف بڑھ گئی جو کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر دونوں کوشی میں داخل ہو کر عالمگیر کی نگاہوں سے ادھل ہو گئے۔ ایک ملازم نے کار کے قریب آ کر اسے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھنے کی درخواست کی مگر اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔“
دو دو گھنٹوں کے بعد جب کوشی سے رئیس کی معیت میں برآمد ہوئی تو خاصی پر جوش اور فوٹ تھی۔ کار میں بیٹھ کر رئیس کو ہاتھ لہرا کر بائے کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تمہاری بات مان کر تم پر احسان کیا ہے۔ کبھی مجھے ضرورت پڑی تو تم بھی مجھ پر احسان کرو گے۔“
وہ سکرانے لگا۔
عالمگیر نے کوشی سے نکلنے کے بعد اُسے مخاطب کیا۔ ”مس شاہانہ! رئیس اس وقت اپنے گھر والوں سے تمہارے بارے میں کمٹنس طلب کر رہا ہوگا کہ شاہانہ کیسی لگی۔ میں بھی پوچھتا ہوں کہ تمہیں رئیس کے گھر والے کیسے لگے؟“
وہ جھینپ کر بولی۔ ”بہت پیار کرنے والے دکھائی دیے۔“
وہ نہیں جانتی تھی کہ انسان کو بدلے ہوئے دیر نہیں لگتی۔
عالمگیر نے واپسی پر راستہ بدلا تو وہ بولی۔ ”انتالہبا چکر کاٹنے پر بہت دیر ہو جائے گی۔“
وہ بولا۔ ”کوئی بڑا آدمی ادھر سے گزرنے والا ہے۔ اُسے لائن کلیئر دینے کیلئے ٹریفک جام ہو رہا ہے۔“
وہ مطمئن ہو گئی۔ مختلف راستوں سے گزرتا ہوا ایک ہاؤسنگ کالونی میں سے گزر رہا تھا کہ اچانک گاڑی گھر گھر کر جھٹکے لینے لگی۔ اُس نے کار روک دی۔ بڑبڑایا۔ ”یہ کس مقام پہ

”یہ ملک انیس ظہور کی کوٹھی ہے۔“ چوکیدار نے کہا۔

”شاہانہ کو حیرت کا جھکا سا لگا۔ جلدی سے بولی۔“ وہی ملک انیس جو ملک ظہور کے بیٹے

ہیں؟“

”جی پیگم صاحب!“ چوکیدار نے جواب دیا۔

ہالگیر نے مزید دریافت کیا۔ ”ملک صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”نہیں..... وہ کبھی کبھار یہاں آتے ہیں۔ یہ کوٹھی زیادہ تر باہر سے آنے والے

مہمانوں کی رہائش کیلئے استعمال ہوتی ہے۔“ وائچ مین نے بتایا اور چھوٹا گیٹ بند کر دیا۔

دونوں اپنی کار کی طرف بڑھ گئے۔ ہالگیر چند منٹ انجن سے سرکھپا تا رہا۔ پھر مطمئن

ہو کر گاڑی میں آ بیٹھا۔ بیک مرر میں شاہانہ کو دیکھا۔ وہ ابھی تک کوٹھی کو بغور دیکھے جا رہی

تھی۔ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی۔ ”مگر میں تو یہاں کبھی بھی نہیں آئی پھر یہ گھر دیکھا

دیکھا کیوں لگتا ہے؟“

ہالگیر نے گاڑی بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس سے ملتی جلتی کسی کوٹھی میں

نہارا جانے کا اتفاق ہوا ہو۔“

وہ کندھے اچکا کر باہر دیکھنے لگی۔ دل میں گرہ پڑ چکی تھی۔ سارے راستے سوچتی رہی۔

کرے میں پہنچی تو بھی کوٹھی کا فرنٹ ویو اس کی چشم تصور میں چپکا ہوا تھا۔ کچھ یاد نہ آنے پر

جنملا کرٹی وی آن کرنے لگی۔ سکرین آن ہوئی تو جیسے دماغ میں الگ سے کوئی سکرین

آن ہو گئی ہو۔ اُسے یاد آ گیا کہ اُس کوٹھی کو اُس نے کہاں اور کیسے دیکھا تھا۔ رگوں کا خون

نہر کر اس کے چہرے میں اکٹھا ہو گیا۔

بیانی انداز میں انٹھی۔ ایک مخصوص وقت پر ہمیشہ کیلئے ٹھہری ہوئی ڈسک کو پلیئر میں لگا

کر دیکھنے لگی۔ وڈیو ڈسک کو کبھی ریورس نہیں کرنا پڑتا۔ ہمیشہ شروع منظر سے چلتی ہے۔

شروعاتی منظر میں وہی کوٹھی ایسیوینس کی جتی کی طرح اُس کی نظروں میں گھومنے لگی۔ اُس

سے باہر ریورس کر کے کوٹھی کے فرنٹ ایلی ویشن کو دیکھا۔ اُسے آنے والے پانچ دس

منٹوں میں ہی یقین ہو گیا کہ اسی کوٹھی میں اُسے بے ہوش حالت میں لے جایا گیا تھا اور

بیشک کیلئے کھلا کر دیا گیا تھا۔

اب اُسے فون کرنے والے کے الفاظ کی معنویت بھی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ میرا

سوچھی تجھے پھرنے کی.....“

وہ پریشان ہو گئی۔ کار کے باہر شام ڈھل رہی تھی، کار کے اندر رات کا پچھلا پیر روز

اور آسمان کے افقی اتصال سے سورج کے سر نکالنے کا انتظار کر رہا تھا۔ زندگی میں پہلی

اُسے کوفت سے واسطہ پڑا تھا۔ گاڑی اس سے پہلے کبھی راستے میں خراب نہیں ہوئی تھی۔

قسمت باہر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”اے خوش اندام! تیرے ہر قدم پر خوشیوں کو بھرنے

کرنے والی میں ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ قسمت خراب ہو جائے تو ہر کام خراب ہو سکتا

ہے۔ تم بھی ایسا ہی سوچ رہی ہو۔ تمہیں ہرگز پتہ نہیں ہے کہ میں قہر بار نہیں، مہربان

کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ تمہارے خوابوں میں چھپی خرابیاں دکھانے کیلئے آئی ہوں۔

نیچے اتر اور کھلی آنکھوں سے وہ کچھ دیکھ جو تمہیں عشق کے اندھے پن میں دکھائی نہیں دیتا۔

ہالگیر اتر کر کار کا بونٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی اتر آئی۔ کھڑے ہو کر اطراف

کوٹھیوں کی آؤٹ لک کا جائزہ لینے لگی۔ اچانک چونک پڑی۔ سامنے والی کوٹھی کا فرنٹ

ایلیویشن دیکھا بھالا لگ رہا تھا۔ سوچنے لگی۔ ”میں آج تک اس علاقے میں نہیں آئی، مگر

گھر دیکھا بھالا کیوں لگ رہا ہے؟“

دماغ نے توجیہ پیش کی۔ ”ایک جیسے ایلی ویشن والی ان گنت کوٹھیاں شہر میں

ہیں۔ یہ پریشانی والی بات نہیں ہے۔“

دل مطمئن نہیں ہوا۔ ہالگیر کے پاس آ کر بولی۔ ”یوں لگتا ہے جیسے میں اس کوٹھی میں

آچکی ہوں۔ حالانکہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس ہاؤسنگ کالونی میں کبھی آنے کا اتفاق ہوا ہو۔“

وہ بھی اُس کوٹھی کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر عام سے لہجے میں بولا۔ ”اس میں پریشان

ہونے والی کیا بات ہے؟ اگر خود کو مطمئن کرنا چاہتی ہو تو بیل دے کر وائچ مین سے دریافت

کر لو کہ یہ کس کا گھر ہے۔“

وہ ہچکچانے لگی تو اُس نے شاہانہ کا بازو پکڑا اور کوٹھی کے سیاہ گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

بولا۔ ”تجسس کو ہوا دینے کی بجائے ختم کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔“

کال بیل کا بٹن پیش کر کے دونوں انتظار کرنے لگے۔ وائچ مین کا چہرہ چھوٹے

میں سے جھانکتا دکھائی دیا۔ مستفسرانہ لہجے میں بولا۔ ”جی صاحب! کس سے ملنا ہے؟“

ہالگیر بولا۔ ”بھائی صاحب! یہ گھر کس کا ہے؟“

ملک..... لمبے ہاتھ.....

وہ سر تھام کر گھٹی گھٹی آواز میں چیخنے لگی۔ ”ہائے اللہ! میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ کس نے کیا ہے؟ کیوں ہر لمحہ مجھ پر موت آگئیں زہر کی طرح ٹپکنے لگا ہے؟..... وہ کوٹھی ملک انیس کی ہے۔ مجھے وہاں لے جا کر اتھاہ پستیوں میں پھینک دیا گیا۔ رئیس مجھے اپنے گھر والوں کی آنکھوں پر بیٹھانے کیلئے لے گیا۔ کون کیا چاہتا ہے؟“

ہر آن رئیس کی طرف لپکنے والے دل میں بدگمانیاں بھر گئیں۔ دل دھڑک کر سمجھانے لگا۔ ”تم دوسری لڑکیوں سے مختلف ہو۔ تمہیں فتح کرنے کا طریقہ بھی تو دوسروں سے مختلف ہی ہوگا۔ رئیس نے تمہاری نزکیت کو زینہ بنایا اور ایک ایک قدم اٹھا کر تمہارے بدن کی عمارت کو تاراج کر دیا۔ تم اپنی بے وقوفی میں ٹٹ چکی ہو۔“

بے بسی حد سے تجاوز کر جائے تو آنکھوں کے راستے رسنے لگتی ہے۔ وہ ہچکیاں لینے لگی۔ ہچکیوں کی تال پر پورا جسم دھڑکنے لگا۔

دوسری طرف عالمگیر اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ ”ہر مرد اپنی محبوبہ کو خوش آسودہ رکھنا چاہتا ہے، میں کیسا مرد ہوں کہ جسے چاہتا ہوں، اُسے ہر لمحے نئی مصیبت کے منہ میں ٹھونس دیتا ہوں۔ رئیس کے گھر سے خوشیوں کے پھولوں بھرے ٹوکے سر پر اٹھا کر نکلنے والی لڑکی نے اپنے ہاتھوں سے ہی ٹوکے کو ملک انیس کی کوٹھی کے گیٹ پر پھینک کر پھولوں کو پیروں تلے مسل دیا ہے۔“



ملک ابجد فرید ایک ماہ کی رخصت لے کر نور پور پہنچا تو اُسے پہلا جھٹکا لگا جب بتایا گیا کہ اُس کا باپ اپنے بھائی سے ملنے لاہور گیا ہے۔ اُس نے بھائی سے پوچھا۔ ”کیا چچا ظہور کی فیملی لاہور والی کوٹھی میں شفٹ ہو چکی ہے؟“

”دو تین سال سے لاہور میں ہی مقیم ہیں۔“

”ہوں!“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ توقف کے بعد مستفسر ہوا۔ ”یہ اباجی کو بیٹھے بیٹھائے اٹل کے گھر جانے کا خیال کیونکر آ گیا؟ جب اٹل یہاں آتے تھے تو وہ ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اب کیا ہو گیا ہے؟“

بھائی نے بتلایا۔ ”اباجی آج کل چوہدری باسط کی بیٹیوں کے رشتوں کیلئے پریشان ہیں۔ تم اُن کی فکر چھوڑو، اپنی فکر کرو۔ تم پر نزلہ گرنے والا ہے۔ اباجی کا خیال ہے کہ چوہدری باسط کی ایک بیٹی کو تمہارے سر پر سوار کر دیا جائے۔ ایک کورئیس کی دلہن بنا دیا جائے۔ آزادی کا تم نے کافی لطف اٹھالیا ہے۔ زمانے کے مسائل بناتے پھرتے ہو، ہم نے سوچا ہے کہ ازدواجی کس بنانے کیلئے گھر میں پکھری لگائے بیٹھے بہت اچھے لگو گے۔“

وہ حیرت زدہ ہو گیا۔ استعجاب آمیز لہجے میں بولا۔ ”عجیب بات ہے کہ اباجی نے مجھ سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ میری شادی میری مرضی سے ہونی چاہیے۔“

بھائی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تمہیں جلتے دقت بھی تم سے مشورہ کرتے؟ تمہیں سکول میں داخل کرانے سے پہلے تم سے مشورہ طلب کرتے؟ تم پر کھینچن نچھاور کرتے ہوئے، تم پر لاکھوں کروڑوں کی انویسٹ منٹ کرتے ہوئے بھی تم سے پوچھتے کہ میاں بتلاؤ! سول جج تم نے بننا ہے، کیا تمہاری مرضی ہے؟ اگر صاحب بہادر کی خواہش ہوتی تو پیار کیا جاتا، تم پر کروڑوں روپے خرچ کئے جاتے در نہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا جاتا۔ ہے ناں؟“

بھائی کے استہزاء پہ لہجے اور فقروں نے اُسے شرمسار کر دیا۔ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ بھائی ٹھیک کہتا تھا۔ آج تک گھر میں اُس کے باپ کے حکم پر آنکھیں بند کر کے عمل درآمد کیا ہے۔ رہا تھا۔ کبھی اختلافی صورت حال سامنے نہیں آئی تھی اور نہ ہی ایسا ہوا تھا کہ باپ نے کوئی غلط فیصلہ اُن کے سر پر مسلط کر دیا ہو۔ محبت کرنے والوں کے غلط فیصلوں پر بھی سر جھکانے میں کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔

سردست خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ پا کر ہٹ گیا۔ چوہدری باسط کے ڈیرے کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”یہ مجھے کس امتحان میں ڈال دیا گیا ہے؟ میں نے اُسے دیکر پہلی نظر میں پسند کر لیا تھا۔ اُس نے اپنا آپ دکھا کر مجھے پرے ہٹا دیا ہے۔ کاش! اُس نے مجھ پر ایسا اعتماد نہ کیا ہوتا تو میں اُن دیکھی کبھی آسانی سے نگل لیتا۔“

وہ پڑھا لکھا تھا۔ باشعور تھا۔ قانون کی تعلیم اُسے یاد دلانے لگی۔ ”تمہیں یہی پڑھایا ہے کہ عورت قابلِ احترام ہوتی ہے۔ وہ بھی احترام کی حقدار ہے، چاہے جانے کے لائق ہے۔ اُس پر ظلم کا پہاڑ توڑا گیا ہے۔ اُس کی مرضی شامل ہونے کی صورت میں اُس پر دم عائد کیا جاسکتا تھا۔ بے قصور ہونے کی صورت میں اُسے کوئی سزا نہیں دی جاسکتی۔“ یہ تو سب ٹھیک تھا مگر اُن ترن پہننے کو جی نہیں مان رہا تھا۔ بے نام غیرت پہلو میں کچکے لگانے کیلئے بیٹھ گئی تھی۔

اُس کی جانب سفر کر رہا تھا۔ دور ہونے کیلئے مزاحمت بھی کر رہا تھا۔ ڈیرے پر پہنچا کر ہارن بجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”یہ کیا ہے؟ میں جس سے دور ہونا چاہتا ہوں، اُس نے مجھے اپنی جانب کھینچ لیا ہے۔ کہیں مجھے محبت تو نہیں ہوگئی؟“

دل کی کنگش کو چھپائے اُس کے سامنے بیٹھا تو پھر آپوں آپ ہی فیصلہ ہوگا۔ اُس کے چہرے کی سوال کتنا معصومیت نے اُسے کنارے لگاتے ہوئے کہہ دیا۔ ”میں بے قصور ہوں۔ ایک باحیا عورت ہونے کے ناتے چاہے جانے کی خواہش رکھتی ہوں۔ اگر تم اپنے وجود کی گرائی کی اپنے منہ سے خبر نہ دیتی تو کیا میں کچھ اور دکھائی دیتی؟ کوئی بن بنائے بوجھ سکتا ہے کیا؟ مجھے پاکیزہ سمجھ کر دیکھو تو اب بھی میں دنیا میں سب سے بڑھ کر خوبصورت دکھائی دے سکتی ہوں۔ میرا حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں رچا ہوا ہے۔“ وہ آنکھیں چرانے لگا۔ وہ بولی۔ ”سر! آپ نے گزرے دنوں میں میرے لے

کچھ کیا؟“

وہ بولا۔ ”ہاں! میں نے ویگن ٹریس کی ہے۔ وہ لاہور کے ایک ارہن روٹ پر چلتی ہے۔ وہ گزشتہ تین چار ماہ کے دوران شہر سے باہر نہیں لے جانی گئی۔ میں تمہیں لینے کیلئے آیا ہوں۔ شہر چلتے ہیں۔ جن راستوں کی نشاندہی کرو گی، انہی راستوں پر چل کر مذکورہ کوشی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی مضبوط سراغ مل جائے۔“ وہ بولی۔ ”زری کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اُسے کچھ یاد رہا ہو۔“

اُس نے کندھے اُچکا کر کہا۔ ”ایز نو وٹ!“

اماں سے اجازت لے کر تینوں شہر کی جانب عازم سفر ہوئے۔ دوپہر تک سڑکوں کی آوارہ گردی کرنے اور مختلف رہائشی کالونیوں کی خاک چھاننے کے بعد بتول نے مایوسی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں راستہ پوری طرح بھول چکی ہوں۔ زری کا بھی یہی حال ہے۔“

دوپہر سر پر آچکی تھی۔ وہ واپسی کا ارادہ کر رہی رہے تھے کہ امجد کے فون پر اُس کے بھائی کی کال آگئی۔ اُس نے موبائل آن کرتے ہوئے پوچھا۔ ”جی بھائی! خبریت تو ہے نا؟“ دوسری طرف کی بات سننے کے بعد فون بند کرتے ہوئے بولا۔ ”بھائی نے ایک کام میرے ذمہ لگا دیا ہے۔ ہمارے شہر والے گھر میں کچھ پیسٹی سائیڈ ز پڑی ہیں، وہ اٹھا کر نور پور لے جانی ہیں۔ تھوڑی سی دیر لگے گی۔“

تھکی ماندی دونوں بہنوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بتول آنکھیں موند کر سستانے لگی۔ گاڑی رکنے پر اُس نے شیشے کے پار امجد کی کوشی کی طرف دیکھا تو یوں لگا جیسے کسی نے تیز دھار آلے سے اُس کا پہلو کاٹ کے رکھ دیا ہو۔ زرینہ عام سی نگاہوں سے کوشی کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے وہ قیامت انگیز فلم نہیں دیکھی تھی۔ اگر دیکھی ہوتی تو اُس کی کیفیت بھی کسی طور پر بتول سے مختلف نہ ہوتی۔

امجد گاڑی سے اتر کر کوشی کے اندر چلا گیا تھا۔ اُس کے آنے تک وہ بیٹھی بیٹھی نگاہوں سے سڑک پر سے نظر آنے والی بالائی منزل کو دیکھ رہی تھی۔ وہی کارڈور، اُسی رنگ کی دیوار، وہی دروازہ..... سب کچھ وہی تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر کوشی کے اندر گھس گئی۔ اُس کی ہانکوں میں واضح طور پر کپکپاہٹ محسوس کی جاسکتی تھی۔

خونگی داخلی برآمدے میں پہنچی، اندر سے امجد ایک بڑا سا شاپنگ بیگ اٹھائے برآمد

سوچنے لگا۔ ”آج تک کسی لڑکی کو ہانہوں پر اٹھایا نہیں۔ آج پتہ چلا کہ جوان بدن آگ کی طرح دکھتا رہتا ہے خواہ خوابیدہ ہو یا بے حواس۔ چند لمحے خالی الذہنی کی کیفیت میں پڑ کر کھڑا رہا۔ پھر اُسے لے کر مسہری تک آیا۔ وہ اتنی بھی بھاری بھر کم نہیں تھی کہ تین چار قدم اٹھانے پر سانس پھول جاتا مگر خاصا خوش جسامت ہونے کے باوجود سینہ دھونکی کی طرح اوپر نیچے ہونے لگا۔ چند ثانیے تک اپنا سانس قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ بھول گیا کہ جب تک بے سدھ پڑی ہوئی لڑکی کے بولتے ہوئے اعضاء کو دیکھتا رہے گا، جب تک اپنی سدھ گنوا تا رہے گا۔ گھبرا کر پلٹا اور سر جھٹکنے لگا۔

اُس کے وجود سے نظریں چڑا کر بھاگا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آیا۔ کٹھی میں موجود اکوٹے ملازم کو فوری طور پر ڈاکٹر کو لانے کا حکم دیتے ہوئے بھاگ کر گیٹ پر کھڑی گاڑی تک پہنچا۔ زرینہ کو لے کر واپس کمرے میں آ گیا۔ جب اُس نے اپنی بہن کو بے ہوش پڑے دیکھا تو گھبرا کر امجد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ”یہ اس کمرے کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئی ہے۔ مجھے کہہ رہی تھی کہ اغوا کرنے والوں نے تم دونوں کو یہاں جیوں رکھا تھا۔ تم کیا کہتی ہو؟“

وہ اپنی بہن کے قریب بیٹھ کر اُس کا سراپنی گود میں رکھتے ہوئے گال تھپتھپانے لگی۔ یوں لگا جیسے اُس نے امجد کی بات سنی ہی نہیں۔ نبض اور دھڑکن چیک کرنے کے بعد نوکائی کے سے انداز میں بولی۔ ”باجی آج تک کبھی بھی ایسے بے ہوش نہیں ہوئی۔“

کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑانے لگی۔ کبھی شناسائی کی لہر آنکھوں میں دوڑ جاتی، کبھی بے یقینی بھر جاتی۔ اچانک کمرے کی نکل پر نگاہ ڈالتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔ ”نہیں..... یہ وہ کمرہ نہیں ہے۔ اس میں موجود فرنیچر اُس فرنیچر سے ملتا جلتا ضرور ہے مگر تینا یہ وہ کمرہ نہیں ہے۔“

”پانی کا ایک گلاس بھر لایا۔ بتول کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ زرینہ آوازیں دیتے ہوئے گال تھپتھپانے لگی۔ ایسے میں اُس نے زرینہ سے دریافت کیا۔ ”تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ وہ کمرہ نہیں ہے؟“

”بولی۔“ مجھے اُس نکل میں چار پانی کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ دیوار کی جڑ میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ فرش سے بالشت بھرا پردیوار میں ایک بجلی کا بورڈ نصب تھا۔“ پھر نفی میں سر

ہوا۔ اُسے دیکھ کر حیرت اور استعجاب بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”میں اپنا منزل دیکھنا چاہتی ہوں۔“

اُس نے غور سے دیکھا۔ کافی بدلی بدلی دکھائی دے رہی تھی۔ بولا۔ ”بتول! امجد پریشان دکھائی دے رہی ہو، خیریت تو ہے ناں؟“

وہ کچھ نہیں بولی بلکہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر جانے لگی۔ وہ شاپنگ بیک واکر تیز تیز قدم اٹھاتا اُس کے برابر میں پہنچ گیا۔ سڑک پر سے دکھائی دینے والے کمرے میں آئی۔ دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ وہی منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ امجد اُس کے پہلو سے نکل کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف اور رعب کے تاثرات کو بھانپ کر پوچھنے لگا۔ ”کیا بات ہے بتول؟“

وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ پھر کبھی کمرے کے وسط میں جی ہوئی مسہری کو دیکھنے لگی۔ امجد کو دیکھتی۔ دروازے کی اتنی چوکھٹ کو تھا سے سرکتی ہوئی دیوار کی جڑ میں ڈھیر ہو گئی۔ اُس کے وجود نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں جیسے پتھر سی گئی تھیں۔ اُٹا سہارا دینے والے کے سینے پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”تم..... تم نے ہی مجھے اغوا کر لیا نا امجد..... اسی کمرے میں مجھے اور میری بہن کو اغوا کر کے کئی گھنٹے رکھا گیا تھا۔ ہائے الہ! زخم لگانے والے سے ہی مرہم طلب کرتی رہی۔“

وہ ہونفتوں کی طرح اُسے دیکھ رہا تھا۔ بتول کی حالت زار اور باتیں اُس کی کچھ نا آ کر بھی نہیں آئی تھیں۔ اُسے جھنجھوڑ کر بولا۔ ”بتول! ہوش میں آؤ۔ یہ کیا بے ہودگی ہے؟“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اب ہی تو ہوش میں آئی ہوں۔ تمہارے کارندوں نے تمہارے یا تمہارے بھائی کے کہنے پر ہی مجھے اغوا کیا تھا۔ میں احمقوں کی طرح تجھے کیلئے پکار بیٹھی۔ چھوڑ دو میرے ہاتھ۔ یہ تمہارے گناہ میں لتھڑے ہوئے ہیں۔“

وہ خوف اور دکھ کے آخری زینے پر قدم رکھ کر جھپٹ لگی۔ اُس کا بدن بے ترتیب انداز میں فرش پر بکھر گیا۔ کئی ساعتیں وہ ہونفتوں کی طرح اُس کو دیکھتا رہا۔ سنبھلا تو اُسے سنبھالنے کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ اُسے اٹھانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ دھان پان سی دکھائی دینے والے کا بے اعصاب بدن خاصا بھاری ہو گیا تھا۔ دونوں ہانہوں میں بھر کر اٹھایا تو سنبھالنے کی بجائے خود بے خود ہونے لگا۔

اس سے منسلک کرنے کے بعد اپنی الماری سے فلم نکال لائی۔ ڈسک پلیئر کی ٹرے میں رکھ کر ان کی طرف مڑی۔ ”فلم کے آغازی دو تین منٹ میں کوٹھی کا فرنٹ دیو دیا گیا ہے۔ میں فلم وہیں تک چلاؤں گی۔“

فلم چل پڑی۔ دونوں انتہاک سے سکرین پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ ایک منٹ میں ہی فیصلہ ہو گیا۔ امجد بے استعجاب لہجے میں بولا۔ ”واقعی! یہ تو ہماری کوٹھی ہے۔“

بتول پلیئر آف کرنے ہی لگی تھی کہ سکرین پر دروازے میں گھنے والے سفید کپڑوں میں لباس شخص کی بیٹھ دکھائی دی۔ امجد بے اختیار چیخ اٹھا۔ ”یہ تو بڑے بھائی ہیں۔ کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔“

کسی کو بیٹھ سے دیکھ کر پہچان لینے کی طاقت صرف بھائی یا بہت ہی قریبی شخص رکھتا ہے۔ بتول ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ ”دیکھا! میں نہ کہتی تھی کہ بالکل یہی کوٹھی ہے جہاں ہمیں رکھا گیا تھا۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے پلیئر آف کر دیا۔ امجد گہری سوچ میں پڑ گیا۔

زرینہ نے کہا۔ ”باجی! جس کمرے میں ہمیں رکھا گیا تھا اس میں تمہارے بائیں ہاتھ پراچینڈ ہاتھ روم کا دروازہ تھا۔ ہم دونوں باہر چل کر بیٹھے ہیں، تم فلم دیکھو۔ اس نشانی کو دیکھو۔ یہ ذہن میں رکھنا کہ دروازہ بالکل برابر تھا۔ اس پر کوئی ڈیزائن نہیں بنا ہوا تھا۔“

امجد نے ستائشی نظروں سے زرینہ کو دیکھا۔ اتنے کڑے حالات میں بھی اس نے کمرے کی بناوٹ کو بے نظر غور دیکھا تھا اور بڑی بات یہ تھی کہ اتنے دن گزرنے کے بعد پوری طرح یاد بھی رکھا تھا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔ صحن کے وسط میں سمجھی چار پانی پر بیٹھ کر امجد نے انجکپاتے ہوئے کہا۔ ”بہنہ! اگر ممکن ہو تو مجھے جائے پلاؤ۔ تمہاری باجی نے میرے دماغ کی چولیس ہلا کر رکھ دی ہیں۔“

”وہ آزر دگی سے مسکراتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ نہایت غیر متوقع صورت حال سے واسطہ پڑا تھا۔ زرینہ ہائے کے تین کپ ٹرے میں رکھے کچن سے نکلی، بتول اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر دروازے کے پتوں سے کھڑی ہو گئی۔ دونوں نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ فرط غم و غصہ سے سرخ تھا۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”زری درست کہتی ہے۔ مجھے ماننا

ہلاتے ہوئے بولی۔ ”یہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔“

بتول نے آنکھیں کھول دیں۔ خالی الذہنی کیفیت میں دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ زرینہ کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں بتول کمرے کے بارے میں فیصلہ کر لے۔ دس منٹ کے بعد ادھیڑ عمر ڈاکٹر کی عیادت میں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ پوری طرح اپنے حواس میں تھی مگر ابھی تک شاید اس نے زرینہ کے موقف کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے پیشہ وارانہ انداز میں اس کی چیک اپ کیا۔ تسلی دینے کے سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”فکر کی کوئی بات نہیں۔ چند ٹیبلٹ دے رہا ہوں، بہتر یہی ہوگا کہ دودھ یا ملک شیک وغیرہ کے ساتھ انہیں لے دیجئے۔ کچھ ہی دیر میں بالکل نارمل ہو جائیں گی۔“

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ بیڈ پر اس کی پانکٹی کی طرف سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ آہنگی بولا۔ ”مجھے تمہاری اس کیفیت نے دکھ دیا ہے۔“

وہ کچھ نہیں بولی۔ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر سر جھکا کر انگلیاں جٹا لگی۔ اس کے اندر اضطراب یوں پھیلا تھا کہ سب کچھ جلا کر خاکستر کر گیا تھا۔ بیڈ اترتے ہوئے بولی۔ ”کافی دیر ہو چکی ہے۔ ہمیں چلنا چاہیے۔ میں چاہوں گی کہ آپ میرے ساتھ چل کر وہ فلم دیکھ لیں۔ کمرہ وہ نہیں ہے، میں مانتی ہوں مگر یہ کوٹھی وہی ہے۔ فلم دیکھ کر آپ کو بھی ماننا پڑے گا۔“

وہ کندھے اچکا کر بولا۔ ”وائی ناٹ! میں خود بھی چاہتا ہوں۔“

تینوں کمرے سے باہر آئے۔ بتول نے کاریڈور کے تینوں کمروں میں جا کر دیکھا۔ میسریموں کے پاس رک کر اسی کمرے کی جانب دیکھتی رہی جہاں چند منٹ قبل بیٹھی تھی۔ ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ بری طرح ذہنی انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔

کار میں بیٹھنے سے پہلے وہ کوٹھی کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ کسی کو بالخصوص غائب کئے بغیر بولی۔ ”کوٹھی کا دیوار اچھی طرح دیکھ لیں۔“

دونوں نے اس کے کہنے پر غور سے کوٹھی کو دیکھا پھر سر ہلا کر کار میں بیٹھ گئے۔ بتول نے اپنے بیڈ روم میں دونوں کو بیٹھانے کے بعد پلیئر آن کیا۔ ٹی وی کی تاریکی

سچا ہی نہیں تھا۔ دل میں سوچنے لگی۔ ”میں بڑی ہوں، زری چھوٹی ہے۔ اتنا بڑا خدشہ اُس کے ذہن میں سانپ کی طرح لہرا گیا، میری گلوڑی عقل میں کچھ نہ آیا۔ ہائے! اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا؟“

ابھی کچھ نہیں ہوا تھا مگر دل انجانے ڈر سے بری طرح کانپنے لگا۔ چہرے پر پیلاہٹ ماری ہو گئی۔ زری چونکہ اُس کی طرف پیٹھ کئے کھڑی تھی، ایسی بات کہتے ہوئے اُسے اخلاقی طور پر بڑی بہن کا سامنا کرنے کی جرات نہ ہوئی تھی مگر اتنا اور اک ضرور رکھتی تھی کہ باجی کی طویل خاموشی درد کا نہ جھپٹا جاسکے والا سفر بن گئی ہے۔ سر جھکا کر بولی۔ ”مجھے یقین ہے کہ اللہ ہمیں کسی اور امتحان میں نہیں ڈالے گا مگر اس یقین کی دلیل ہمیں لیبارٹری سے ہی مل سکے گی۔“

وہ سر جھکائے کمرے میں آ گئی۔ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹ کر سسکنے لگی۔ اندیشے نے اُس کے دل کو بری طرح ڈرا دیا تھا۔ جانے والے نے سوچنے کا ہوم ورک دیا تھا۔ وہ ہوم ورک کرنے کی بجائے رُب سے دعا کرنے لگی۔ ”میں نے ہمیشہ تمہارا حکم مانا ہے۔ آج تک کوئی غیر شرعی کام نہیں کیا ہے۔ نہیں جانتی کہ جو سزا مل چکی ہے، وہ کس جرم کی پاداش تھی۔ یہ بھی نہیں جانتی کہ سزا پانے کے بعد میرا گناہ دھل گیا ہے یا نہیں۔ اگر سزا باقی ہے تو اپنے سوئے حبیب کے واسطے مجھے معاف کر دے۔ یا باری تعالیٰ! میں اتنی مضبوط نہیں ہوں۔ اگر تمہاری رحمت کے پاس میرے لئے معافی کی گنجائش نہیں رہی تو اتنا کرم کر دے کہ کسی اور رنگ میں سزا دے دے۔ بیمار کر دے، میری سانس کو تھکا دے، میری زندگی مُکا دے یا کچھ بھی کر دے مگر ہائے! ایسا نہ کرنا کہ میں دنیا میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں۔“

پتیلیاں لے لے کر رونے لگی۔ ایسے میں اُس کی ماں اُس کے پاس آ گئی۔ بیٹی کو زار و قطار روتے دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔ ماتا نے پتھکی دیتے ہوئے کہا۔ ”اے کرموں بچا! کیوں روتی ہے؟ مرنے والا سرتا پیر میرا تھا۔ اُس میں کسی کی کوئی شراکت نہیں تھی۔ میں اپنے سانس کی بخشش کی دعا کرتی رہتی ہوں۔ تم اپنے ہونے والے سانس کی سلامتی کی دعا کیا کرو۔“

وہ اپنی ماں کے لرزاں وجود سے لپٹ گئی۔ ایک چیخ لبوں پر آ کر دم توڑ گئی۔ ”اماں! وہ تیرا سانس تھا مگر میرا باپ تھا۔ باپ کے بغیر بیٹیاں یوں ہوتی ہیں جیسے کھلے رقبے میں

پڑا ہے کہ سرسری طور پر دیکھنے پر دونوں کمرے ایک سے دکھائی دیے۔ غور کرنے پر مماثل پتہ چلتا ہے کہ اُس کمرے کو آپ کی کوشی کے کمرے سے مشابہت دینے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔“

چو کھٹ تھا مگر چند لمحے کھڑی رہی۔ پھر ہولے ہولے قدم اٹھاتے اُن کے پاس آ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چائے کا کپ تھا مگر بولی۔ ”مگر ایسا کیوں کیا گیا ہے؟“

امجد نے کہا۔ ”اگر زرینہ ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو وہ لوگ اپنا مقصد حاصل کر چکے ہوتے۔ وہ غالباً یہی چاہتے تھے کہ تفتیش ہونے پر یا بات کھلنے پر تمہاری نظروں میں ہم ظہر ہوں۔ ابتدائی طور پر تم نے ایسا رد عمل ہی پیش کیا تھا۔ بھلا ہو زرینہ کا جس نے تمہاری طرح غلط میں احمقانہ رائے قائم کرنے کی بجائے ہوشمندی کا ثبوت دیا۔“

وہ شرمندہ سی ہو کر چائے پینے لگی۔ زرینہ نے کہا۔ ”بھائی! مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اُن کرنے والے ہمارے آس پاس..... بہت قریب رہتے ہیں۔ اُن کی رسائی آپ کی کوشی کے اُس کمرے تک ہے، ہمارے دونوں خاندانوں کے مابین گہرے مراسم سے بھی باہر ہیں اور انہوں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ ہمارے بلیک میل نہ ہونے پر، بات کے کٹنے، اُن پر حرف آنے کی بجائے آپ لوگوں پر الزام آئے۔ وہ کون ہے؟..... اب ہمیں سوچنا ہے۔“

اُس نے پتے کی بات کی تھی۔

امجد پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اُٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں چلتا ہوں، انکل چوہدری کے فون میں محفوظ فون نمبروں کو ٹرائی کرتا ہوں۔ اگر کوئی کلیو ملا تو فون پر بتلاؤں گا۔ ورنہ ملاقات ہوگی۔ تم دونوں بہنیں بھی اس بارے میں سوچنا۔“

اُس کے جانے کے بعد زرینہ نے اُس کی جانب پیٹھ کرتے ہوئے دُوبے دُوبے

میں کہا۔ ”باجی! تمہیں اپنا چیک اپ کروالینا چاہیے۔“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”کیوں؟ ڈاکٹر کہہ تو رہا تھا کہ وقتی صدمے کے باعث شک

ہے، کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔“

وہ بولی۔ ”جو میں کہہ رہی ہوں، اُسے سمجھنے کی کوشش کرو باجی!“

سمجھنے کی کوشش کی تو زری کی بات نے دل کو دہلا کر رکھ دیا۔ اُس نے اس رخ سے

وہ بولی۔ ”تو بھی بالکل تھلی ہے۔ یہ باتیں سکھائی تھوڑی جاتی ہیں، سیکھی جاتی ہیں۔ جب میری عمر تک پہنچو گی، خود بخود سمجھ جاؤ گی مگر تب تک بہت سا پانی پل کے نیچے سے گزر چکا ہوگا۔“

درد کی خبر دھرتی میں ایک پھول کھل اٹھا۔ اس میں بھیکے ہوئے چہرے پر خوشی کا عکس لہر گیا۔ بولی۔ ”اماں! تم کہتی تھیں کہ کسی مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا۔ جب دیکھا ہے تو بارے پٹنے اور گالیاں دینے کی بجائے نیا سبق دینے لگی ہو۔ کیا تمہیں میرا امجد سے یوں آزادانہ طور پر ملنا جلنا برا نہیں لگا؟“

”تم نے گندم کی فصل دیکھی ہے ناں۔ پکنے تک اُس میں سے ہم اپنی بکری تک کو گزرنے نہیں دیتے۔ ایک خوشہ توڑنے والے کا ہاتھ توڑنے کو آ جاتے ہیں۔ جب پک جاتی ہے تو اُسے کٹائی کیلئے مزدوروں کی درایتیوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔“ اماں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا اور دوپٹے کے پلو سے چہرہ پونچھتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

اماں نے عجب مثال دی تھی۔ روتے چہرے پر جذبات کی قوس قزح اُتر آئی۔ خود کو ٹوٹے ہوئے بڑبڑائی۔ ”اس کا مطلب ہے میں پک چکی ہوں اور مجھے ایک ایک پور کاٹنے والی درایتیوں کے حوالے کرنے کا موسم آ گیا ہے۔“

ڈرے ہوئے دل کو اس احساس نے مزید ڈرا دیا۔ اُن دیکھی چیز کے ملنے کی برسوں سے خواہش تھی۔ جس رنگ میں ملی تھی، اُس نے مرمریں بدن میں دراڑیں ڈال کر اٹھن بھردی تھی۔ سوچنے لگی۔ ”ہائے! یہ زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ مزارعوں کی نوبیا ہتا بیویاں ٹٹائی ہیں کہ عورت کی پوری زندگی ایک طرف، کسی کے نام لکھ دی جانے والی زندگی کی پہلی رات ایک طرف ہوتی ہے۔ میں کیسی نایا ہتا لڑکی ہوں۔ ایسی بختوں بھری رات سے صرف اس لئے خوفزدہ ہوں کہ یہ مجھ پر پہلے ہی ظلمت کے آتش بھرے دن میں اُتار دی گئی ہے۔“

زری جب اُسے کھانا لگنے کی اطلاع دینے کیلئے کمرے میں داخل ہوئی تو اُسے گہری نیند غافل پایا۔ اُس پر کمبل اوڑھا کر درست کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ ”ذہن کو استقامت سے زیادہ کھپایا جائے تو جلد تھک جاتا ہے۔ تم بھی تھک گئی ہو باجی! تمہیں طعام سے کہیں زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ سو جاؤ..... جیسے تمہارے اور میرے بخت سو گئے ہیں۔“

بڑے فوں کے بعد دونوں پھر کالج جانے کیلئے ویگن اسٹاپ پر کھڑی تھیں۔ دو تین

سر جھکائے کھڑا ہوا میری کا درخت جسے ہر گزرنے والا پتھر مارتا ہے۔ پکے ہوئے ہیر توڑ لے جاتا ہے۔ اُس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا، اُسے کوئی روکنے والا نہیں ہوتا۔“

اماں نے پوچھا۔ ”تم آسمان تلے ٹنگے سر کھڑی میری نہیں ہو، چوہدری باسط کی بیٹی ہو کر کسی نے انگلی اٹھائی ہے کیا؟ بول! میں اتنی بھی بے سکت نہیں ہوں کہ اپنی بیٹیوں کی حفاظت بھی نہ کر سکوں۔“

وہ کہنا چاہتی تھی کہ جس درخت کو تم نے سات پردوں میں چھپا رکھا تھا، اُس کے پھل رہے ایک طرف، لوگ ٹہنیاں تک کاٹ کر لے جا چکے ہیں۔ ہونٹ دانتوں تلے پل کر ان کے بات روک لی۔ نادان یہ نہیں جانتی تھی کہ ہونٹوں پر دانتوں تلے بات کو پھل دے دے وہ مرنی نہیں بلکہ زخم بن کر رہنے لگتی ہے۔ رستے ہوئے زخم کو مرہم تلے رکھ کر چھپا ہوا ہے۔ مرہم رکھنے والا اور دردور تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اماں نے اُس کے گھنے سیاہ بالوں میں کسی چاہنے والے کی طرح انگلیاں بھرنے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! تم پڑھی لکھی ہو، تمہارے باپ نے تمہیں پڑھا لکھا کر باشعور بنایا ہے۔ میں اُن پڑھ ہوں۔ دل دونوں کا ایک جیسا ہوتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم نے اپنے دل میں ملک امجد کو دیوتا بنا کر سجالیا ہے۔“

وہ روتے روتے چونک اُٹھی۔ عجیب سی نظروں سے اپنی اماں کو دیکھنے لگی۔ اماں نے اُس کی آنکھوں کو باری باری چوما اور کہا۔ ”یوں نہ دیکھ! دل پر اختیار نہیں ہوتا۔ کنٹین سمجھاتی پڑھاتی ہیں، دل میں کسی کو بسانے سے نہیں روکتیں۔ میں تو فقط اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ مرد سے چار بالشت کے فاصلے پر رہا جائے تو وہ قدر کرتا ہے۔ آگے جانے والی کے پیچے سر جھکائے چلتا رہتا ہے۔ پیچھے چلنے والی کو نظر انداز کر کے آگے والی کو پکڑنے کیلئے لپکتا ہے۔ تم اپنی ٹہنیوں کو قد آدم سے بلند کرلو۔ وہ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر ہیر توڑنے کے پکڑے بے تابی کے کپے دھاگے میں بندھا کھڑا رہے گا۔ ذائقہ منہ میں گھلنے تک اپنی حیثیت کشش رکھتا ہے۔ گھل کر بے وقعت ہو جاتا ہے۔ ایک ہیر کھالینے والا پوری میری کو بچھڑا ہے اور دوسری کی طرف بڑھ جاتا ہے۔“

سوچنے لگی کہ ماں ان پڑھ ہونے کے باوجود اتنی گہری باتیں کیسے کر لیتی ہے۔ بولی۔ ”اماں! تمہیں اتنی باتیں کس نے سکھائی ہیں؟“

ایسے میں پینڈ بیک میں رکھا ہوا فون دروازہ بن گیا اور دروازے پر کسی نے دستک دینا شروع کر دی۔ اُس نے فون نکال کر سکریٹ پر ملک امجد کا نام پڑھا۔ آن کرتے ہوئے کان سے لگا لیا۔ ”جی سر! آپ کیسے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”تم کہاں ہو؟ میں اس وقت حسب وعدہ تمہارے گھر پر موجود ہوں۔ اماں جی نے بتایا ہے کہ تم دونوں آج کالج گئی ہوئی ہو۔“

اُسے یاد آیا تو شرمسار سے لہجے میں بولی۔ ”معافی چاہتی ہوں سر! ہم دونوں کو سرے سے یاد ہی نہ رہا کہ آپ نے آنے کا کہا تھا۔ تین بجے تک ہم گھر پہنچ جائیں گی۔ اگر ضروری کام ہے تو اسی وقت نکل پڑتی ہیں۔“

وہ بولا۔ ”میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں شہر آ رہا ہوں۔ تم سے کچھ باتیں بھی کرنا ہیں۔ کیا ہم شہر میں مل لیں؟“

اُس نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔ آپ جہاں کہیں، ہم وہاں آ جاتی ہیں۔“

”میں دجے تمہارے کالج کے گیٹ پر تمہارا انتظار کروں گا۔“

اُس نے حامی بھر کر رابطہ منقطع کر دیا۔

”بجے اُس نے دونوں کو پک کیا اور شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں لے آیا۔ فیملی روم میں بیٹھ کر کھانے کا آرڈر دینے کے بعد بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم میری حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی کو غلط پہناؤ نہیں پہناؤ گی۔ کھانے کے دوران ہم گفتگو کریں گے، پھر واپس گھر چلے جائیں گے۔“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”کچھ پتہ چلا؟“

وہ بولا۔ ”نہیں۔ اس ٹاپک پر کھانا کھانے کے بعد میں گفتگو ہوگی۔ تب تک میں تم دونوں کو جتنے مسکراتے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”دونوں مسکراتے لگیں۔ کھانا ختم ہوا تو وہ بولا۔ ”میں نے تمہارے ابا جی کے فون میں فیڈ بیک نمبروں کو ڈرائی کیا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک نمبر ایسا ہے جو بار بار ڈرائی کرنے پر بھی منڈلا۔ میرا اندازہ ہے کہ اسی نمبر سے تمہارے ابا جی سے بات چیت کی گئی تھی۔ اُس کے فون کی نمبر لیسٹ کئے گئے ہیں۔ اس لئے پتہ نہیں چل سکتا کہ اُس کال کا دورانیہ کیا تھا۔ اُسے اور تاریخ دیکھ کر میرے اندازے کو تقویت ملتی ہے۔“

ویگنیں گزر گئیں۔ اُن میں گنجائش سے زیادہ سواریاں بھری ہوئی تھیں۔ آتی ہوئی ایک ویگن کو دیکھ کر بتول نے جھرجھری لے کر زری سے کہا۔ ”زری! اب تو ہر ویگن سے خوف محسوس ہونے لگتا ہے۔“

زری نے سنجیدگی سے کہا۔ ”پلیز باجی! بار بار اُس واقعے کو یاد کر کے اپنا اور میرا خون نہ جلایا کرو۔ جو ہوتا تھا، ہو چکا۔ رونے پینے سے وقت کی کیسٹ ریورس نہیں ہو سکتی۔“ وہ ٹھیک کہتی تھی۔ آنے والی ویگن میں اُن کے بیٹھنے کی گنجائش نکل آئی۔ کالج اسٹاپ پر اترنے کی بجائے بس اسٹینڈ پر اتر کر رکشا حاصل کیا اور رسول ہسپتال کی طرف چل دیں۔ ہسپتال کے سامنے اور اطراف میں کئی میڈیکل اسٹور اور کلینک کھلیں لیبارٹریاں موجود تھیں۔ زری چاہتی تھی کہ پہلی فرصت میں اُسے اپنا چیک اپ کروانا چاہیے۔

ٹیسٹ کیلئے یورین دینے کے بعد انہیں آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ رپورٹ لفافے میں ڈالتے ہوئے لیبارٹری ٹیکنیشن نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ویری ہیڈ مسز روہتا آپ کی رپورٹ نیگیو ہے۔ دل پر بوجھ مت لیجئے۔ خدا جلد ہی آپ کی گود بھر دے گا۔“ ٹیکنیشن کو رپورٹ کی منفیت پر دکھ ہوا تھا۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یوں لگا جیسے بدن پر پڑا امنوں بوجھ ایک دم ہی اتر گیا ہو۔ لفافے پر مسز روہتا لکھ کر ٹیکنیشن نے اُن کی جانب بڑھا دیا۔ زری نے بطور احتیاط اپنی باجی کا نام بتول کی بجائے مسز روہتا لکھوایا تھا۔

لفافہ تھامے دونوں لیب سے باہر نکلیں۔ سڑک پر کھڑے ہو کر رکشا کی تلاش میں نظر لگا دوڑانے لگیں۔

کالج کی چار دیواری میں پہنچ کر دونوں کے راستے حسب معمول جدا ہو گئے۔ بتول اسٹاف روم میں آئی۔ وہاں چند ایک کولیگ لیکچررز موجود تھیں۔ انہیں اُس کے باپ کی وفات کا علم تھا۔ وہ افسوس کرنے لگیں۔ ملنے ملانے اور تعزیت میں کافی وقت صرف ہو گیا۔ وہ پڑھانے کیلئے خود کو فٹ محسوس نہیں کرتی تھی۔ چپڑا اسی کو چائے کا کہہ کر لاہری میں بیٹھی۔ شیف سے ایک کتاب اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لی۔ صفحے پلٹتے ہوئے سوچنے لگی۔

”اگر ٹیسٹ کی رپورٹ پازیٹیو آتی تو؟“

خود کو کوسنے لگی۔ جو عذاب جان پر اترتا نہیں تھا، اُس کے بارے میں سوچنا حماقت تھی۔

.....

”سمجھ میں نہیں آیا کہ انہوں نے پھر مجھ سے کوئی رابطہ کیوں نہیں کیا۔ کیا اُن کا مقصد پورا ہو چکا ہے؟ یا اباجی کی وفات نے اُن کے مشن کو ناکام بنا دیا ہے؟“ بتول نے کہا۔
 ”دونوں باتیں بعید از امکان نہیں ہیں۔“ امجد نے کہا۔ ”میں تم سے ایک اجازت لینا چاہتا ہوں۔ میں بہت غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے سراغ رسائی کی کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میری نظر میں ایک آدمی ایسا ہے جو میری بھرپور مدد کر سکتا ہے۔ اُس سے کام لینے کیلئے اُسے اپنا ہم راز بنانا ناگزیر ہوگا۔ کیا مجھے اُسے ہمراز بنانے کی اجازت دیتی ہو؟“

وہ سہم کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے شاکی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ وہ نیکین سے ہاتھ مارا کرتے ہوئے اُنھ کو اُس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ دونوں شانوں سے پکڑ کر زینہ کے عقب میں دیوار کی طرف لے گیا۔ آہستہ سے بولا۔ ”گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا دیرینہ ملازم منیر اقصائی ایسے کاموں میں بے انتہا مہارت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ چند ہی دنوں میں ہمارا دشمن بے نقاب کر کے ہمارے سامنے لے آئے گا۔“
 وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”نہیں امجد صاحب! پلیز مجھے متاثر نہ بنائیں۔ میں ایک باغیرت باپ کی بیٹی ہوں۔ اُس باپ کی بیٹی جس نے بیٹی کی بے حیائی پر یقین کرنا کیلئے مجھ سے باز پرس کرنے کی زحمت بھی نہیں کی اور جان دے دی۔ مجھ پر کرم کر بلا علاقے میں مجھے یوں برہنہ نہ کریں۔“

زیرینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھ بغیر کہا۔ ”امجد صاحب! اگر یہ بات باہر نکل گئی تو سوشل باجی کی شادی کیسے ہو پائے گی؟“

امجد چند لمحوں تک اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ دل میں اپنا تجزیہ کرتا رہا۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”بڑے کہتے ہیں کہ انسانی جسم میں خالق کو آنکھیں سب سے پیاری ہوتی ہیں کیونکہ انہیں وہ اپنے ہاتھ سے بناتا ہے۔ میں ان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تم سے شادی کروں گا۔“
 وہ دیدے پھاڑے اپنے چاہنے والے کو دیکھنے لگی۔ ہو لے سے بولی۔ ”امجد صاحب! محبت اور ہمدردی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ عورت کا دل محبت کے نام پر دھڑکتا ہے۔ ہمدردی پر احساس کمتری کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ آپ کو میں نے اپنے بارے میں

سے بتا دیا تھا، پھر بھی.....“
 امجد نے گردن موڑ کر زیرینہ کی طرف دیکھا۔ وہ بے نیازی ظاہر کرنے کیلئے سلا د سے کھلنے میں مشغول تھی۔ وہ بتول کے دائیں ہاتھ کو اپنے ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولا۔
 ”میں ان دونوں جذباتوں کے مابین حائل مہین سے پردے کی حیثیت سے بخوبی آگاہ ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں بتول! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرے باپ نے چند دن قبل تم دونوں بہنوں کو اپنے خاندان میں بیاہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرا چچا زاد بھائی رئیس یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ اباجی نے یہ فرض اپنے سر لینے کے بعد اپنی انا کا لحاظ نہیں رکھا اور اپنے بھائی کے پاس جانے اور اُسے اپنا حکم سنانے سے دریغ نہیں کیا۔“

وہ سانس لینے کیلئے رکا۔ اُس کی پھپھی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔
 ”جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ تمہارے گھر میں دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میری تلاش ختم ہو گئی ہے۔ یوں لگا جیسے تم ہی وہ لڑکی ہو جس کی تلاش میں میں اب تک مارا مارا پھرتا رہا ہوں۔ ہاں! جب تم نے مجھے نوٹ بک پڑھنے کیلئے دی، میں نے پڑھی تو میرا تمہیں اپنانے کا ارادہ ایک مرتبہ ڈانواں ڈول ہوا۔ جب میں نے یہ سوچا کہ جس گناہ میں تمہاری مرضی شامل نہیں تھی، جس گناہ گاہ کی طرف تم نے اپنی مرضی سے قدم نہیں اٹھایا، اُس جرم سے تم بری الذمہ ہو۔ جب خدا تمہیں اس جرم سے بری کرتا ہے تو میں کون ہوتا ہوں تم پر انگلی اٹھانے والا اور ہمدردی کے جذبات رکھنے والا۔ مجھے تم سے ہمدردی نہیں، محبت ہے۔“

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ امجد نے کھلے ہوئے منہ پر بڑی نرمی سے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کچھ بھی مت کہو۔ تمہاری آنکھیں بولتی ہیں۔ آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں، کبھی ربا کاری نہیں کرتیں۔ یہ پیاری پیاری آنکھیں مجھے خوبصورت سا اعتراف دے رہی ہیں۔ یہ مجھے کہہ رہی ہیں کہ تم بڑے خوش قسمت مرد ہو۔ دنیا سے الگ تڑکی نے تمہیں اپنا آپ سونپنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ میں ٹھیک سن رہا ہوں، میں درست دیکھ رہا ہوں۔ ہے ناں؟“

وہ ٹالنا چاہتی تھی۔ ذہن بڑی تیزی سے ریشم کے تانے بننے میں مصروف تھا۔ دل نے کہا۔ ”کسی اور کو اپنا ہاتھ تھماؤ گی تو ہاتھوں پر لگی نادیدہ آلائشیں چھپانے میں جوانی گزر جائے گی۔ ہر آن دھڑکا لگا رہے گا۔ ہر آن عدم تحفظ کا شکار رہو گی۔ اب سے تو تم نے اپنا آپ آئینہ بنا کر دکھا دیا ہے۔ آئینہ جھوٹ نہیں بولتا۔ تم نے کوئی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ اُس نے

دل میں اٹھا کر ہوٹل کے گراؤنڈ فلور میں ناچتا ہوا جاتا اور دنیا کو بتلاتا کہ میرے دل نے
کی تنہا کی تھی، اُسے پالیا ہے۔ ہے کوئی مجھ جیسا خوش قسمت تو سامنے آئے.....“
اتنا بڑا بچگانہ قدم تو نہ اٹھا۔ کالبتہ اُسے شرارت بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد بولا۔
بت نے دلوں میں تفریق کا بیج ڈال دیا ہے۔ تم دونوں سبکی نہیں ہو۔ زری کو بہن سمجھتا
ہ۔ تمہیں نہیں۔ تمہیں اپنا سب کچھ مان بیٹھا ہوں۔ آئی لو یو بتول! آئی لو یو.....“
وہ کن اکھیوں سے احمقوں کی طرح پورا منہ کھول کر ہنستی ہوئی زرینہ کو دیکھنے لگی۔ سوچنے
لگی۔ ”ہائے! زندگی بھی کیا رنگ دکھاتی ہے۔ پیچھے بھاگو تو آگے آگے بھاگنے لگتی ہے اور
لو لپکتی جاتی ہے۔ رُک جاؤ تو پلٹ کر احاطہ کرنے لگتی ہے۔ اگر مجھے اغوانہ کیا جاتا تو
بے احمق کی مدد کی ضرورت نہ پڑتی۔ اُسے فون نہ کرتی تو اتنا خوبصورت لمحہ میری زندگی میں
دیکھی نہ آتا۔“

کتنا بڑا بچ ہے کہ دنیا کی تمام قوتوں میں سے سب سے زیادہ طاقتور قوت، محبت کا
رہہ کہلاتی ہے۔ تبھی زندگی کی تمام تر رعنائیاں محبت کرنے والے کے قدموں میں ڈھیر کر
نا جاتی ہیں اور کسی زریاں کا، کسی خسارے کا احساس تک نہیں ہوتا۔



دل میں رہنے والا دل سے دور جانے لگا۔ رئیس کو دل میں جگہ دینے پر پچھتانے لگی۔
لطی کا احساس ہوا۔ اُس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ رئیس بھونڑا صفت انسان ہے، اُس
کے اظہار محبت پر یقین کرتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ دروازے سے
ٹپے گا تو بری طرح پٹ جائے گا۔ مقابل میں کوئی ایرے غیرے کی بیٹی نہیں تھی۔ قدرت
نے اُسے حسن کی چمکتی سیج پر بیٹھا کر سیر بنایا تھا، اس کے باپ کی دولت اور فرعونیت اُسے سوا
برہائے رکھتی تھی۔ تبھی وہ دبے پاؤں کھڑکی سے چوروں کی طرح بدن کی عمارت میں
داخل ہوا تھا اور اپنے گندے پیروں سے دل کی دھرتی تک کو گندا کر گیا تھا۔

لڑکیاں عمومی طور پر چنچل اور شرارتی مزاج انسان کو پسند کرتی ہیں۔ رئیس ایسا ہی تھا۔
اس کی عادات لڑکیوں کو اپنی جانب کھینچ لیتی تھیں۔ کل تک اچھی لگنے والی باتیں شانی کو
اب بڑی لگ رہی تھیں۔ رئیس کے برعکس عالمگیر کی سنجیدہ مزاجی اُسے اپنی جانب راغب
کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ عالمگیر رئیس کی طرح چھپھوری حرکتیں نہیں کرتا بلکہ بڑے

سننے اور پڑھنے میں بھی کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ وہ تمہاری مدد کرنے آیا تھا۔ اپنی مدد کیلئے
دامن پھیلائے تمہارے آگے کھڑا ہے۔ اسے بے مراد واپس نہ بھیجو۔“

دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے غور کیا تو یوں لگا جیسے وہ امجد کے نام کا دروازے
جا رہا تھا۔ کچھ بھی بتلانے کی بجائے اُس نے سر جھکا دیا۔ جھکے ہوئے سر نے امجد کے
چوڑے چکلے سینے میں پناہ تلاش کر لی۔ وہ ہولے سے بولی۔ ”اگر آپ کی محبت نے مجھے
اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر مجھ سے کچھ بھی مت پوچھئے اور جیسا جی میں آئے، ویسا ہی
کیجئے۔ میں نہیں جانتی کہ کسے ہم راز بتانا ہے، کس سے اپنا آپ چھپانا ہے۔ میری زندگی تو
اماں جی اور زرینہ تک ہی محدود ہے۔“

دروازے میں گرے ہوئے بے جان وجود کو بانہوں میں اٹھا کر بیڈ پر لٹانے والے کی
سانس وپیں رُک گئی تھی۔ آج یہ بھی پتہ چلا تھا کہ بے ہوش وجود اور جوانی کی ہوش میں
سانس لیتے ہوئے وجود کی تپش اور گداز میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ وہ موسم سرما میں بہتا
ہوا نیم مُردہ دریا تھا۔ یہ آگ کا صحرا ہے۔

چاہنے والوں کو کبھی وقت کے گزرنے کا پتہ نہیں چلتا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ زرینہ نے
کھانسنے کر دونوں کو وقت کے گزرنے اور اپنے موجود ہونے کا احساس دلایا۔ وہ جھینپ کر
امجد سے الگ ہو گئی۔ سرخ رخسار اور لرزاتے ہونٹ لئے ڈانٹنگ چیئر پر آن بیٹھی۔ محبت
آن کی آن میں نئی ادائیں سکھا دیتی ہے۔ وہ برسوں سے چپکی ہوئی زری سے بھی نظریں چرا
کر بتلانے لگی کہ وہ اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ اُس کے ساتھ رہنے کے باوجود اُس جیسی نہیں
رہی۔ ایک چاہنے والے نے ایک پل میں اُس کی دنیا بدل ڈالی تھی۔ زرینہ نے کہنی
پسیلوں میں نرمی سے چبھوتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”آج میری باجی کو میری موجودگی میں بُرا
لیا گیا ہے۔ لگتا ہے چور سے کہیں زیادہ جلدی چرائے جانے والے سامان کو تھی۔“

وہ شرمسار ہو کر مزید جھک گئی۔

امجد بہت بڑے اور ذمہ دار عہدے پر فائز تھا۔ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کا عادی
تھا۔ عامیانہ سی کوئی بھی حرکت اُس کے اسٹیشن کو برباد کر سکتی تھی مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ
محبت ایسا جذبہ ہے جو بھرے پُرے جوان کو آن کی آن میں بچہ بنا دیتا ہے۔ وہ بچہ نہ کر
سوچ رہا تھا۔ ”کاش! میں جج جیسے اعلیٰ عہدے پر فائز نہ ہوتا تو اس نزاکت پری کو دونوں

ہیں۔ پھر کہیں جا کر یہ قابو میں آتی ہے۔ جونہی ہاتھوں، پیروں یا ٹانگوں میں سے کسی بھی عضو کی گرفت نرم پڑتی ہے، بدک کر بے قابو ہو جاتی ہے اور اپنے سوار کو زمین پر گرا کر دور جاگ جاتی ہے۔ ایسی کئی کوٹھیاں سیاست کی الہڑ گھوڑی کو قابو میں رکھنے کیلئے بھائی نے بننے زیر استعمال رکھی ہوئی ہیں۔“

وہ بولی۔ ”اتنی لمبی چوڑی کہانی سنانے کی بجائے صاف صاف الفاظ میں مجھے بتلاؤ۔ میرا باپ شاہ سوار ہے، میں نہیں ہوں۔“

”اوہ ہو بھئی! یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ وہ اس تذکرے کو ٹالنا چاہتا تھا۔ وہ اڑ گئی تو بولا۔ ”میں نے کہا ہے کہ ہر وہ کام جو عوامی اسٹیج سے اتر کر سیاست دان کرتے ہیں، وہ اُس کوٹھی میں کیا جاتا ہے۔“

”یعنی سیاسی حریفوں کی کمزوریوں کو پکڑنے اور اپنی دسترس میں رکھنے کے کام.....؟“

وہ ہنسنے لگا۔ ”جب سب کچھ سمجھتی ہو تو پوچھتی کیوں ہو؟“

”تمہارے بھائی نے میرے باپ کی طرح مجرموں کو پناہ بھی دے رکھی ہوگی؟“

وہ سمجھ گیا کہ شانی اُسے چھیڑ رہی ہے۔ اُس کا کسی نئے انداز سے امتحان لے رہی ہے۔ ہنس کر بولا۔ ”ہاں بھئی! آج کل اقتدار میں ان رہنے کیلئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جس کا انڈر گراؤ نڈ جتنا مضبوط ہوگا، دشمن اتنا ہی دَب کر رہیں گے۔ تم جانتی ہو کہ دبا کر رکھنے کیلئے طاقت کے ساتھ ساتھ ہوش کے ناخن بھی لینا پڑتے ہیں۔“

”کیا تمہارے بھائی نے کبھی سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے لڑکیاں اغوا کی ہیں؟“ وہ اُس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے بولی۔

وہ چونک گیا۔ سٹ پنا کر دیکھنے لگا۔ وہ کیسا امتحان لے رہی تھی؟ کائیاں باپ کا بیٹا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں تھا ہوا موبائل فون لے کر چیک کرنے لگا۔ کہیں وہ وائس ریکارڈنگ تو نہیں کر رہی۔ اُس کے فون کا ماڈل دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس ماڈل میں ریکارڈنگ کی سہولت موجود نہیں تھی۔ اُس کے سر اپا کا یہ نظر احتیاط جائزہ لیا۔ کہیں کوئی تاریا مالک وغیرہ نظر نہیں آیا تو مطمئن ہو کر بولا۔ ”تم نے کوئی اخبار یا میگزین تو جان نہیں کر لیا؟ اسنے گہرے اور مشکل سوال تو صحافی بھی ہم سے نہیں کرتے۔ بانی داوے..... میں نے کبھی بھائی کے معاملات میں دخل دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کیا کرتا پھرتا ہے، اُس کی سیاسی

لوگوں کی طرح ہر وقت سنجیدگی کو خود پر طاری رکھتا ہے۔ وہ بڑی آہستگی سے رئیس کی طرف سے پلٹ کر عالمگیر کی طرف آ رہی تھی۔ ایسے میں اُس کی گاڑی نے ملک زادوں کی کوٹھی کے سامنے خراب ہو کر اُسے زقند بھر کر عالمگیر کی گود میں پہنچنے کی پُر قوت تحریک بخش دی تھی۔ کیسپس میں رئیس اُسے ملا تو اُس کی بے رخی کو بھانپ کر پریشان ہو گیا۔ فریٹام میں اُسے روک کر بولا۔ ”شاہانہ! تم کچھ کھینچی کھینچی سی لگ رہی ہو۔ کیا میرے گھر والے پند نہیں آئے؟“

وہ دل ہی دل میں بولی۔ ”میں وہاں اُن کو پسند کرنے نہیں، اپنی نمائش کرانے کے لئے لگتی تھی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ قدرے بے رخی سے گویا ہوئی۔ پھر اُسے کوٹھی کا نمبر اور کالونی کا نام بتلاتے ہوئے بولی۔ ”کیا یہ کوٹھی تمہاری ہے؟“

وہ عام سے انداز میں بولا۔ ”ہاں! یہ ہماری کوٹھی ہے۔“

”کرائے پر دے رکھی ہے؟“

”نہیں۔“ وہ اُس کی کرید پر قدرے پریشان ہو کر بولا۔ ”لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ کیا کسی کو کرائے پر دینا چاہتی ہو؟“

”نہیں!“ وہ اُس پر نگاہیں گاڑتے ہوئے بولی۔ ”کرائے پر نہیں ہے، تمہاری فیملی وہاں نہیں رہتی تو پھر خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟“

وہ مسکرانے لگا۔ سینہ پھلا کر بولا۔ ”مس شاہانہ! پیٹ تو دس ایکڑ زمین سے بھی بھر جاتا ہے۔ تمہارے باپ نے کیوں سینکڑوں ایکڑ رقبہ خرید رکھا ہے؟ رہائش کیلئے ایک ہی کوٹھی کافی ہوتی ہے، تمہارے باپ کی لاہور والی کوٹھی سمیت پانچ کوٹھیاں ہیں جن میں سے کوئی بھی کرایہ پر نہیں دی گئی۔“

وہ رو ہانسی ہو کر بولی۔ ”میری بات کا جواب دو۔“

”پاپا کی سیاسی ریٹائرمنٹ پر سیاست کی دستار بھائی کے سر پر سجادی گئی تھی۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ چار پانچ سال کے بعد حلقے میں جانے پر لوگ ووٹ دے دیتے ہیں؟ نہیں مس

شاہانہ! سیاست کی گھوڑی بہت اتھری ہوتی ہے۔ دونوں ٹانگوں میں اس کی کمر دبوچ کر رکھنا پڑتی ہے۔ مضبوط ہاتھوں میں لگائیں اور لوہے کی رکابوں میں جما کر پیر رکھنا پڑے

مصرفیات کیا ہیں، میں اس پر توجہ نہیں دیتا۔ پایا اور بھائی بھی مجھے اپنے مسائل رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پہلے تعلیم مکمل کرو، پھر سیاسی تربیت حاصل کرنا۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ سیاست کے میدان میں نا آموز گھوڑا پہلی جست میں ٹکارتا ہے۔ برسوں کی کٹھن مشق کے بعد مضبوط سانس والا با اعتماد گھوڑا ہی میدان میں اُتارنا ہے۔ بولی۔ ”اچھا چھوڑو سیاسی باتوں کو۔ رومانٹک گفتگو پر تو کوئی پابندی نہیں ہے نا؟“ وہ اُس کا بازو تھام کر بولا۔ ”آؤ کیفے میں چلتے ہیں۔“

دونوں برابر چلتے ہوئے کیفے میں آئے۔ خالی ٹیبل دیکھ کر بیٹھ گئے۔ وہ بولی۔ ”تم حاصل کرنے کیلئے کس حد تک جاسکتے ہو؟“

وہ اُسے عجیب سی نظروں سے گھورنے لگا۔ اُسے سنجیدہ پا کر بولا۔ ”شاہانہ! تمہارا آج فطری ہرگز نہیں ہے۔ کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی ہے؟“ وہ ٹیبل پر دھرے ہوئے شیشے کے گلاس سے کھیلنے لگی۔ پیشانی پر اضطراب آلود نگاہیں ابھرا آئیں۔ آہستگی سے بولی۔ ”میرا باپ تمہاری پارٹی کی روایتی مخالف پارٹی کا رکن اور کبھی بھی اپنی وفاداریاں نہیں بدلے گا۔ کیا ہماری شادی میں پارٹیوں کا فرق پریشانی باعث نہیں بنے گا؟“

وہ ہنسنے لگا۔ ”کیسی باتیں کرتی ہو شاہانہ! ہم شادی کرنے جا رہے ہیں ناں کہ اسمبلی پہنچنے کیلئے ایکشن لڑ رہے ہیں۔ ویسے بھی اسمبلی میں ایک دوسرے کو طمانچہ اور گھونہ دکھانے والے نجی زندگی میں ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ گھروں میں تعلقات ا نوعیت قطعی مختلف ہوتی ہے۔ میڈیائی فورمز پر اور اسمبلی میں اپنی واہ واہ کرانے کیلئے ایک دوسرے کے گریبان پکڑنے والے شام کو فون پر ٹھٹھے لگا رہے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی پرفامنس پر داد کے ڈونگرے برسا رہے ہوتے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”پاپا ایسے نہیں ہیں۔“

”تبھی تو کچھیلی صفوں پر بیٹھے ہوتے ہیں۔“

طنز برا لگا۔ بولی۔ ”یعنی تم یہ کہہ رہے ہو کہ تمہارا بھائی کبھی بھی میرے پاپا کو اپنی پارٹی میں آنے کا مشورہ نہیں دے گا۔“

وہ بے تکی گفتگو سے اکتا گیا۔ کافی کا آرڈر دیتے ہوئے بولا۔ ”تم آج مس ف“

نہیں جانتا کہ ایسی کیوں ہو مگر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں تجھے کیفے میں رومانوی گفتگو کیلئے لے کر آیا ہوں۔ پلیز! وائنڈ آپ دس آل شاہانہ ڈیر! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میرے گھر والوں نے مجھے لائن کلیئر کا اشارہ دے دیا ہے۔ پاپا تمہاری تعریف کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ یوں لگتا ہے جیسے کوئی چاند رات کے پچھلے پہر میں چپکے سے اُتر اہو اور ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گیا ہو۔“

انگلیاں میز پر بجاتے ہوئے، اُس کی بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گنگانے لگا۔ ”نی چنے دیے بند کیے، تینوں جیہڑے ویلے رب نے بنایا۔ سوچاں وچ آپ پے گیا، ایہہ دو جاجن کدھروں چڑھ آیا۔ نی چنے دیے بند کیے۔“

اُس کا گنگانے اور حسن کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑنے کا انداز بڑا دلہانہ اور جاندار تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ جی جان سے ٹار ہو جاتی۔ مگر اس وقت اُسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بولی۔ ”مسٹر ریکس! ہم بہت اچھے دوست ہیں۔ پاپا میری شادی اپنے کسی دوست کے بیٹے سے کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے فون پر بتلایا ہے کہ انہوں نے تقریباً ہاں کر دی ہے۔ ویسے بھی محبت روگ بن جائے تو اُسے چھوڑنا بھلا ہوتا ہے۔“

گاڑی ریورس کرتے ہوئے سامنے نہیں دیکھا جاتا۔ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا جاتا ہے۔ وہ پلٹ نہیں سکتی تھی۔ نظریں جھکائے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”مجھے یقین ہے کہ ہماری دوستی عمر بھر قائم رہے گی۔ آئی ایم ویری ساری ڈیر!“

اُس کی ساری شوخی ہوا ہو گئی۔ اُسے شاہانہ کی طرف سے اتنی بے رخی کے ساتھ قطع تعلق کی توقع نہیں تھی۔ کئی ساعتوں تک اُس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی۔ خود پر قابو پانے کے بعد بولا۔ ”میں قیس یاد دہید نہیں ہوں، تم کیلی یا ہیئر نہیں ہو۔ تم جیسی زمانے میں لاکھوں لڑکیاں موجود ہیں۔ میرے جیسے چاہنے والوں کا شمار بھی ممکن نہیں ہے۔ ہم جس کلاس سے تعلق رکھتے ہیں، اُس میں اولاد کی مرضی کے بغیر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے۔ یہ مڈل کلاس اور لوئر کلاس کی پراہلنز ہیں جن سے ہم لوگ جان چھڑانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔“

وہ بہت آہستہ آواز میں بول رہا تھا۔ اطراف کی میزوں تک اُس کی آواز نہیں جا رہی تھی۔ بولا۔ ”جیسے مجھے اپنے لئے لڑکی چننے کا حق حاصل ہے، تمہیں بھی اسی طرح اپنا جیون سہمی چننے کی مکمل آزادی ہے۔ میں تم سے محبت کرتا تھا اور تم نے بھی ایسے ہی جذبات کا

کر دکھا رہی ہو۔“

اس سے آگے کہے ہوئے رئیس کے الفاظ نے اُس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ یہ آگ لطف دینے والی ہرگز نہیں تھی۔ اُس نے پانی کا بھرا گلاس اس پر الٹ دیا۔ وہ نہایت غیر فطری انداز میں بیٹھا رہا۔ بالوں سے پہلے چھلکتے بعد میں چپکتے ہوئے پانی کو آنکھیں اوپر کر کے دیکھتا رہا۔ زبان کو گیلے ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولا۔ ”تم مغرور ہی نہیں، نہایت احمق اور خود سر بھی ہو۔ جلد ہی کسی اور رنگ میں ہماری ملاقات ہوگی۔“

وہ اُس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کیفے سے نکل کر اپنی گاڑی کی طرف چل دی جہاں عالمگیر اُس کا منتظر تھا۔

گھر پہنچ کر سگتے ہوئے دماغ کے ساتھ اپنے کمرے میں آئی۔ رحمت بی کو بلا کر کہنے لگی۔ ”عالمگیر کو بلا کر لاؤ۔“

چند منٹوں کے بعد عالمگیر کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اجازت کا طلبگار ہوا۔ اندر آنے پر سوالیہ نگاہوں سے اُسے خاموشی سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”تم ہمارے ملازم ہو۔ ملازم اپنے مالک کو خوش رکھنے کی تنخواہ لیتا ہے۔ کیا تم مجھے خوش کر سکتے ہو؟“

وہ حیرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ملازم خوش رکھنے کی تنخواہ لیتا ہے۔ تم خوش کرنے کی بات کر رہی ہو۔ کھل کر کہو، تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

وہ پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کئی لفظ ایسے ہوتے ہیں جنہیں ادا کرتے ہوئے انسان آنکھیں ملانے کی تاب نہیں رکھتا۔ بولی۔ ”میری کلاس کی تمام لڑکیاں ہفتے مہینے میں ایک دن اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ تنہائی میں گزرتی ہیں۔ میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی کی نظروں میں گرنا چاہتی ہوں۔ تم جانتے ہی ہو کہ میرے باپ کا شملہ اتنا اونچا ہے کہ اُس پر لگا ہوا داغ میلوں دور سے دکھائی دینے لگے گا۔ میری بات کو سمجھ رہے ہو ناں؟“

وہ اُس کی تنگی گردن کو دیکھ کر بہ مشکل خود پر قابو کئے کھڑا تھا۔ ہر لفظ اس سے بڑا امتحان بن کر اس پر اترنے لگا تھا۔ جذبات آلود آواز میں بولا۔ ”نادان نہیں ہوں۔ جانتا ہوں کہ تمہاری تنہائی تمہیں کھانے لگی ہے۔ میں سمجھتا ہوں مگر تمہارے لئے کسی بوائے فرینڈ کا انتظام کرنے سے قاصر ہوں۔ ملازم پر اگر مالک کو خوش رکھنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو

اظہار کیا تھا۔ آج ثابت کر رہی ہو کہ میرا دل رکھنے کیلئے تم نے جھوٹ بولا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ جومل رہا ہے، غنیمت ہے۔ مجھے تمہاری دوستی قبول ہے۔“

شاہانہ کیوں لگا جیسے اُس پر پڑا منوں بھاری پتھر آں واحد میں اتر گیا ہو۔ عافیت کی سانس لے کر بولی۔ ”مجھے تمہاری وسعت قلبی سے یہی توقع تھی۔ تم بہت اچھے ہو۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ ”مس شاہانہ! کیا تم دوستی اور محبت کے فرق کو سمجھتی ہو؟“

”کیا مطلب؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے متوجہ ہوئی۔

”محبت دنیا میں کسی ایک سے ہوتی ہے۔“ وہ سمجھانے لگا۔ ”دوستی ہر ایک سے ہوتی ہے۔ دوستی کو خراج دے کر زندہ رکھنا پڑتا ہے۔ خراج بھی ایسا کہ جو بدن سے لے کر دماغ تک کو سرشار کر دیتا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں کبھی بھی دوستی محبت میں نہیں بدلی بلکہ اپنی مخصوص ڈگر پر ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے۔ ان تعلیمی اداروں میں ہماری سوسائٹی کے لڑکے اور لڑکیاں زندگی کو انجوائے کرنے کیلئے آتے ہیں۔ میں بھی۔ تم بھی۔ سارے۔“

وہ اُس کے بیان کردہ فلسفے کو سرے سے سمجھ ہی نہیں رہی تھی۔ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ میز پر جھکتے ہوئے اُس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”کم آن کم شاہانہ! بے دریغ خرچ کرنے سے بھی کبھی نہ ختم ہونے والے جذبات کو دوستی کی ٹرے میں رکھ کر سجانیں، لطف آگیاں خراج بنائیں۔ آؤ! چل کر دنیا کے جہوم میں کہیں تنہائی خالی کرتے ہیں۔“

اُس کا چہرہ کانوں کی لوہوں تک سرخ ہو گیا۔ سمجھنے میں بہت دیر لگی تھی۔ سمجھ کر پچھتانے لگی کہ نہ سمجھا ہوتا تو اچھا تھا۔ یکبارگی غصے کی ایک تند و تیز لہر آنکھوں سے مترشح ہوئی۔ شعلے کی طرح لپک گئی۔ اُس نے پانی سے بھرا ہوا گلاس دائیں ہاتھ میں تھا اور کھڑی ہو گئی۔ دانت پیستے ہوئے بولی۔ ”تم واقعی گھٹیا انسان ہو۔ کچھ وقت گزرنے پر تم نے میری محبت بھی اُسی ٹرے میں سجانے کی خواہش ظاہر کرنا تھی جس میں دوستی کے جذبے کو رکھنے کا جتن

ہو۔ میں تمہاری دوستی اور محبت دونوں پر چار حرف بھیجتی ہوں مسٹر رئیس!“ وہ بولا۔ ”ہم دونوں ایک ہی سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسے فرسودہ گیاں کب کی مرچکی ہیں جن کا تم ذکر کر رہی ہو۔ تم خود بھی ایسی پارسا نہیں ہو جیسی

اچانک ٹھنڈا ہوا تھا۔ سنبھل کر پھر حرارت پکڑنے لگا تھا۔ حرارت کی نوعیت مختلف تھی۔ اُس نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ دھڑکن کی رفتار کا پتہ نہیں چلا۔ ٹمپرچر کی زیادتی پر متحکم ہو گیا۔ اُس کی گلی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ ٹھنڈی ٹھارھی۔

وہ خالی خالی نظروں سے اُسے لرزتا دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ اُسے ہولے ہولے پکارنے لگا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ اچانک اُسے اُس کی کیفیت کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ بھاگ کر نیچے آیا۔ ڈرائیور کو فوری طور پر ڈاکٹر کو اٹھالانے کی تاکید کی۔ اُلٹے قدموں بھاگ کر شانی کے کمرے میں آیا۔ اُس کی حالت پہلے کی نسبت زیادہ بگڑ چکی تھی۔ اب تو اُس کا جسم جھٹکے لینے لگا تھا۔ اُس نے جلدی سے اُس پر ادنیٰ کبھل ڈال کر اچھی طرح لپیٹ دیا۔ سر ہانہ گھیرا ہو گیا تھا۔ سر کے نیچے سے نکال کر بدل دیا۔ رحمت بی کو آوازیں دینے لگا۔ وہ بھاگی چلی آئی۔ چھلانگ لگا کر بیڈ پر چڑھ گئی اور شانی کے سر کو گود میں لے کر دبانے لگی۔ سواہیہ نگاہوں سے عالمگیر کو دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اسے نمونہ ہو گیا ہے؟“

وہ شانی کے گیلے بالوں پر دوپٹہ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”سر میں اتنا سارا پانی کہاں سے آیا؟“

وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں جانتا۔“

ڈاکٹر پہنچ گیا۔ اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اُس نے یکے بعد دیگرے تین انجکشن لگائے۔ چند گولیاں دیتے ہوئے سمجھانے لگا۔ رحمت بی کے پوچھنے پر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ بے بی کو نمونیا ہو گیا ہے۔ میں نے دوا دے دی ہے۔ چند منٹوں میں ہی سنبھل جائے گی۔ دودھ گرم کر کے پلائیے گا اور گھنٹہ بھر کے بعد مجھے فون پر مکمل کیفیت سے آگاہ کر دیجئے گا۔“

وہ چلا گیا۔ عالمگیر نے اُس سے کرید کرید کر پوچھا۔ خطرے کی کوئی بات نہ پا کر شانی کے کمرے میں آ گیا۔ وہ نسبتاً سکون میں تھی۔ اُسے دل ہی دل میں افسوس ہونے لگا۔ ماں کو کوئے لگا۔ اُسے تو کبھی بھی پانی سر میں ڈالنے پر نمونیا نہیں ہوا تھا۔ اسے کیوں ہو گیا؟ وہ بیڈ کی پائنتی کی جانب قالین پر فوم سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رحمت بی اُس کے خوابیدہ بدن کو ہلار رہی تھی۔ ایسے میں لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے شانی نے عالمگیر کو پکارا۔ وہ اُس

اُس کے فرائض میں بھی یہ بھی شامل ہوتا ہے کہ وہ ڈمگاتے قدموں کو سہارا دے کر راست پر لے آئے۔“

وہ اچانک پلٹ پڑی۔ عالمگیر نے دیکھا کہ فرط جذبات سے اُس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی وحشت تیر رہی تھی۔ بولی۔ ”تم بوائے ہو۔ میرے بیٹے بن کر بوائے فریڈ ہی کہلاؤ گے۔“

عالمگیر کے پورے بدن میں عجیب سی بے نام لہر سراسر کر گئی۔ دو قدم پیچھے ہٹے ہوئے بولا۔ ”مس شاہانہ! خود پر قابو پانے کی کوشش کرو۔ انسان کی کوئی سطح نہیں ہوتی، کوئی کمر نہیں ہوتی۔ صرف خود پر ضبط کرنے کی صلاحیت میں کمی یا زیادتی پر اُس کی کلاس کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ تم تھرڈ کلاس بن کر پستی نہیں کرنے کی بجائے فرسٹ کلاس بن کر اہم و اشراف دستک دو تو اچھی لگو گی۔ میں تمہارا فریڈ نہیں بن سکتا اور نہ ہی تمہیں تمہارے مقام پر رہنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ آئی ایم ویری ساری مس شاہانہ!“

وہ بجلی کی سرعت سے لپک کر اُس تک پہنچی۔ گریبان کو پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ ”عالمگیر! تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟ میں بھی تو انسان ہوں۔ پیچ جاگتے ماس سے بنائی گئی ہوں۔ جوانی بذات خود آگ ہوتی ہے جو بدن کو جلاتی رہتی ہے ایسے میں پانی ڈالنے سے ہی ذہن معطل ہو سکتا ہے۔ پانی کی طرح مجھ پر اپنی جتا پکاؤ۔ پلیز! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“

وہ اُس کی بات سمجھ چکا تھا۔ گریبان چھڑانے کی کوشش کی تو اس نے گرفت مزید مضبوط کر لی۔ اُسے ساتھ لئے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل کے قریب آیا۔ پانی کا بھرا ہو جگ اٹھا کر مسکراتے ہوئے اُس کے سر پر انڈیل کر بولا۔ ”چند دن قبل میرے تن بدن میں آگ تھی۔ تم نے دیکھا تھا کہ میں نے ٹھنڈا پانی سر میں انڈیل کر اس آگ کو بجھا دیا تھا۔ تمہاری مشکل بھی حل کئے دیتا ہوں۔ تمہارا بدن بھی آگ کی آن میں ٹھنڈا ٹھار ہو جائے گا۔ پانی نے اپنا کام دکھا دیا۔ وہ تورا کر بیڈ پر پہلو کی جانب گر گئی۔ اُس کے سر پر سلیپر اتار کر عالمگیر نے اُسے بیڈ پر ترتیب سے لٹا دیا۔ وہ کھلی کھلی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی۔ روکنے کی سکت نہیں تھی۔ پانی نے اُس کے نصف بالائی بدن کو تر کر دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اُس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ چند ہی منٹوں میں اُس کی حالت غیر ہونے لگی۔ گر گئی۔

اُس نے اچانک اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر اُس پر مرکوز کرتے ہوئے تلخی سے کہا۔
”میرے رونے کا تم پر اثر پڑتا ہے؟“

”دوسرے جھکا کر بولا۔“ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا ہوں۔“
”مجھے بیمار کر کے بستر پر پھینک سکتے ہو، روتے دیکھ نہیں سکتے؟“ وہ ہونٹ سیڑ کر بولی۔
ہالگیر نے دیکھا کہ اُس کے پرگداز ہونٹ پر دو دانتوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ بولی۔ ”میں
ری ہوں۔ آگ لگی تو چیخ پڑی کہ ہائے آگ لگ گئی ہے۔ تم اپنی آگ کو بنا کسی کو خبر کئے
اپنی سے بجاتے رہتے ہو۔ مجھے بھی پانی سے ٹھنڈا کرنے کے چکر میں مجھے بیمار کر بیٹھے ہو۔
نہارا تھو نہیں۔ میں ہی بری ہوں۔“

وہ لاجت سے بولا۔ ”میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ معافی مانگی ہے۔ تم میرے لفظوں کو
خیر کرو۔ دوبارہ تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔“

اُس نے باقاعدہ طور پر اُس کے سامنے دونوں ہاتھ باندھ دیے۔ اُس نے سچ کہا تھا۔
حالی مانگنا اُس کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ وہ چند لمحے بے یقینی کے عالم میں اُسے گھورتی
تھی۔ کرٹ بدل کر اُس کی طرف مڑ آئی۔ ایک ہاتھ سے اُس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو
نام کر بولی۔ ”تم اور ریکس دیکھنے میں ایک جیسے ہو۔ وہ ہائی کلاس کا ہے، تم لوئر کلاس کے
۔ وہ سمجھتا ہے کہ اعلیٰ سوسائٹی کے خاندانوں کی لڑکیوں اور لڑکوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔
بنا خواہش پر جو جہاں چاہے، جیسے چاہے اپنی عزت سے کھیلتے ہوئے دوسرے کی عصمت
لٹا دیاں نکھیر دے۔ میں اُس سے محبت کرتی تھی۔ وہ مجھ سے دوستی رکھنا چاہتا تھا۔ جانتے
”دوستی کس تعلق کو کہتا ہے؟“

وہ بولا۔ ”تم زیادہ باتیں نہ کرو۔ میں ان لوگوں کو تمہاری نسبت زیادہ بہتر انداز میں
بانتا ہوں۔“

وہ کراہی۔ ”تم نہیں جانتے ہو ان درندوں کو۔ یہ انسان نہیں ہیں۔ آج کے دن
میں نے اُس کی دوستی کی پیشکش پر اُس کے سر میں پانی انڈیلا۔ آج کے دن ہی تم نے
میں نے پانی میں نہلاتے ہوئے اپنی عظمت کا ثبوت دیا۔ ہائے کتنے اچھے ہو تم! ہائے کتنی بری
ہوں میں!“

وہ اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے اور لبوں پر پھیرنے لگی۔ ایسے میں رحمت بی

کے نزدیک گھسٹ گیا۔ اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ”مس شاہانہ! میں ادھر ہی ہوں۔“
آنکھیں کھولو پلیز!“

اُس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ بڑبڑائی۔ ”تم میرے قریب رہو۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہے۔
ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے مجھے بلندی سے نیچے پھینکا جا رہا ہے۔ ہائے عالمگیر! میرا دل
طرح ہول کھا رہا ہے۔“

وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ رحمت بی کے ہاتھ تیز ہو گئے۔ شکوہ کناں نظروں سے
عالمگیر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم مجھے اصل بات نہیں بتلا رہے ہو۔ شانی بی بی کا
ہوا ہے؟“

وہ بولا۔ ”میں نے کہا تھا کہ نمونیا ہو گیا ہے۔“
”وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔“

”اور کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“
”اِس کے سر کے بال اور قمیص بھیگی ہوئی کیوں ہے؟“

وہ سر جھکا کر بولا۔ ”یہ بدتمیزی کرنے لگی تھی۔ میں نے پانی کا جگ اِس پر انڈیل دیا ہے۔
وہ اُسے کوسنے لگی۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے اُس کی بددعا میں منتا رہا۔ جان چڑا۔
کیلئے اُسے دودھ گرم کر کے لانے کیلئے کچن میں بھیجا اور خود شانی کے گالوں کو تھپتانے کا
سویا ہوا حسن ابھی تک آگ پکڑے ہوئے تھا۔ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ”شاہانہ!
کیا تم ہوش میں ہو؟“

اُس نے یکبارگی آنکھیں کھول دیں۔ ارد گرد دیکھا۔ اُس پر نگاہ پڑی تو نگاہ ٹھہر گئی
منٹ بھر بغیر پلکیں جھپکائے اُسے دیکھتی رہی۔ جونہی آنکھیں بند کیں، پانی کی دھیر
آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر کانوں کی طرف ریگ گئیں۔ اُس نے ہاتھ کی پوروں سے
اُس کے آنسو پونچھے اور گہرے تاسف سے کہا۔ ”مجھے معاف کر دینا شاہانہ! میں
تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔“

نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دب کر ضبط کرنے لگی۔ وہ بولا۔ ”مجھے برا بھلا کہو، مجھے
ٹھنڈے پانی کا جگ انڈیل دو، اپنے باپ سے کہہ دو کہ وہ مجھے نوکری سے فارغ کر دے۔
میں ہر سزا بھگتے کو تیار ہوں مگر یوں روؤ مت، مجھ سے تمہارا روٹا دیکھا نہیں جاتا۔“

”بی بی بھی ننگے پرتیا نہیں ہوتا۔“

وہ اپنے خشک ہوتے ہوئے زبان سے تر کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تمہیں بڑے خوب سے دیکھا ہے، پرکھا ہے، تم لوگوں سے ہٹ کر ہو۔“

وہ اچانک مسکرانے لگا۔ وہ استفہامیہ نگاہوں سے اُسے گھورنے لگی۔ وہ بولا۔ ”ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دودھ کے ساتھ گولیاں کھانی ہیں۔ میں نے تمہیں دودھ پلا دیا، گولیاں کھانا بول گیا۔ اب تمہیں دودھ کا ایک اور پیالہ پینا پڑے گا۔ میں ابھی رحمت بی سے لے کر آتا ہوں۔“

وہ روکتی رہی مگر وہ رکنا نہیں اور پیالہ اٹھا کر کچن کی طرف چل دیا۔ پانچ دس منٹ بعد دودھ کا پیالہ تھامے کمرے میں آیا۔ گولیاں پٹوں میں سے نکال کر اُس کی تھیلی پر رکھیں اور دودھ کا پیالہ اُس کی سمت بڑھایا۔ وہ مسکرائی۔ ”کیا اتنی دیر میں میں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں؟“

”نہم دودھ پلانے کی بجائے پیالہ میری طرف بڑھا رہے ہو؟“

وہ بے بسی سے دیکھنے لگا۔ بہانہ بنانے کیلئے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ وہ اُسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے سگریٹ کا دھواں بہت ناگوار لگتا ہے۔“

وہ لباش لے کر بولا۔ ”اور میں اس کے بغیر رہنا نہیں چاہتا۔“

دو پیالہ تھامے ساکت بیٹھی تھی۔ دل میں سوچنے لگی۔ ”اگر اپنے ہاتھ سے پینے میں مزہ لگا تو ساقی گری کیا ہے؟ نئے خانہ کیا ہے؟ پینے والے کی دیوانگی کیا ہے؟..... میں اگر اپنے بچہ کو کہوں کہ مجھے اپنے ہاتھ سے دودھ پلاؤ تو بے وقور ہو جاؤں گی۔ اپنے ہاتھ سے بچاؤ تو بے ذائقہ لگے گا۔ ایسے میں کوئی تو ہو جو میری مدد کرے!“

مدد کرنے والا عین موقع پر پہنچ گیا۔

سوچا اور بڑے لگے بٹن کو آن کرتے ہی کمرے میں روشنی پھیل جاتی ہے۔ کبھی کبھی دعا کی طرح غیر معمولی سرعت سے اوپر جاتی ہے اور اسی رفتار سے قبولیت کا ہار پہنے پلٹ جاتی ہے۔ اُس کی ذمہ داری بھی ایسی ہی پرواز کی تھی۔ دروازے میں آ کر ٹھہرنے والی رحمت نے کہا۔ ”اے عالمگیر! میں نے تجھے کہا تھا کہ بی بی کو اپنے ہاتھوں سے دودھ پلانا۔ تم نے کہا کہ ہاتھ میں پیالہ تھا کہ اس ٹکڑی سگریٹ کو پینے میں بخت لگے ہو۔ تم پرتف ہے!“

”چونکہ میں پیالہ تھا کہ اس ٹکڑی سگریٹ کو پینے میں بخت لگے ہو۔ تم پرتف ہے!“

آتش زاد — 190

دودھ کا پیالہ تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے اتنا قریب دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ اپنے سر کو اوپر نیچے حرکت دینے لگی۔ یوں جیسے وہ آن کی آن میں شانی بی بی کے بیمار ہونے کے سبب تک پہنچ گئی ہو۔ عالمگیر کے قریب تپائی پر دودھ کا پیالہ رکھ کر بولی۔ ”تم نے ہی بی بی کو ٹھنڈا کیا تھا، اب اپنے ہاتھ سے دودھ پلا کر گرم بھی کرو۔“

ایک نلہ غلط دونوں پر ڈال کر اُلٹے پیروں کمرے سے نکل گئی۔ عالمگیر نے ہاتھ چھڑائے، پیالہ اٹھا کر اُسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کہنیوں کے بل اٹھ بیٹھی۔ خاموشی کی زبان میں کہنے لگی۔ ”رحمت بی نے کہا ہے کہ اپنے ہاتھوں دودھ پلا کر گرم کرو۔ کیا تم نے رحمت بی کی بات کو سنا نہیں یا سمجھنا نہیں چاہ رہے ہو۔“

اس نے آہستگی سے دودھ کا پیالہ اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ ایک گھونٹ بھرتی، اُس پر ایک نگاہ ڈالتی۔ اس طرح شاید اُس نے زندگی میں کبھی بھی دودھ نہیں پیا تھا۔ ہر نگاہ چیخ کر کہتی تھی۔ ”دودھ کا گھونٹ پیٹ میں اترتا ہے، تمہیں نظر کے راستے سیدھا دل میں اتار رہی ہوں۔“

وہ ہولے سے بولا۔ ”شاہانہ! تمہارا کہنا سچ ہے، سوچنا جھوٹ ہے۔ ہم دونوں کی کلاسوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ ٹھنڈا پانی تمہارے دماغ کا بخار اتار دے گا مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے الٹا اثر لے لیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک انسان ہونے کے ناتے مجھے بھی محبت کرنے کا پورا حق حاصل ہے مگر یہ بھی درست ہے کہ میں لوہے کی کلاس سے تعلق رکھنے والا عام سامر دوں جو تمہارے باپ کے نزدیک ایک کتے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔“

وہ بے چین سی ہو گئی۔ زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے صرف اتنا یقین دلا دو کہ مجھے میری خامیوں سمیت قبول کر لو گے۔ میرے گناہوں پر اپنی محبت کو سب سے زیادہ کر دو گے تو میں ہر تفریق کو مٹا دوں گی۔ عالمگیر! میں ایک محبت کرنے والے جھوٹے کو ایک سچے دلدار کیلئے ہمیشہ کیلئے چھوڑ آئی ہوں۔ پلیز! مجھے یقین دلا دو۔“

پیالہ خالی ہو چکا تھا۔ اُس نے تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ رہی خامیوں کی بات، تو یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ دنیا کا کوئی انسان بھی خامیوں سے مبرا نہیں ہے۔ ہم ہر اُس خامی سے بھاہ کر لیتے ہیں جس کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔ کبھی دیکھ کر

برہی روح کو قرا مل جائے۔“

”سکرایا۔“ ماں! تم دیکھتی جاؤ کہ میں کیا کرتا ہوں۔ میری فصل پکنے والی ہے۔ آسمان تک دکھائی دینے والے اونچے پتے پر بیٹھ کر تمہیں دکھاؤں گا کہ علم دین سے عالمگیر بننے میں کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ باپ مجھ پر اعتماد کرتا ہے، بیٹی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں دونوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں، آنے والا وقت تمہیں بتا دے گا۔“

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر لاسٹر کے پش بٹن پر دھرا ہوا عالمگیر کا انگوٹھا غیر ارادی طور پر اپنی گرفت کھو بیٹھا جس کی وجہ سے شعلہ بجھ گیا اور ماں اوجھل ہو گئی۔ اُس نے جلدی سے لاسٹر آن کیا مگر جانے والی اپنی نصیحتیں سمیٹ کر جا چکی تھی۔ خواہش کے باوجود لوٹ کر نہیں آئی تو دیکھی ہوئی سگریٹ کو سلگانے لگا۔

صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا اور شانی کے بارے میں سوچنے لگا۔ چشم تصور میں برف میں لگی ہوئی آگ کا نظارہ کرنے لگا۔ ایسے میں موبائل فون کا بزربول پڑا۔ سردار فضل خان رابطہ کر رہا تھا۔ اُس نے فون آن کرتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو سردار! کہو کیسی گزر رہی ہے؟“

”یار عالمگیر! وہ رفیع اللہ یہاں پہنچ گیا ہے۔ کل شام مجھ سے ملنے کیلئے آیا تھا۔ اُس کے بارے میں جو کچھ سُن رکھا تھا، اُسے سچ پایا۔ اُس نے چائے کا ایک کپ پینا بھی گوارا نہیں کیا۔ مجھے دھکا کر گیا ہے۔ کہتا تھا کہ جب تک وہ اس علاقے کے تھانے میں رہے گا، میں اپنی ذیلیاں اپنی بغلوں میں دبا کر رکھنا ہوں گی۔“

عالمگیر نے پوچھا۔ ”تمہارا رویہ اُس کے ساتھ کیسا رہا؟“

”ظاہر ہے کہ میں نے بھی اُسے ڈرایا دھمکایا۔ اُسے بتلایا کہ میری پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ بہتر ہے کہ وہ مجھ سے دور رہے۔“

”ایسا نہیں کرتا تھا سردار!“ عالمگیر نے پریشان ہو کر کہا۔ ”ایماندار پولیس آفیسر کے اقتدارات اور قوت کا ہم لوگ مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ بہر حال بشیر خان سے کہو کہ وہ اپنی کمریاں محذو کر دے۔ رفیع اللہ پانچ پکڑ کر کمر تک پہنچ جاتا ہے۔“

”اس طرح تو لوکل ایکشن ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

”چوہدری باسط کی ناوقت موت نے پہلے ہی ہمیں بے دست و پا کر دیا ہے۔ ملک فرید کا امیدوار کوکھڑا کر رہا ہے؟“

آتش زاد — 192

دیکھا۔ وہ شرارت اور امید بھری نگاہوں سے دیکھ کر خاموش التجا کر رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ لمحے شاید اسی وقت کے انتظار میں تھے۔ شب خون مار کر دونوں کی آگئی عمریں چُرا لے گئے۔ سیانے سچ کہتے ہیں کہ برسوں کے سوئے ہوئے احساسات کو محبت پہلا لمحہ ہی جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتا ہے۔ اُس نے شاہانہ کے ہاتھ سے پیالہ تمام لیا۔ مرینر نے پانی کے ساتھ گولیاں حلق میں اتاریں۔ محبوب کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی زندگی کی شراب کو منہ سے لگاتے ہوئے کن اکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ عالمگیر کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی نگاہیں کہہ رہی ہوں۔ ”اے بھاگتے رہنے والے! تمہیں میں نے ایک لمحے پر ساکت کر ہی دیا ناں! اب بھاگ کر دکھاؤ تو جانوں۔“

اُس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ دل دھڑک اٹھا۔ ”میری طرف کیا دیکھتے ہو؟ میں تو پیلے ہی اُسے اپنے تخت پر براجمان کئے بیٹھا ہوں۔ تم ہی اُن کا راگ الاپتے رہتے تھے۔ اب اُن کا راگ ملہار کو چھوڑ کر پیار کے رباب کی مدھرتا میں چھیڑو۔ یہی وقت اور جوانی کا تقاضا ہے۔“

اُس نے سر بہوڑا لیا۔ واقعی یہی اُس وقت کی پکار تھی جسے سننا ضروری تھا۔ وہ دودھ پی کر لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی گہری نیند میں چلی گئی۔ عالمگیر کچھ دیر تک وہیں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ چونکہ وہ دن میں سونے کا مانا نہیں تھا، اس لئے ٹہلنے کیلئے نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں ہی اس شغل سے بھی جی اکتا گیا تو پلٹ آیا۔ دروازہ بند کرنے سے کمرے میں ملجوا سا اندھیرا پھیل گیا۔ ٹیوب لائٹ آن کر کے صوفے میں ڈھسے سا گیا اور اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب یہی حالات نے اُسی کی خواہش کے مطابق کروٹیں بدلی تھیں۔ آگے کیا ہونے والا تھا؟ یہ اُن سمیت کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

سگریٹ سلگانے کیلئے گیس والا لاسٹر جلایا۔ نیلا شعلہ سگریٹ کی طرف پکا۔ یوں لگا جیسے اُس کا بدن سگریٹ سے چھو کر سگریٹ بن گیا ہو۔ روئیں روئیں میں آگ کی تپش بھرتی۔ اُس نے لاسٹر کو آن ہی رکھا۔ شعلے میں اُس کی ماں کے خال و خد واضح ہونے لگے۔ نظریں جمائے عدم سے وجود میں آنے والی کو دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”تم نے برائیاں کرنے کرتے اچھائی کا ایک بیج بو دیا ہے۔ کتنا ہی اچھا ہو کہ تم عالمگیر سے پھر علم دین بن جاؤ۔“

”کے؟“
 اُس نے بشر خان اور منیرے قصائی سے یکے بعد دیگرے رابطہ کیا اور حلقے کی صورت
 مل سے آگہی حاصل کی۔ سردار نے سچ کہا تھا۔ رفیع اللہ کی آمد نے نظم سیاست کی تیزی
 سے چلتی گاڑی کے پہیوں سے ہوا نکال دی تھی۔ فون بند کر کے الماری تک گیا۔ الماری
 مٹا چھا کر رکھے چرمی بیگ کو نکالا اور میز پر رکھ کر کھول دیا۔ بیگ کھلنے سے ایک دنیا برآمد
 ہوئی اور گلوب کی شکل اختیار کرتی گئی۔ بہت سی فائلیں، کاغذات کے پلندے، دو
 آڈیو کیسٹیں، دو وڈیو ڈسکیں اور تین وڈیو کیسٹیں بھی نکلیں جنہیں پولی تحصین کے لفافوں میں
 بڑی احتیاط سے بند کیا گیا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں اُن گنت اور بے نام خواب سجائے
 انہیں فرط اشتیاق سے دیکھتا رہا اور ایک خاص ترتیب سے رکھتا رہا۔ یہ سردار فضل خان کی
 زندگی کا کچا چھٹا تھا جس کے کھلنے کا وقت آنے والا تھا۔ عالمگیر کی تین سالوں کی محنت اپنا ثمر
 تلاش کرنے کیلئے اس بیگ سے نکلنے کیلئے بے تاب تھی۔

وہ اس چرمی بیگ کو کسی بھی اعلیٰ عدالت میں جا کر کھول دیتا تو سردار فضل خان پر خونخوار
 کون کا جنگلا کھل جاتا اور اُس کی ٹکا بوٹی کردی جاتی۔ سفارشیں، پرمٹ، غیر ملکی انجینئروں
 سے تعلقات کے ثبوت، راتوں رات زمین سے آسمان تک بلند ہونے والے اکاؤنٹس کی
 مدد تفسیلات، سردار کے جرائم کے مکمل سمعی و بصری ثبوت، شاہانہ کے اغوا کی داستان
 اللہ جانے کیا کچھ اُس نے سمیٹ رکھا تھا۔ انسان محبت اور نفرت میں حد سے گزر جاتا
 ہے۔ دقتی ہوئی آگ پر برہنہ پا چل سکتا ہے۔ وہ بھی نفرت کی انتہا پر پہنچ کر یہ سب کچھ
 کر رہا تھا۔ اُس کے وجود میں بچپن سے آگ کا الاؤ دکھتا چلا آ رہا تھا۔ سر میں پانی ڈالنے
 سے بدن کی بیرونی تہہ ٹھنڈی ہو جاتی تھی۔ اندر کے شعلوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس
 آتش کو سرد کرنے کیلئے وہ گزشتہ تین سالوں سے جگ میں پانی بھر رہا تھا۔ کسی مناسب
 وقت کے انتظار میں اُس کا چرمی بیگ بھرتا چلا گیا تھا۔ شاہانہ اُس کی مٹھی میں آرہی تھی۔
 نئے کی کوشش اُسے بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔ اُس محاذ کی طرف سے مطمئن ہو کر اُس نے
 بالاصلات جلا کر نیا چولہا جلاتے ہوئے پانی بھری کیتلی چڑھا دیا۔ موبائل فون میں نئی ہم ڈال
 کر سردار فضل خان کو خبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر آواز اور لہجہ بدل کر بولا۔ ”میں سردار فضل خان
 سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ اپنے منجھلے بیٹے ملک ارشد فرید کو سامنے لا رہا ہے۔ اُس کے ساتھ وہی شکور بٹھان
 بطور نائب ناظم کھڑا ہوگا۔“ سردار کی پریشانی بجاحتی۔ حریف کا مقابلہ کرنے کیلئے دو بے
 سپر ہو چکا تھا۔ اُسے پورے حلقے میں سے دونوں کی ٹکر کا امیدوار نہیں مل سکتا تھا۔ بولا۔
 ”بڑی سرکار کا ہر روز جنگی بھرا فون آتا ہے۔ اوپر والے میری مجبوری کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔
 کیا ایسا ممکن ہے کہ تم دس پندرہ دنوں کیلئے یہاں آ جاؤ۔“
 ”میں وہاں آ کر کیا کروں گا؟“

”مجھے یقین ہے کہ تم کوئی نہ کوئی راہ نکال لو گے۔“

”میرا یہاں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ شاہانہ ایک لمحے کیلئے بھی مجھے اپنے پاس سے ہٹے
 نہیں دیتی۔“ وہ بولا۔ ”مجھے اس اعتراف میں کوئی عار نہیں ہے کہ میں رفیع اللہ کا مقابلہ
 نہیں کر سکتا۔ ہماری تمام کاروائیوں کے عقب میں پولیس والوں کی بے ایمانی کھڑی ہوتی
 ہے۔ رفیع اللہ ہماری کوئی ترکیب بھی کارگر نہیں ہونے دے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم
 اُس سے دور رہیں۔ مار کھانے سے بھاگ جانا بہتر ہوتا ہے۔“

سردار نے بتلایا۔ ”سننے میں آیا ہے کہ ملک فرید اپنے بیٹے کی شادی چوہدری باسٹلی
 بیٹی سے کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ابتدائی بات چیت بھی ہو چکی ہے۔ تم ایسا کرو کہ لڑکی کی
 تمام وڈیو کیسٹیں ضائع کر دو۔ تمام ثبوت تلف کر دو۔ چونکہ چوہدری باسٹلی مرچکا ہے اور
 ہمارے کام نہیں آ سکتا، اس لئے ان چیزوں کو جلا دینا ہی بہتر ہوگا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ چوہدری
 کی گردن کیلئے تیار کیا ہوا پھندا ہمارے گلے میں پڑ جائے۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟“
 وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم واقعی درست کہتے ہو سردار! میں ایسا
 کروں گا۔ مگر اُس فلم کی کاپی یا کاپیاں بڑی سرکار کے گرگوں کے پاس بھی موجود ہوں گی۔
 اُن کا کیا کیا جائے؟“

سردار نے کہا۔ ”دو دن بعد میں بڑی سرکار سے ملنے کیلئے شہر جا رہا ہوں۔ اُس سے
 بات کروں گا۔“

پھر سردار اُسے شانی کی حفاظت کی تاکید کرنے لگا۔ رابطہ منقطع ہونے پر عالمگیر کے
 ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تیر گئی۔ دل ہی دل میں سردار پر لعنت بھیجتے ہوئے سوچنے لگا۔
 ”تمہارے تابوت میں ٹھونکی جانے والی کیلوں کو ضائع کر دوں؟ ایسا کرنے پر کون مجھے غلط

کے کمر درخشا، بظاہر دلیر بننے ہوئے بولا۔ ”میرا آج تک انڈر ورلڈ کے بڑوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ اگر تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو تو خالی خولی دھمکیاں دینے کی بجائے اپنے بازو کی قوت دکھاؤ۔“

ہالگیر کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تیر گئی۔ سردار اُس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسا آسانی سے پھنس رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”اب تم نے عقلمندوں والی بات کی ہے۔ کچھ چیزیں ہمارے دست راست عالمگیر پاس دو دن تک پہنچا دی جائیں گی۔ وہ تم تک پہنچا دے گا۔ انہیں دیکھ کر، سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ گردن اکڑائے رکھنے سے کٹ جائے گی۔ عقل مندوں کی طرح جھکا دینے سے جان بچ جائے گی۔“

وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں۔ عالمگیر کو مت دینا۔ تم کو ریسربرس کے ذریعے بھجوا دو۔“

”ناکر ایجنسیاں تمہارے پیچھے لگ جائیں اور تم وقت سے پہلے ہی پھانسی کے پھندے پر لٹ جاؤ۔“

”حق سیاست دان! راز کو دیواروں کی اندھی آنکھوں سے بھی بچا کر رکھنا پڑتا ہے۔ اگر تم عالمگیر پر اعتماد نہیں رکھتے تو کوئی بات نہیں، جہاں کہو، وہیں پہنچا دی جائیں گی۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اپنے تمام کارندوں کا دل ہی دل میں احاطہ کیا۔ سب کی وفاداری کو پرکھا۔ عالمگیر سب پر حاوی پڑتا دکھائی دیا تو ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم عالمگیر سے رابطہ کر لیتا۔“

”اُدھے! تین دن بعد رابطہ ہوگا۔“

اُس نے فون بند کر کے جلدی سے سیم بدل ڈالی۔ ابھی فون آن کیا ہی تھا کہ سردار فضل کا نام مئی سکرین پر میوزک کے ردھم پر چمکنے لگا۔ اُس نے کال اٹینڈ کی۔ سردار گھبرائے۔

”جسے لہجے میں بول رہا تھا۔“ عالمگیر! تم انڈر ورلڈ کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو، مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“

ہالگیر نے چونک کر پوچھا۔ ”سردار! تم اُن لوگوں کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟“

سردار بولا۔ ”ابھی کچھ ہی دیر پہلے انڈر ورلڈ کے تھرڈ مین نے فون پر مجھے دھمکیاں دی تھیں۔“

”میں سردار فضل خان بول رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے تعجب آمیز آواز آئی۔

”آپ کون ہیں؟“

وہ بولا۔ ”میں دوشکاریوں کے درمیان فاصلے مٹانے والا تھرڈ مین ہوں۔ تم مجھے اپنا نام سے پکار سکتے ہو۔“

سردار کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ”کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”تم اپنی چھوٹی سی ریاست کے راجہ ہو۔ راج ہمیشہ مہاراج کی شہ پر قائم رہتا ہے۔ مہاراج نے تمہارے راج کے دن گنتا شروع کر دیے ہیں۔ تم یہ تو جانتے ہی ہو گے کہ راج کے چھن جانے پر ماضی کے راج محل کے چور دروازوں سے نکل کر مزدوروں کا بھیس بدل لیتے تھے اور حیاتی کے رہتے دن گنتی میں چوروں کی طرح گزار دیتے تھے۔“ عالمگیر نے لہجے میں بے حد سفاکی تھی۔

”سک..... کون ہو تم؟“ سردار کا گھبراہٹ میں لہجہ لکنت زدہ ہو گیا۔ ”میری بھئی کچھ نہیں آیا۔ کھل کر کہو۔“

وہ اپنے لہجے کو مزید ہولناک بناتے ہوئے بولا۔ ”میں کون ہوں؟ یہ تمہیں بتا جاؤ گا۔ کیا چاہتا ہوں، یہ بھی اشاروں کی زبان میں بتا چکا ہوں۔ تفصیل سننا چاہتے تو سنو۔ یہ تو جانتے ہی ہو گے کہ ملک کے طول و عرض پر انڈر ورلڈ کی حکمرانی قائم ہے۔ تم سب نادیہ انگلیوں پر ناپنے والے مہرے ہو۔ وہ نادیہ ہاتھ تمہیں سیاست کی بساط سے اوجھل کرنا چاہتے ہیں۔“

سردار کی برداشت جواب دینے لگی۔ چلاتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس تمہاری بکواس سننے کا وقت نہیں ہے۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔“

وہ بے ڈھنگے انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”تمہارا ایک شاہ زور ہماری نظروں میں آ گیا ہے جسے تم نے اپنی بیٹی کی حفاظت کیلئے بھیجا ہے۔ اُس جیسے سینکڑوں کتے انڈر ورلڈ کے مہاراج کے پھٹوں تلے غراتے رہتے ہیں۔ تمہارے پاس موجود تمہارے گینگ پر بھی ہماری نظر ہے۔ اپنی اور اپنے متعلقین کی عافیت چاہتے ہو تو میرا حکم بلا چون و چرا ماننے جاؤ ورنہ تم پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔“

زندگی میں کبھی کسی نے اُس کے سامنے اتنے بڑے بول نہیں بولے تھے۔ ڈر گیا۔

آتش زاد

”اوہ نوسردار! یہ تم کس مصیبت کو گلے لگا بیٹھے ہو!“ عالمگیر نے گہری تشویش کا کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو بہت ظالم اور طاقتور لوگ ہیں۔ تھرڈ مین نے کوئی مطالبہ پیش کیا“ ”ابھی تو اُس نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے اُس کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہو اُسے کہا ہے کہ وہ انڈر ورلڈ کے ہاتھوں میں دبے پتے شو کرائے۔ وہ تمہارے تو اپنے پتے دو تین دنوں میں مجھ تک پہنچا دے گا۔“ سردار فضل کا لہجہ کھوکھلا ہوتا جا رہا تھا۔ عالمگیر نے کہا۔ ”تم نے بہت بڑی غلطی کی سردار! اب اگر اُس کا فون آئے تو بلا جاؤ۔ جہاں اُس کا مطالبہ مان لیتا۔ اسی میں تمہاری عافیت ہے۔“

سردار کو ڈرانے کیلئے وہ انڈر ورلڈ کے مظالم اور غیر معمولی دسترس کو ظاہر کرنے والی خونی واقعات سنانے لگا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ سردار ہر آنے والے لمحے میں بزدل پڑتا تھا۔ سامنے کھڑے دشمن سے ڈرنے والا نہیں تھا، سات پردوں میں چھپے ہوئے بڑے کے ڈر سے اُس کا پتہ پانی ہونے لگا تھا۔ منت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ ”میری طاقت تم مجھے اس افتاد سے نکالنے کیلئے شیروں کی طرح اُن کی کھجار پر جھپٹ پڑو۔ انہیں بچنے نہ دینا۔“

وہ لہجے میں بے بسی سموتے ہوئے بولا۔ ”اُن سے ٹکر لینے کیلئے ہزاروں کی مبلغ بھی ناکافی ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ ایک جان ہے، کہو تو تم پر لٹا دوں، کہو تو شانی بی بی ٹار کر دوں۔ تمہاری مرضی ہے۔ یہاں رکھو یا اپنے پاس بلا لو۔“

چند لمحے دونوں طرف سنگین خاموشی طاری رہی۔ طویل سانس تھنوں سے خارج کر۔ ہوئے سردار نے کہا۔ ”تم بی بی کے پاس رہو۔ لگتا ہے میرا تختہ اُلٹنے والا ہے۔ میں اسے طور پر کچھ کرتا ہوں۔ آگے اللہ مالک ہے!“

رابطہ منقطع ہونے پر عالمگیر مسکرانے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ چرمی بیگ میں چھپے ہوئے سانپوں کی نگہیں دیکھ کر سردار کی بولتی بند ہو جائے گی۔ پھر وہ جیسا کہے گا، وہ آنکھیں پکڑ کر کے ویسا ہی کرے گا۔ گزشتہ تین سالوں میں وقت فوقتاً فرضی کہانیاں سنا کر سردار فضل کے شعور میں اُس نے انڈر ورلڈ کا ڈراؤنا ہوا اکھڑا کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے کہا تھا۔ ”سردار! تمہاری متروک حویلی اور اُس میں رہنے والے ہکرے تمہاری طاقت ہیں۔ ایک ہزار گنا بڑھاؤ تب جا کے انڈر ورلڈ کے برابر طاقتور بنو گے۔“

سردار فضل اپنی تمام عمر میں بمشکل ایک چھٹانک ہو پایا تھا۔ سیر اور سوا سیر سے ٹکراؤ کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ منوں وزنی پڑوں میں ہاتھ ڈالنے کی جرأت کیسے کر سکتا تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ گھر کے بھیدی نے لٹکا ڈھانے کیلئے گھر کی بنیادیں ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر نکال کر دی تھیں۔ عالمگیر کو صوفے میں بیٹھے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ پیشانی کو مسلتے ہوئے عین سوچوں میں گم تھا۔ ایسے میں رحمت بی نے اُس کی محویت توڑ کر شانی بی بی کا پیغام بیا۔ ”وہ تمہیں بلارہی ہے۔“

”کیوں؟“

عجیب سی نگاہ اُس پر ڈال کر وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ اُس کی نگاہ نے جیسے اُسے کہا ہو۔ ”میں بھی دو بڑوں کے بیچ میں کھڑی تھرڈ ویمین ہوں۔ کہانیاں سنانے بیٹھ گئی تو بوس ہاؤں گی۔ میرا ہوا کے جھونکوں کی طرح آنا جانا لگا رہتا ہے۔ آتی ہوں تو عشق کے سینے میں آنکھیں بھر جاتی ہے۔ پلٹ کر جاتے ہوئے تمہاری لالشیں دور پھینکنے کیلئے اٹھا لے جاتی ہوں۔“

وہ انگریزی لے کر کھڑا ہو گیا۔



جلدی سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ آنے والی زری تھی۔ وہ چائے ٹرے میں رکھ کر لائی تھی۔ دونوں کو خاموش بیٹھ دیکھ کر شرارت سے بولی۔ ”لگتا ہے آپ دونوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہے۔ چلیں کیا یاد کریں گے۔ چائے پیس اور ایک بار پھر موقع سے فائدہ اٹھائیں۔“ وہ کھیانی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ چائے رکھ کر زری لہراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ کمرے کی فضا میں پھر خوشبوئیں پھیلنے لگیں۔ امجد نے کہا۔ ”بتول! میں نے منیرے قصائی کو راز داری کی شرط پر تمام قصہ سنا دیا ہے۔ وہ اپنی تمام مصروفیات زری کر کے ہمارے دشمن کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا ہے۔ اُس نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ اس کھیل کے پیچھے بڑی سرکار کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ بڑی سرکار سردار مظفر علی خان کا تک نیم ہے۔“ وہ بولی۔ ”اُسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

اُس نے سمجھایا۔ ”یہ سیاست کی کتاب کے کالے اوراق ہیں۔ تم سمجھ نہیں پاؤ گی۔ منیرے کا خیال ہے کہ تمہارے باپ کو جیتنے کے بعد اپنی پارٹی میں لانے کیلئے وہ بلیک میل کرنا چاہتا ہوگا۔ اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ غیرت مند باپ بیٹی کے بدن کی برہنگی پر بلیک میل نہیں ہوتے، دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔“ وہ پشیمانی سے سر جھکا کر بولی۔ ”ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔ کیا ہم بڑی سرکار سے ماسٹر کا پی حاصل کر سکتے ہیں؟“

امجد حقیقت پسند انسان تھا۔ جھوٹے دعوؤں کی بیساکھی پر چلنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ بولا۔ ”اُس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میرے اختیارات کی حد سے کہیں باہر..... ہاں مگر منیرے کی ملاصحتوں پر مجھے اعتماد ہے۔ جو ترکہ چھیننا نہ جاسکتا ہو، وہ چرا لیا جاتا ہے۔ منیرا کسی نہ کی طرح ماسٹر فام حاصل کر لے گا۔“

بتول نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ امجد کے پہلو کی جیب میں سے ایک مرف گیت کی دھنیں پھوٹ پڑیں۔ اُس نے موبائل فون نکال کر نمبر دیکھا۔ بولا۔ ”منیرا شے کال کر رہا ہے۔“

پھر نون آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بھی منیرے! کہاں ہو تم؟“ ”سری طرف کی بات توجہ سے سنتا رہا۔ پھر کچھ ہدایات دے کر فون بند کرتے ہوئے بولا۔ ”منیرا کہہ رہا تھا کہ اُس کا اندازہ درست نکلا۔ فلم بڑی سرکار کے گرگوں نے اُنسی کے

اُس سے لپٹتے ہوئے خوشی سے چلائی۔ ”ہائے باجی! تمہارا ناکہ تو بھر دیا گیا ہے۔ اب ہر روز کان کھول کر، جی بھر کر سنتے رہنا..... آئی لو یو بتول! آئی لو یو.....“ ایک جھٹکے سے اُسے الگ کر کے ہانہوں میں سر دے کر شرم سے گلزار ہوتے ہوئے بیٹھ گئی۔ زبان نہ نہ کر رہی تھی، دل چنگیاں لے رہا تھا کہ امجد کے نام پر چھیڑنے والی کے ہاتھ کو مت روکو۔ زری کی شرارتیں اُس کے جوان مرمریں بدن میں اُلوی ترنگ بھری تھیں اور وہ بے خود ہوتی جا رہی تھی۔

باپ کے جانے کے گھنٹہ بھر کے بعد بیٹا کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا۔ دروازے کے بیچ کھڑا ہو کر طاق پر انگلی کی ضربیں لگاتے ہوئے اجازت کا طلبگار ہوا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مسکراتے ہوئے کرسی پر براجمان ہو گیا۔ بولا۔ ”کیسی ہو؟“

”ٹھیک۔ آپ کیسے ہیں؟“ ”میں بھی ایک دم فٹ!“

زری اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ اُسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کتنے عام سے انداز میں تمہاری اماں نے تمہیں میرے نام کر دیا ہے۔ کوئی دھماکہ نہیں ہوا، کوئی دھماچو کڑی برپا نہیں ہوئی، کوئی ہاہا کار نہیں مچی.....“

وہ مسکراتے ہوئے نظریں پڑانے لگی۔ ”دھماکے اور چھناکے دل ٹوٹنے پر سنائی دیتے ہیں، دل آباد ہونے پر نہیں۔“

اٹھ کر اُس کے پاس بیٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ ایک دو فٹ پیچھے کھسک گئی۔ وہ بولا۔ ”ترب آنے دو۔ میں اب تمہارا ہوں۔ اپنی چیز سے دور ہٹنا اچھا نہیں ہوتا۔“

وہ بولی۔ ”اپنی چیز پر جھپٹنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ہنسی میں زندگی تھی، جان تھی، وقار تھا۔ بولا۔ ”منیرے باپ اور بھائی نے فیصلہ کیا ہے کہ انتخابات کے فوری بعد ہماری شادی کر دی جائے گی۔“

وہ بھی ہنسنے لگی۔ گھٹنوں پر ہانہیں رکھیں، اُن پر پیشانی ٹکا کر چہرہ چھپا لیا۔ چاند بدلیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ بولی۔ ”تب آپ کو اپنی چیز پر جھپٹنے کا پورا حق حاصل ہوگا۔“ زندگی..... اپنی رعنائیاں اوڑھے پیچھے کی اور ہٹ رہی تھی۔ زندگی کا طلبگار اُس کے کی آشنائی کشید کرنے کیلئے مر مٹ رہا تھا۔ برا آمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ بن کر

طرف پلٹنے والے! زندگی کے ہر موڑ پر اپنی آنکھیں تمہارے پیروں تلے بچھاتی رہوں گی۔
وہ متفہم ہوا۔ ”کیا سوچ رہی ہو؟“

اُس نے ہاتھوں کے اوپر سے آنکھوں کو پورا کھول کر اپنے محبوب کو دیکھا اور مدھم سی آواز میں بولی۔ ”کچھ بھی تو نہیں.....“

گلابی ڈوروں والی آنکھوں اور شرم سے لال گوں آدھے چہرے کو دیکھ کر وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پک کر قریب آ گیا۔ اُس کے سنبھلنے اور پیچھے ہٹنے سے پہلے ہی اُس نے دونوں شانوں سے پکڑ کر اُس کی آنکھیں چوم لیں۔ جلدی سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ جذبات کی حدت پر مضطرب تنفس کو قابو میں لیتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”میں انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر سوچا کرتا تھا کہ لوگ کیسے بے قابو ہو کر جرم کر بیٹھتے ہیں۔ ضخیم کتابیں جس نکتے کی آج تک وضاحت نہیں کر پائیں، محبوبہ کی ایک ادا نے ہی وضاحتوں کے اُن گنت باب کھول کر میرے سامنے رکھ دیے ہیں۔“

شرماری آنکھوں میں بھر کر جلدی سے باہر نکل گیا۔ وہ اپنے عاشق کی بے ساختہ جرات پر بے دم ہو کر پیچھے کی طرف گر پڑی۔ دایاں ہاتھ منہ پر، بایاں بازو آنکھوں پر رکھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ میلوں دوڑنے سے بھی سانس یوں پھولا نہیں کرتا۔ سوچنے لگی۔ ”ہائے اللہ! آن کی آن میں یہ کیسی آگ تن بدن میں بھڑک اٹھی ہے۔ کوئی شعلہ، کوئی انگارہ، کوئی لوتیک دکھائی نہیں دیتی مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پورے کا پورا بدن شعلوں کی آج پر دھکنے لگا ہو۔ جب مجھ برف پر لگی ہوئی شیشے کی بے داغ اور اُن چھوٹی بوتل کو اٹھا کر دھکتے ہوئے تنور میں ڈالا گیا تھا، تب بدن نے تپش نہیں پکڑی تھی۔ مُردوں کی طرح ٹکست خوردہ بساط پر ٹھنڈا ٹھار پڑا رہا تھا۔ اب کیسے چھوٹنے پر انگارہ بن اٹھتا ہے۔ اے! کوئی تو بتلائے کہ یہ سب کیا ہے؟ اے مٹی کی مورتی میں جان ڈالنے والے! تم تو کائنات کے ہر اسرار کے امین ہو۔ ایک یہی راز مجھ پر کھول کر احسان کر دو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔“

پاگل کرنے والا اُسے اپنی چشم تصور میں بیٹھا کر اپنے بھائی کیلئے حلقے میں دوٹ مانتے کیلئے نکل کھڑا ہوا تھا۔



حکم پر بنائی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے اغوا کرنے میں سردار فضل خان کے بندوں کا بھی ہاتھ ہو۔“

دس منٹ کے بعد پھر منیر نے رابطہ کر کے بتلایا۔ ”ملک جی! میں نے اپنے ایک سگ سے رابطہ کیا ہے۔ وہ سردار فضل خان کا دست راست ہے۔ آج کل لاہور میں رہ رہا ہے۔ اُس نے مجھے بتلایا ہے کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد یہاں آئے گا اور بڑی سرکار کے گرگوں سے قلم حاصل کر کے ہمیں دے دے گا۔“

ملک نے پریشانی بھرے لہجے میں کہا۔ ”وہ قلم ہمیں دینے کی بجائے سردار فضل خان کے ہاتھ میں بھی تھا سکتا ہے۔ اس طرح تو ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اُٹک جائیں گے۔“
منیر نے تسلی دی۔ ”نہیں ملک جی! عالمگیر ایسا بندہ نہیں ہے۔ وہ گھٹیا کام نہیں کرتا۔ بہت پڑھا لکھا اور مرد مزاج انسان ہے۔ میں اصل میں بڑی سرکار کے گینگ سے واقف نہیں ہوں۔ جتنی دیر میں اُن کا سراغ لگاؤں گا، اتنی دیر میں وہ مجھے قلم اُن کی دھڑ سے نکال کر دے دے گا۔“

ملک کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو جان چھڑاتے ہوئے بولا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے قلم چاہیے۔ تمہیں جو مناسب لگے، کرو۔ خدا حافظ!“

نچلے ہونٹ پر چوڑیاں نوچنے کے سے انداز میں چٹکیاں بھرتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔ بتول امید بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ بولی۔ ”کیا کوئی پریشانی ہے؟“
”نہیں!“ وہ چونک کر بولا۔ ”جب تک میں تمہیں اپنانے کے فیصلے تک نہیں پہنچا تھا، پریشان تھا۔ جب دل نے تمہیں اپنا آپ سوچ دیا، ہر پریشانی آنا فنا ختم ہوئی۔ تمہارے مستقبل کے بارے میں پریشانی لاحق تھی۔ اب تمہارا مستقبل میرے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری بنائی گئی قلم تمہارا بال بھی بیک نہیں کر سکتی۔ ماسٹر قلم ملے، نہ ملے، تم پر کوئی آج نہیں آئے گی۔“

وہ متشکرانہ نظروں سے اپنے من مندر کے دیوتا کو پوجنے لگی۔ سوچنے لگی۔ ”دنیا میں کوئی بھی اُترن اپنے تئیں پر جانے کی خواہش نہیں رکھتا۔ جو مسلے ہوئے لباس کو نظر انداز کر کے نیا لباس خریدنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اگر پلٹ کر گریبان دریدہ اُترن کی طرف آئے تو اُس کے اٹھنے والے پہلے قدم پر ہی عشق جائے نماز بچھا کر سجدہ گزریں ہو جاتا ہے۔ میری

پہلے کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر کندھے اُچکا کر کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ بند کر کے ہنسی ہوئی ٹی وی کی طرف بڑھی۔ آن کیا اور ریوٹ کنٹرولر ہاتھ میں لے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ عالمگیر کی آنکھوں سے چھلکتی والہانہ ستاس کی شراب اپنا نرنگ دپے میں پکانے لگی تھی۔ بدن شکن انگڑائی لیتے ہوئے ہونٹ پر ہونٹ چڑھا کر بچے لگی۔ ”میں نے قیامت نہیں دیکھی۔ آئینہ کہتا ہے کہ میری جوانی قیامت ہے۔ دل کہتا ہے، قیامت ایسی ہی ہوگی۔ جس پر میرے جلوؤں کی بجلی گرتی ہے، اُس پر قیامت اتر آتی ہے۔ عالمگیر کی نگاہیں پڑھ کر آئینے کے جھوٹ پر یقین کر لینے کو دل بے قرار ہے۔“

سر کے اوپر انگڑائی کی زنجیر میں بندھے ہاتھ چھڑا کر ہنسنے لگی۔ اپنے بدن کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ کوئی چھیڑے تو آگ لگتی ہے۔ اپنے ہاتھ چھیڑنے لگیں تو گدگدی ہونے لگتی ہے۔ اُس کی لمبی بے قابو ہونے لگی۔ ایسے میں اچانک اُس کی نظر ٹی وی اسکرین پر دکھائے جانے والے فلمی پلاننگ کے اشتہار پر پڑ کر ٹھہر گئی۔ منہ آدھ کھلا رہ گیا۔ قہقہے نے دم توڑ دیا۔ دل میں اُن گنت اندیشے سر اٹھا کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگے تھے۔ وہ بڑبڑائی۔ ”ہائے اللہ! میں نے اس طرف تو توجہ ہی نہیں دی تھی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ لہانے سے بدن پر لگی میل اتر جاتی ہے۔ یہ نہیں سوچا تھا کہ گناہوں کی میل بدن کے اندر تک اتر جائے تو کیا کچھ ہو سکتا ہے۔“

دل کو سمجھانے لگی۔ ”کوئی ضروری تو نہیں کہ ایک پتھر سے ہی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ جائے۔ پہلے پتھر سے ہی غبارہ پھٹ جائے۔ ایک فائر میں ہی ہرن زخمی ہو کر گر پڑے۔“ دماغ ٹھنک کر بولا۔ ”ڈرائیور کے ہاتھوں کی پہلی لغزش جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک ہی بیج زمین میں دب کر تناور درخت بن سکتا ہے۔ مٹائی ٹانگ کا پہلا سفر آخری ثابت ہو سکتا ہے تو سمجھ لو کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ احمقانہ خیالات کو نمودینے کی بجائے عقل کی ڈوری فاسوار اپنا چیک اپ کراؤ۔ داغ زدہ چہرہ کسی کو دکھانے کے لائق نہیں رہتا۔ چمکتی جلد پر دانے نکل آئیں تو انہیں ظاہر ہونے سے پہلے ان کا علاج کرنا ہی عقلمندی کہلاتی ہے۔“

دوسرا تمام کمر بیٹھ گئی۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ دیکھا سنا نہیں تھا، نہ ہی تجربہ تھا۔ بیڈ یا درکتوں نے جو کچھ پڑھا کھا تھا، دل دہلانے کیلئے وہی کافی تھا۔ سوچنے لگی کہ وہ کیا کر سکتی ہے۔ اپنی لیڈی ڈاکٹر کے پاس جائے گی تو باپ تک خبر اُس کے گھر پہنچنے سے پہلے

عالمگیر کا پورچ میں کھڑا شاہانہ کا منتظر رہا۔ وہ نہیں آئی۔ آدھے گھنٹے کے ناکام انتظار کے بعد اُس کے کمرے تک آیا۔ دستک دی۔ دروازہ بدستور بند رہا۔ دوسری..... پھر تیسری بے نتیجہ دستک پر وہ جھنجھلا اٹھا۔ دروازہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالا۔ وہ کابلی سے دروازے پر آئی۔ کھولتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ ”کیا زلزلہ آ گیا ہے؟ کھول تو رہی ہوں۔ اتنا سا بھی صبر نہیں ہوتا تم سے!“

سامنے عالمگیر کو کھڑے دیکھ کر شرمساری ہو گئی۔ ”میں سمجھی تھی رحمت بی دستک دے رہی ہے۔“

عالمگیر جھنجھلایا ہوا تھا۔ غصے میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر خوابیدہ حسن کی جولانیوں کی زد میں آ کر بے خود سا ہو گیا۔ چہرہ بازو پر رکھ کر سوتے رہنے کے باعث بائیں کان کی لو سے ہاک کی اساس تک دوا نچ چوڑی سرخ لہر موجزن دکھائی دے رہی تھی۔ ایک رنگ کی زندہ قوس قزح زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُسے ندیوں کی طرح دیکھتے پا کر کابلی سے بولی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

وہ سنبھل کر بولا۔ ”کچھ نہیں۔ کافی انتظار کے بعد پتہ کرنے آیا ہوں کہ تمہارا کیپس جانے کا ارادہ ہے یا نہیں؟“

وہ اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گئی۔ بائیں گال کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ”نہیں..... جی نہیں چاہ رہا۔“

وہ ناقدانہ نگاہوں سے اُس کے سراپا کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ”طبیعت تو خامی سنبھلی لگتی ہے۔“

”میں نے کہاناں کہ جی نہیں چاہ رہا۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ مجھے ایک دو ضروری کام بنانا ہیں۔ گھنٹہ بھر کے بعد واپس آ جاؤں گا۔“

گاڑی پر جا رہا ہوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلا کر انگلیائے جذبوں کی آنچ پر لہرا کر انگڑائی لینے لگی۔ جوانی کی بے ربط اور سستی زدہ انگڑائی بھی دلکش رقص کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ آنکھوں کی مستی نے خانے کے چھلکتے جام کی صورت میں پُر دعوت بن کر خردمند کو خرد سے بیگانہ کرنے لگتی ہے۔

اُس نے سر جھٹک کر اپنی خرد کو خرمن میں لگی آگ کی لپٹوں سے نکالنے کیلئے منہ پھیر لیا۔

کرے اُسے اپنے ساتھ لے جاسکتی ہو۔ کلینک کے گیٹ پر گاڑی میں اُسے بیٹھا کر خود بائرنے ملنے کیلئے جاسکتی ہو۔ اب ہینگ بھی تمہاری ہتھیلی پر ہے، پھٹکڑی بھی تمہاری ہتھیلی پر ہے۔ جتنا رنگ لانا چاہتی ہو، لے آؤ۔“

برہماری ہے۔ جتنا رنگ لانا چاہتی ہو، لے آؤ۔“

وہ خوش ہو گئی۔ قسمت مہربان ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کھلے آسمان سے مینہ کی دھواں پھوار برسنے لگی ہو۔ دھکا دیتی ہے تو بھری دنیا میں کہیں قدم جمائے نہیں جتے۔ وہ اس مہربان ہو گئی تھی۔

مالگیر گھنٹے کی بجائے آدھا دن گزار کر واپس آیا۔ وہ اُس کی منتظر تھی۔ بولی۔ ”تم نے جلد آنے کا کہا تھا۔ پورا دن ضائع کر دیا۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ تم تنہا گڑی تھی۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”ہاں! کچھ پرابلم درپیش آرہی ہے۔ سوچا ڈاکٹر سے مل کر مشورہ کر لوں۔“

اُس کے جھگ سرائے پر ناقہ اندنگہ ڈالتے ہوئے مسکرایا۔ ”اس انداز میں کسی میل ڈاکٹر کے پاس جاؤ گی تو سمجھی واپس نہیں آسکو گی۔ لیڈی ڈاکٹر کے پاس جاؤ گی تو تمہارا طاق کرنے کی بجائے وہ رشک اور حسد کے مارے غش کھا کر گر پڑے گی۔“

وہ نظریں چڑا کر مسکرانے لگی۔ دکھاوے کی خفگی ظاہر کرنے لگی۔ ”اب میں ایسی اپسرا بنی نہیں ہوں۔“

وہ ہاتھ میں تھاما ہوا شاپنگ بیگ لہراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر کے بعد گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو وہ سمجھ گئی کہ مالگیر اُسے پورچ میں بلارہا ہے۔ وہ پرس جھلاتی بڑھیاں اترنے لگی۔

ایک گانا کالوجسٹ کے کلینک کے سامنے اپنے محافظ کو انتظار کی سولی پر لٹکتا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔ اُسے تاکید کر گئی کہ وہ ادھر ادھر نہ ہو۔ وہ کسی وقت بھی باہر آسکتی ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ میرے پیچھے پیچھے اندر نہ آئے۔ اتنا تو وہ جانتا ہی ہوگا کہ گانا کالوجسٹ کے دفتر میں بغیر بلائے گھسنے والا اتر اہوا منہ لے کر باہر نکلتا ہے۔

لیڈی ڈاکٹر ادھیڑ عمر کی خوش شکل عورت تھی۔ لمبے سے شہد نیچتا تھا۔ ہمت باندھ کر بول۔ ”ڈاکٹر صاحبہ! میں آپ کے پاس اپنی امید پر کھٹے کیلئے آئی ہوں۔“

پہنچ جائے گی۔ لیبارٹری میں جانے پر عالمگیر چونک اٹھے گا۔ اکیلے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ حسن پر نمی اترنے لگی۔ آنسو رخساروں تک ڈھلک آئے۔ روتے ہوئے خود کو کہنے لگی۔ ”اس بے شرمی کی زندگی سے کہیں بہتر ہے کہ میں بے حیا وجود کا گلا گھونٹ دوں۔ ہائے! کس مصیبت میں پڑ گئی ہوں۔ کسی کو راز دار بھی نہیں بنا سکتی، کسی سے مدد بھی نہیں لے سکتی۔ کچھ بھائی نہیں دیتا، کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟“

وہ سردار فضل کی بیٹی تھی۔ چوہدری باسط کی بیٹی نہیں تھی کہ سچ کو تحریر کی شکل میں احوال اپنے عاشق کے سامنے رکھ دیتی۔ اُسے اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا کہ سچ وہی ہوتا ہے جو اپنے منہ سے بولا جائے۔ وہ سچ نہیں ہوتا جسے کوئی دوسرا گدی سے کھینچ کر پڑے یا نہ۔ وہ رحمت بی کو بھی ہمراز نہیں بنا سکتی تھی۔ اُس کے خیر خواہ اُس کے باپ کے تنخواہ دار تھے۔ خیر خواہی سے کہیں زیادہ ضروری تنخواہ میں ملنے والے کرارے کرارے نوٹ پیارے ہوتے ہیں۔

غار کے منہ پر پتھر آن گرا تھا۔ بڑے باپ کی بگڑی ہوئی بیٹی اکیلی غار میں پھنس گئی تھی۔ کہیں پڑھ رکھا تھا کہ راستہ مسدود کرنے والا پتھر طاقت سے نہیں، گریہ سے ہٹا ہے۔ گریہ کیلئے دامن میں جھانک کر دیکھا۔ کوئی نیکی دکھائی نہیں دی۔ کس بل پر وہ گریہ کر رہی تھی۔ راستہ مانگتی۔ ایسے میں قسمت کو اُس کی تہی دامن پر ترس آ گیا۔ غار کے دہانے کو تھوڑا سا عریاں کرتے ہوئے بولی۔ ”بیگی! کیا بھرے شہر میں تمہاری فیملی ڈاکٹر کے علاوہ کوئی سبب نہیں ہے؟ کسی اور سے رابطہ کرو گی تو باپ تک خبر نہیں جائے گی۔“

وہ اتنی عقلمند نہیں تھی۔ اگر رتی بھر عقل بھی رکھتی تو سامنے کی بات کو کسی کے سمجھائے بغیر سمجھ لیتی۔ قسمت نے پتھر کو اور سرکایا۔ ”کنوار پن کوئی بندیا نہیں، کوئی نیکہ نہیں ہوتا جو پیشانی پر چپک کر دیکھنے والے کو اپنا آپ دکھا دیتا ہے۔ تم نئی ڈاکٹر کے سامنے خود کو نشانہ شدہ ظاہر کر کے اپنا کام نکال سکتی ہو۔“

ابھی وہ پتھر کے پٹنے سے نمودار ہونے والے راستے میں سے گزرتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔ قسمت نے ہنس کر دھکا دیا اور بھاری پتھر کو پرے پھینکتے ہوئے کہا۔ ”بیگی! تم مالگیر سے ڈرنے لگی ہو۔ اپنے نوکر سے چھپانا چاہتی ہو۔ سنو! عورتوں کو ایک بھی مسئلہ درپیش نہیں ہوتا جس کو سلجھانے کیلئے وہ ڈاکٹر کے پاس جایا کرتی ہیں۔ تم کسی اور بیماری کا بیان

ڈاکٹر کو شوریاں سننے کا شوق نہیں تھا۔ پیشہ دارانہ انداز میں بولی۔ ”وقت گزرنے پر سب بھی کہتی ہیں۔ تمہیں کچھ دوائیاں لکھ دیتی ہوں۔ ایک ہفتہ استعمال کرنے کے بعد میرے پاس آنا۔“

فہم ادا کر کے وہ کلینک سے باہر آئی۔ گاڑی میں بیٹھی تو عالمگیر نے کہا۔ ”کلینک میں جانے سے پہلے تم پر جوانی تھی۔ واپسی پر بڑھاپا طاری ہے۔ کیا بات ہے؟“

اُس نے ”اونہہ“ کہہ کر منہ پھیر لیا۔ میڈیکل سٹور سے تجویز کردہ ادویات لے کر گھر پہنچی۔ کمرے میں بند ہو کر رونے لگی۔ قسمت نے راہ بھائی تھی، غار کے منہ پر پڑے ہوئے بھاری بھرکم پتھر کو ہٹا دیا تھا مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ غار سے باہر جانے والے راستے میں کانٹے ہی کانٹے بکھرے پڑے ہیں۔ بیچ رستے پہنچ کر پاؤں کے تلوؤں نے کانٹوں کی خبر دی تھی۔ اب وہ نہ آگے جاسکتی تھی، نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی۔

عالمگیر تھک کر سستانے کیلئے دراز ہو گیا۔ زندگی میں بارہا اپنے کئے پر ندامت محسوس کی تھی۔ مگر آج جس پشیمانی نے دامن تھا تھا وہ سب سے الگ تر اور روح فرساتھی۔ ہونٹ کانٹے ہوئے سوچنے لگا۔ ”بہت غلط ہوا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرے مقابل میں سردار فضل خان سینہ سپر ہو کر کھڑا تھا۔ اُس کی بیٹی نے میرا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا، میں نے خواہ مخواہ اُس کا چہرہ بگاڑ دیا ہے۔“

اچانک اُسے اپنی پیشانی پر مامتائی ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ چونک کر آنکھیں کھولیں۔ ماں کے اُبلے وجود کو خود پر جھکے دیکھا۔ اُس سے پہلے کبھی اتنا قریب نہیں آئی تھی۔ اچانک عالمگیر کا دل بھر آیا۔ روتے ہوئے بولا۔ ”ماں! تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میں نے علم دین سے عالمگیر بن کر اپنی دنیا اور عاقبت دونوں کو خراب کر لیا ہے۔ مجھے عورت ذات کی عزت کرنا چاہیے تھی نہ کہ اُس کی عزت کو پیروں میں پامال کر کے فتح کا جشن منانا چاہیے تھا۔“

ماں بیار سے پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگی، خاموشی سے سہلانے لگی۔ وہ سسکا۔ ”ماں! آج خاموش کیوں ہو؟ طنز کے تیر میرے پہلو میں چھوتی کیوں نہیں ہو؟“

ماں نے سرگوشی کی۔ ”میں تمہارے ضمیر کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کیلئے آیا کرتی تھی۔ آج تمہارا ضمیر بغیر جھنجھوڑے بیدار ہو گیا ہے تو میں کیا کہوں؟“

ڈاکٹر مسکرائی۔ ”تم شکل سے امید کی کرن دکھائی دیتی ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تمہیں ازدواجی زندگی نے چھوا تک نہیں۔ بائی داوے! کتنا عرصہ ہوا شادی کو؟“

وہ سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔ ”اُس بارہ کو تین ماہ ہو جائیں گے۔“

ڈاکٹر نے علامات پوچھیں۔ وہ کچھ جانتی نہیں تھی، بتلاتی کیسے؟ مایوس ہو کر ڈاکٹر نے لیٹر پیڈ پر کچھ آڑے ترچھے شدید ڈال کر اُسے اپنی اسسٹنٹ کے ہمراہ دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ ٹیسٹ رپورٹ لے کر وہ ڈاکٹر کے آفس میں داخل ہوئی اور لرزتے ہاتھوں سے رپورٹ تھماتے ہوئے بولی۔ ”اِس پر صرف ’پازیٹو‘ لکھا ہے۔ اِس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“

ڈاکٹر نے شوخ انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”تم جو دعا لے کر یہاں آئی ہو، وہ پوری ہوگئی ہے۔ پازیٹو کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری زرخیز دھرتی نے بیج کو وصول کر کے نمو کا عمل شروع کر دیا ہے۔ مبارک ہو!“

اُسے یوں لگا جیسے اُس کے پیروں نے اُس کا وزن اٹھانے سے انکار کر دیا ہو۔ کمرے کے بے دم ہو کر ڈھسے سی گئی۔ سردی کے باوجود پیشانی پر ننھے ننھے قطرے جگمگانے لگے۔ ڈاکٹر اُس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو گہری نظروں سے جانچ رہی تھی۔ روز کا کام تھا۔ اُن گنت معصوم چہروں پر سیاسی سے رقم کی گئی اندوہ ناک تحریریں پڑھتی رہتی تھی۔ اُن بتلائی کو بھانپتے ہوئے بولی۔ ”لڑکیاں یہ سمجھتی ہیں کہ بیابانی اور بن بیابانی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اگر تم اٹھنے کے قابل ہو تو اُس دیوار پر لگے آئینے میں جا کر اپنی صورت دیکھو۔ ثواب اور گناہ کے فرق کا پتہ چل جائے گا۔“

ڈاکٹر کے لفظ لفظ میں نفرت، استہزاء اور کھلا طنز تھا۔ وہ کٹ کر رہ گئی۔ سارا اعتماد ”پازیٹو“ کے لفظ نے اُن واحد میں چاٹ لیا تھا۔ رہی سہی کسر شدید ٹپکاتے لہجے میں عموماً آنے والی نفرت نے پوری کر دی۔ میز پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔ ڈاکٹر اٹھ کر اُس کے قریب آگئی۔ دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔ ”جو ہونا تھا، ہو چکا۔ ہونی کو فیس کرنے کیلئے تمہیں اتنا اعتماد کی ضرورت ہے جس کی بیساکھی پر چل کر مجھ تک پہنچی ہو۔“

وہ ہچکیاں لینے کے دوران بولی۔ ”ڈاکٹر صاحبہ! میں گناہ گار نہیں ہوں۔ ہائی سوسائٹی میں پلٹنے بڑھنے کے باوجود میں اُن چھوٹی ہوں۔ میرے ساتھ ظلم میری بے ہوشی میں کیا گیا ہے۔“

بیٹی نے اپنے ہونے والے شوہر کو تمام تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے فرمائش کی ہے وہ اُس فلم کی ماسٹر کاپی کو حاصل کرے۔“ منیرے قصائی نے تفصیل بتلائی۔

اُس کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ بدقت تمام بولا۔ ”یار! بڑی عجیب بات کر رہے ہو۔ کیا اُس نے شادی سے پہلے ملک امجد کو بتلا دیا کہ.....“

وہ بولا۔ ”ہاں! اور مزے کی بات یہ ہے کہ اپنے ملک صاحب نے یہ کڑوا گھونٹ ہنتے ہوئے پی لیا ہے۔ میں نے اپنے طور پر پتہ چلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ کاروائی کون خمیٹ کر سکتا ہے۔“

”پھر کون سامنے آیا؟“ اُسے اپنا لہجہ بھی عجیب لگ رہا تھا۔

”یہ رزالت بڑی سرکار نے کی ہے۔“

”اوہ..... ہو.....“ عالمگیر نے سینے میں بھرا ہوا سانس آہستہ آہستہ خارج کیا۔ ”پھر مجھے یہ سب کچھ بتلانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”مشکل وقت میں بندہ اپنے یاروں پیاروں کو ہی آواز دیتا ہے۔ تم سے رابطہ نہیں کروں گا تو کس سے کروں گا۔ میں بڑی سرکار کے نیٹ ورک کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تم جانتے ہو۔ کسی طرح اُس فلم کی ماسٹر کاپی حاصل کر کے مجھ تک پہنچا دو۔ تم جانتے ہو کہ ملک امجد کس ذہنیت کا آدمی ہے۔ وہ فلم لینے کیلئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

عالمگیر نے دلا سہ دیا۔ ”یار منیرے! میری جان! تم فکر نہ کرو اور لمبی تان کر سو جاؤ۔ میں ایک دو ہفتوں میں تمہاری پریشانی دور کر دوں گا۔“

رابطہ منقطع ہونے پر عالمگیر اندیشوں میں گھر گیا۔ اُس کی توقع کے برعکس بتول نے راز کو خود ہی طشت از بام کر دیا تھا۔ سوچنے لگا۔ ”اگر منیرے کو میری انوالومنٹ کا سراغ مل گیا تو معاملہ جو پیٹ ہو جائے گا۔“

عافیت کا سانس لیا کہ ابھی تک وہ محفوظ تھا۔ اُس نے یہ ارادہ کر لیا کہ آنے والے دس بارہ دنوں میں وہ فلم کی بہترین کاپی کر کے منیرے کی طرف روانہ کر دے گا اور اُسے بتلا دے گا کہ راز رکھنے کی شرط پر بڑی مشکل سے حاصل کی گئی ہے۔ وہ مطمئن ہو کر اس معاملے کو گول کر دے گا۔

ایسے میں اُسے کچھ یاد آیا۔ فون پر اپنے کسی ساتھی سے رابطہ کر کے اُسے ہدایات دینے

”ماں! جو کچھ میں نے آج دیکھا ہے، پہلے دیکھ لیتا تو تمہاری باتوں پر یقین آ جاتا۔ شانی کلینک میں جانے سے پہلے خوش اور پروقار تھی۔ لوٹنے پر یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے دق نے اُس کا اندر چاٹ ڈالا ہو۔“

”پگلے! تم جس چیز کو خوشی اور وقار قرار دے رہے ہو وہ نقدس تھا۔ جسے دق کہتے ہو، وہ گناہ ہے۔ گناہ انسان کو گھن کی طرح چاٹ لیتا ہے۔ اِس سے بھی بُرا ناکردہ گناہ ہوتا ہے۔ وہ ناکردہ گناہ کی بھینٹ چڑھ کر کھوکھلی ہو گئی ہے۔ اُس کے اندر گناہ ہی گناہ ہے، زندگی نہیں رہی۔“

اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے ہاتھ کو تھامتا جا ہاتھ کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ چونک کر اوپر اُپر دیکھنے لگا۔ ماں کے وجود سے بھر جانے والا کمرہ خالی ہو چکا تھا۔ جانے والی جا چکی تھی۔

وہ سوتا چاہتا تھا مگر آنکھوں کے اندرونی پردوں پر ثبت شانی کی اُبڑی ہوئی شبیہ نے اُسے مضطرب کر دیا تھا۔ ذہنی انتشار بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر یوں لگا جیسے دل پسلیوں کے قفس سے نکل کر کن پٹیوں پر جا ٹکا ہو اور کان کے قریب دھڑکنے لگا ہو۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو سختی سے دبایا۔ افاقہ نہ ہونے پر جھنجھلا نے لگا۔ جھنجھلا ہٹ ہمیشہ بے بسی کو ختم دیتی ہے۔ بے بسی برداشت کی سرحد عبور کرنے کیلئے آنکھوں کے گوشوں سے رستے لگتی ہے۔ ندامت کے آنسو گرم نہیں ہوتے۔ ندامت کے آنسو نمکین نہیں ہوتے۔ کچھ اور طرح کے ہوتے ہیں۔

فون کا بزر بنجنے پر خالی الذہنی کی کیفیت میں فون سیٹ کو دیکھنے لگا۔ تیسری یا چوتھی بیل پر اُسے اٹھایا، آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بھی منیرے! کیسے بھول کر یاد کر بیٹھے ہو؟“

منیرا بولا۔ ”یار! اپنے ملک امجد کو سر منڈاتے ہی اولے پڑنے لگے ہیں۔ بڑے ملک نے اُس کی شادی جوہری باسط کی بڑی بیٹی سے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تمہاری مدد کی ضرورت پڑ گئی ہے۔“

وہ اچھل پڑا۔ جلدی سے بولا۔ ”یہ بول کہ ہوا کیا ہے؟“

”کچھ عرصہ پہلے کسی نے باسط کو بلیک میل کرنے کیلئے اُس کی بیٹی کی وڈیو فلم بنائی تھی۔ باسط کو پتہ چلا تو اُسے دل کا دورہ پڑ گیا جس کے نتیجے میں وہ اللہ کو بیارہو گیا۔ اب اُس کی

بے سوچنے لگا۔ ”چھوٹے باپ کی بیٹی نے اپنے وجود کو شفاف شیشے میں بند کر کے اپنے محبوب کے سامنے رکھ دیا اور ہر فلز سے آزاد ہو گئی۔ بڑے باپ کی بیٹی اپنے ناکردہ عہدہ کو سات پردوں میں لپیٹ کر چھپانا چاہتی ہے۔ جتنا چھپاتی ہے، اتنا ہی نظروں میں آتی ہے۔“

اس کی محبت پر شک کرنے لگا۔ سوچنے لگا۔ ”محبت کرنے والے جھوٹ نہیں بولتے۔ ان کی ذات شفاف شیشہ بن جاتی ہے۔ بال بھی آئے تو دور سے دکھائی دینے لگتا ہے۔“ دل سے ہوک اٹھی۔ ”ہائے کاش! اس مغرور حسینہ نے مجھ سے پورے اعتماد کے ساتھ بت کی ہوتی!“

یکبارگی ایک خیال برقی رو کی طرح اُس کے ذہن میں کوند اور وہ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ہنسنے ہنسنے بے حال ہونے لگا۔ کھڑکی میں آن کھڑا ہوا اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔ بے تحاشا ہنسنے سے آنکھوں میں پانی آ گیا۔ پردے کی پٹی سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ جتنی چینی ڈالی جائے گی، چائے میں اتنی ٹھاس ہی ہوگی۔ بتول اور امجد کی محبت دونوں طرف سے پاکیزہ ہے۔ میری اور شانی کی محبت میں دونوں طرف ریا ہے، دونوں طرف جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ سچ اور جھوٹ میں کوئی فرق نہ ہوتا تو ماں کیوں میرے پاس آتی اور نصیحتیں کرتی۔“

سر جھٹک کر اپنے آئندہ داؤ کے بارے میں سوچنے لگا۔ مخصوص فون نمبر چالو کر کے ٹھانہ سے رابطہ کیا۔ فون کان سے لگایا اور لہجہ بدل کر بولا ”ہیلو شاہانہ فضل! بڑے دنوں کے بعد رابطہ کر رہا ہوں۔“

تھکے تھکے لہجے میں بولی تو یوں لگا جیسے رورہی ہو۔ ”بولو! میں سن رہی ہوں۔“

”تم اپنی شامت کو آواز دینے والے اقدامات کرتی پھر رہی ہو۔ میرے بڑوں نے نپٹا لیا ہے کہ اب تمہارے پیروں میں بندھی رسی کو کھینچ لیا جائے تو بہتر ہے۔“

”میں نے ایسا کیا کر دیا ہے جو تمہارے فرعونوں کو پسند نہیں آیا۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

”تم بہتر جانتی ہو۔“

”میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم دور کھڑے ہو کر بھونکنے والے کتے ہو۔ بزدلوں کی طرح

لگا۔ کلینک کا نام و پتہ اور مریضہ کا نام بتلا کر بولا۔ ”تم نے ہر صورت میں اس مریضہ کی رپورٹ حاصل کرنی ہے۔ رپورٹ گم نہیں ہونی چاہیے۔“

کال منقطع کر کے کچھ سوچنے لگا۔ پھر بزرخ اٹھا۔ اب کے سردار فضل اُس سے مخاطب تھا۔ بولا۔ ”تھرڈ مین نے تم سے رابطہ کیا ہے یا نہیں؟“

وہ بولا۔ ”ابھی تک تو کوئی سامنے نہیں آیا۔ میں نے اپنے طور پر پتہ چلانے کی کوشش کی ہے کہ تھرڈ مین کے پیچھے کون ہے۔ مجھے شک ہے کہ داؤد سبحانی تم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”داؤد سبحانی..... وہ فاکس گروپ والا سیٹھ؟“ سردار نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ یوں لگا جیسے داؤد سبحانی کا نام سن کر اُس کا دل بیٹھ گیا ہو۔

وہ بولا۔ ”ہاں وہی سیٹھ داؤد سبحانی.....“

”پھر تو واقعی معاملہ بہت سنگین ہے۔ تم ایسا کرنا کہ جو نہی تھرڈ مین تم سے رابطہ کرے اور کوئی ثبوت فراہم کرے تو تم فوری طور پر یہاں چلے آنا۔ دونوں مل کر سوچیں گے۔“ سردار نے کہا اور رابطہ ختم کر دیا۔

وہ مسکرانے لگا۔ جانتا تھا کہ شانی اُسے نہیں جانے دے گی۔ باپ اپنی لاڈلی بیٹی کی ضد پر سر جھک کا لیتا تھا۔ گھنٹہ بھر کے بعد پھر فون بول پڑا۔ اُس کا وہی ساتھی رابطہ کر رہا تھا جسے اُس نے شانی کی رپورٹ حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”میں تمہاری کوشش سے دو تین سو فٹ کے فاصلے پر سفید سوزو کی میں بیٹھا ہوں۔ آ کر اپنی چیز لے جاؤ۔“

وہ فون بند کر کے بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ دونوں طرف دیکھا۔ شمال کی طرف دوسری کوشی کے گیٹ کے سامنے سفید سوزو کی کھڑی تھی۔ وہ نزدیک جا کر جھک کر اندر جھانکتے ہوئے بولا۔ ”کتنے پیسے لگے؟“

”دو ہزار روپے ڈاکٹر کی اسسٹنٹ نے مجھ سے جھاڑ لئے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ تمہیں دو سے ضرب لگا کر پہنچا دوں گا۔“

ایسے کاموں میں ایسا معاوضہ دیا اور لیا جاتا ہے۔

سفید لفافہ پینٹ کی ہپ پاکٹ میں ٹھونٹے ہوئے واپس آ گیا۔ کمرے میں پہنچ کر رپورٹ ملاحظہ کی۔ شک یقین میں بدل گیا۔ اپنے چری بیک میں لفافے کو سنبھال کر رکھنے

”فرمان تو رحمت بی بھی سن چکی ہے۔“

وہ گیلی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ نظروں کی تاب نہ لا کر نظریں پُرا کر بولا۔ ”کھانا لے کر نہ آتا تو اور بات تھی۔ اب لے آیا ہوں تو کھلائے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔“

وہ انکار میں سر ہلانے لگی۔ وہ اُس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ٹرے سامنے رکھ لی۔ نوالہ توڑ کر اُس کے منہ کے قریب لے گیا۔ وہ سختی سے بولی۔ ”کہہ دیا ہے کہ نہیں کھاؤں گی۔ کیوں ضد کر رہے ہو؟“

کوئی جواب دیے بغیر اُس نے نوالہ اُس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ وہ عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ شاید اُس کی دماغی حالت پر شبہ کرنے لگی تھی۔ نوالہ طوعاً و کرہاً نگلنے کی کوشش کی۔ ہچک لگ گئی۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ پانی دکھائی نہیں دیا تو پھنسی پھنسی آواز میں کراہی۔ ”پانی تو ساتھ لے آتے۔“

وہ بھاگ کر ڈائننگ ٹیبل پر سے جگ اور گلاس اٹھالایا۔ پانی پلاتے ہوئے بولا۔ ”میں جب سے یہاں آیا ہوں، تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں۔ بڑے باپ کی بیٹی ہو اس لئے اپنی پرائلزم کسی ہم پلہ سے ہی شیئر کرو گی۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں رئیس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہیے۔“

اُسے اچنبھا ہوا۔ ہونٹوں کے اطراف کی جلد پانی پینے کے دوران گیلی ہو گئی تھی جسے اُس نے صاف نہیں کیا۔ ماتھے پر بل ڈال کر گھورتے ہوئے بولی۔ ”کیوں؟“

وہ بولا۔ ”کیونکہ وہ تمہارا اچھا دوست ہے۔“

”وہ میرا دوست نہیں رہا بلکہ کبھی بھی نہیں رہا۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“

شانی نے جواب نہیں دیا۔ عالمگیر نے باتوں کے دوران نوالے توڑ کر اُس کے منہ میں ٹھونسنے کا سلسلہ تو اتر سے جاری رکھا تھا۔ بولا۔ ”ہو سکتا ہے کہ مجھے کل یا پرسوں کسی وقت تمہارے باپ کے پاس جانا پڑے۔ ایسے میں تمہارے لئے بہتر ہوگا کہ گھر سے باہر نہ نکلو۔“

وہ گھبرا کر بولی۔ ”نن..... نہیں..... تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“

”کیوں؟“

بل میں چھپے بیٹھے ہو۔ ایک لڑکی کے سامنے آنے کی جرأت بھی نہیں رکھتے۔“ یوں لگتا جیسے شانی نے مرنے یا مار دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ غیر معمولی سختی سے بولی۔ ”اپنے بڑوں سے جا کر کہہ دو۔ میں نے رسی کو کاٹ پھینکنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم سے جو ہو سکتا ہے، کرو۔ میرا دماغ مت چاٹو۔“

عالمگیر کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تیر گئی۔ بولا۔ ”تمہیں ہر بل نگاہوں میں رکھا جا رہا ہے۔ کیا کرتی ہو؟ کہاں جاتی ہو؟ کس سے ملتی ہو؟..... بڑوں تک تمہاری ایک ایک حرکت کی رپورٹ پہنچتی رہتی ہے۔ آج تمہیں پتہ چلا ہے کہ ایک وڈیو کیسٹ باہر رہ کر تمہارا غور پی رہی ہے تو دوسری تمہارے بدن میں رہ کر خون چوسنے لگی ہے۔ اُس سے چھٹکارا پانے کا ہر کوشش کیمرے کی آنکھ میں بڑی نفاست سے محفوظ کی جا رہی ہے۔“

دوسری طرف اچانک خاموشی چھا گئی۔ تیز تیز سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دلہجے میں مزید سفاکی سمو کر بولا۔ ”اپنے سچے طلبکار کو چھوڑ کر اپنی سطح سے نیچے اتر دو گی ذلالت کے تہہ خانوں میں دھکیل دی جاؤ گی۔ اشارے کو سمجھو، یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“

وہ کچھ نہیں بولی۔ چند لمحے توقف کے بعد عالمگیر نے رابطہ منقطع کر دیا۔ شام کو ڈائننگ ٹیبل پر اکیلے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے رحمت بی سے شانی کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولی۔ ”بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لگتا ہے بخار پوری طرح جسم سے نکلا نہیں ہے۔ کھانا بھی نہیں کھایا اُس نے۔“

کھانا کھانے کے بعد اُس نے رحمت بی سے شانی کیلئے کھانا ٹرے میں رکھوایا اور ٹرے اٹھائے اُس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ کمرے میں دُکبی پڑی تھی۔ قریب آ کر بولا۔ ”مس شاہانہ! اٹھو۔ کھانا کھا لو۔“

اُس نے منہ پر سے کمرے ہٹایا۔ پتہ چلا کہ وہ رو رہی تھی۔ رونے کا سبب جانے بوجھے دریافت کرنے لگا۔ ”کیا ہوا؟ کیوں ایسے جاہلوں کی طرح آنسو بہائے چلا جا رہی ہو؟“

وہ کچھ نہیں بولی۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں سختی سے دبا کر اٹھ بیٹھی۔ ہچکی لے کر بولی۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”اپنے گھر میں ڈر کیسا؟“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”تم ساتھ ہوتے ہو تو مجھے ڈر نہیں لگتا۔“

”میرا یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم اپنے خول میں سمٹ کر بیٹھی ہوئی ہو۔ کچھ کھل کر بتاتی نہیں ہو۔ مجھے ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ تمہیں کن لوگوں سے خطرہ محسوس ہوتا ہے یا کون لوگ تمہیں گزند پہنچانا چاہتے ہیں۔ بھرے بازار میں کسی طرف سے اچانک گولی نکل کر تمہیں نگل جائے، مجھے پھاڑ دے، میں کیا کر لوں گا؟“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ شانی نے سر جھکا لیا۔ سوچنے لگی۔ دل ہر طرف سے واہموں اور اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ کسی پر اعتماد کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ دل میں خیالی گھوڑے کو ایڑ لگا کر دوڑانے لگی۔ ”میں لڑکی ہوں۔ کسی ڈاکو کا ہاتھ نہیں روک سکتی۔ کسی کتے کی زبان کو لگام نہیں ڈال سکتی۔ مجھے کسی نہ کسی پر اعتماد کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر پر اعتماد نہیں کیا تھا مگر اُس نے مجھ پر اعتماد کر لیا تھا۔ آج نہیں تو کل، ہر کسی پر نیریں بے حیائی کھل جائے گی۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا ورنہ بے موت ماری جاؤں گی۔“

وہ دیکھ رہا تھا کہ شانی گہری سوچ میں مستغرق ہے، اس لئے خاموشی سے نوالے اس کے منہ میں ڈالتا رہا۔ بے دلی سے منہ چلاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ”میرے ارد گرد محدود تعداد میں مرد موجود ہیں۔ اُن میں سے صرف یہی میری مدد کر سکتا ہے۔ مجھے اس کو اپنے غیاب اور دورانِ غیاب بیتنے والی روئیداد سنا دینی چاہیے۔ ممکن ہے کہ یہ اُن خبیثوں کے جبرے توڑ کر مجھے ہمیشہ کیلئے آزاد کرالے۔“

سوچتے ہوئے اُس پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ کھوجے ہوئے بولا۔ ”کیا تم کسی سے محبت کرتی ہو؟“

وہ چند لمحوں کے بعد ایک تک حیرت بھری آنکھوں سے گھورتی رہی۔ ہونٹ کپکپاے گئے۔ سر جھکا کر بولی۔ ”ہاں!“

”کس سے؟“ اُس نے برسیلِ تذکرہ پوچھ لیا۔

”تم سے!“ آواز اتنی مدہم تھی کہ عالمگیر کو بمشکل سنا دی۔ مسکرانے لگا۔ دو لفظوں نے اُس کے وجود میں طمانیت بھر دی تھی۔ وہ چند لمحوں تک پلکیں جھکائے اُس کے رد عمل کا انتظار

کرتی رہی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”عالمگیر! میں مذاق نہیں کر رہی کرتی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے تمہارے آنے پر میرے بدن میں زندگی کی لہر دوڑنے لگی ہے۔“ اُس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہی تو آزدگی سے بولی۔ ”مجھے علم ہے کہ کوئی لڑکی اگر اپنے طور پر اعتراف کا پندھ طے کر لے تو وہ بے وقعت بیوہ بن جائے گی۔ مگر یہ صد کوشش، میں ضبط کرنے میں ناکام ہو گئی ہوں۔“

عالمگیر کی خاموشی اور مسکراہٹ اُسے کھلنے لگی۔ اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو سختی سے دوڑاں ہاتھوں میں دبوج کر دباتے ہوئے بولی۔ ”تم اس طرح بت بن کر کیوں بیٹھے ہو؟ کچھ بولناں!“

اُس نے آہستگی سے ہاتھ چھڑایا اور نوالہ ٹرے میں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر بولا۔ ”مس شاہانہ! میرا قد بہت چھوٹا ہے۔ تم بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ تمہارے بڑے ہوئے ہاتھ کو تھاموں گا تو پورا زمانہ مجھ پر تھوکتو کرنے کا اور پیٹھ پیچھے مجھے دولت پرست، غاصب اور جانے کیا کچھ کہے گا۔ تمہارے منہ پر تمہاری سکھیاں تمہیں طعنے دیں گی اور کہیں کہ دنیا میں تمہیں کوئی ہم پلہ ہی نہیں ملا تھا جو اس گھٹیا انسان کی پینگ پر جھولنے لگا ہو۔“

وہ ٹھٹھا ہوا اُس کے قریب آ گیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”میں اگر یہ بیچوں کہ تم نے کیا سوچ کر مجھ سے محبت کا فیصلہ کیا ہے تو تم کیا جواب دو گی؟“

”مگر اس کی بڑبڑائی۔“ ”یہ کیا بات ہوئی؟ محبت سوچنے کا موقع ہی کب دیتی ہے؟“

”نہ تو میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔“ ”تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔ چلو یہ ہی بتا دو کہ تم نے کیا

لے گیا تھا۔ غیر ارادی طور پر سوچنے لگی۔ ”اب کیا کروں؟ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔
 شاید مجھے اپنی سطح سے نہیں گرنا چاہیے تھا۔“
 بھر سوچنے لگی۔ ”میری سطح کیا ہے؟“

اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بس یوں لگا جیسے بے دھیانی میں اس
 نے غم کے پتے ہتھیلیوں میں مسل کر منہ میں رکھ لئے ہوں۔ نہ ختم ہونے والی کڑواہٹ
 ذہنیں کل گئی۔

مالگیر کے کمرے میں اس کی زندگی کی طرح مضحل اور اس رات طاری تھی۔ اس کی
 پٹائی پر فکر و درد کی غماز لکیروں کا جال تباہ ہوا تھا۔ اپنی تعین شدہ منزل کے قریب پہنچ کر اس
 کی ذہنی کیفیت متغیر ہونے لگی تھی۔ اس نے ایک غلطی کی تھی۔ اُسے شانی کے ساتھ ایسا
 مل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ ندامت روح کی گیرائی تک اُتر گئی تھی۔ ضمیر کو تھپک کر
 لانے کیلئے بڑبڑایا۔ ”اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ میرے قریب نہ آتی۔ رئیس کو دھکے دے کر
 لڑکی دیا سے نہ نکالتی۔ میں نے اُسے زخم دیا ہے، میں ہی زخم پر مرہم رکھ کر حساب برابر
 کروں گا۔“

جب شانی کے بارے میں سوچتا تو غیرت بھی کمرہ امتحان میں کاپی قلم اٹھا کر بیٹھ جاتی۔
 ہوشِ انظر اور فراخِ قلب نہیں تھا کہ ایسے روح فرسا واقعے کو نظر انداز کر کے ہنستا کھیلتا۔
 لڑکی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ہر آن نیا منظر دکھانے پر تلی رہتی ہے۔ اگر عالمگیر اُسے بے حیا
 نہاتا تو اس کے اپنے دل کی دنیا ویران پڑی رہتی اور وہ اپنے مقاصد پورے کرنے میں
 لگا رہتا۔ بے حیا بنانے کے بعد احساس ہوا کہ وہ تو اُسے دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگا
 ہے۔ ایسے دل نے عجیب دکھ اوڑھ لیا تھا۔ کیا وہ آئندہ زندگی میں دامن پر لگے ہوئے
 کر بارود سے کو مٹا پائے گا؟

جنگل کے مال کو پکارنے لگا۔ کوئی نصیحت، کوئی طعنہ، کچھ بھی..... مگر وہ نہ آئی۔ شاید
 آتش ہو گئی تھی۔ یا شاید اس کے ضمیر کی بیداری پر مطمئن ہو کر ہمیشہ کیلئے چلی گئی تھی۔
 نہانا ہو کر بولا۔ ”جب مجھے ضرورت نہیں تھی تو ہر روز سینہ چھلی کرنے کیلئے آ جاتی تھیں۔
 ان ضرورت پڑنے پر بلا رہا ہوں تو دکھائی تک نہیں دیتی ہو۔ کیا میری غیرت کی طرح
 انسانی احساس بھی تھک گئی ہے؟“

وہ خاموشی سے خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتی گئی۔ اُس کے پاس عالمگیر کی ہر ادا
 کا جواب موجود تھا مگر دے کر لاجواب نہیں ہونا چاہتی تھی۔ آہستگی سے بولی۔ ”عالمگیر! تم
 تمہارے لائق نہیں ہوں یا شاید تم کسی اور کو چاہتے ہو۔ دونوں صورتیں مجھے مایوس کر دینے
 والی ہیں۔“

وہ اُس کے مزید قریب ہو کر بولا۔ ”تمہاری سب باتیں بے سرو پا ہیں۔ تم کیا ہو؟
 جانتا ہوں۔ میں کیا ہوں؟ تم نہیں جانتیں۔ میری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی اور نہ ہی
 میں کسی کے پیچھے گیا ہوں۔“
 ”پھر؟“

”مس شاہانہ! میں نادان نہیں ہوں۔ بچہ نہیں ہوں۔ جانتا ہوں کہ تمہیں کوئی چرک لگا
 گیا ہے۔ کوئی زخم تڑپاتا رہتا ہے۔ میری آنکھوں میں دھول جھونک کر میری محبت کا پلا
 اُس پر رکھنا چاہتی ہو۔ مجھ پر اعتماد نہیں کرتے ہوئے محبت کا اظہار کرتی ہو۔ اگر چاہوں
 ایک دن میں ہی تمہارے زخم کو کید کر دیکھ سکتا ہوں۔ جو پریشانی تمہیں رات دن پیٹھے
 رکھتی ہے، اُس کے سوتے تلاش کر سکتا ہوں مگر میں سوچتا ہوں کہ جب تم مجھ پر اعتماد کی نہیں
 کرتی ہو تو مجھے خواہ خواہ تکلفات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔“ لمحاتی توقف کے بعد
 گویا ہوا۔ ”میں سونے کیلئے جا رہا ہوں۔ تمہارے لئے پوری رات پڑی ہے۔ محبت پرچار
 حرف بھیجتے ہوئے یہ فیصلہ کرو کہ کیا تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے؟ اگر ضرورت محسوس کر
 تو میرے ساتھ اپنی پریشانی شیئر کر لینا ورنہ مجھے یہاں رکھنے کا تمہیں کوئی فائدہ
 نہیں ہوگا، میں واپس چلا جاؤں گا۔ تمہیں بند کمرے میں کڑھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا اور نہ
 ہی تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ میں تمہارے شکھ کیلئے جان دینے اور جان لینے کا حوصلہ رکھتا
 ہوں۔“ عالمگیر نے اُسے سمجھانے کے سے انداز میں کہا اور پلٹ کر باہر کی طرف چل دیا۔
 دروازے میں رک کر بولا۔ ”محبت بچوں کا کھیل ہے، بڑوں کا نہیں۔ بچے سو دریاں
 خاطر میں نہیں لایا کرتے۔ بڑے شمار و حساب میں پڑ کر پیچھے رہ جاتے ہیں اور پھر غم
 پیچھتاتے ہوئے اپنے حساب کتاب کی غلطیاں پکڑتے رہتے ہیں۔“
 وہ چلا گیا۔ اسے روکنا چاہتی تھی مگر روک نہ پائی۔ دائیں پہلو میں رکھی ہوئی نرس
 دیکھا۔ نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا۔ بے ذائقہ لگا۔ کھلانے والا کھانے کا ذائقہ بچا کر اپنے

کی ضرورت تھی؟“

وہ بڑبڑائی۔ ”بلا ضرورت بھی کوئی آتا ہے کیا؟“

عالمگیر نے کھلے دروازے کو بند کر کے اُس کے قریب آ بیٹھا۔ ”کہو تو لائٹ آن کر دو؟“

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔ ایسے ہی ٹھیک ہے۔“
مٹی کی مورتی کو جہاں رکھو، جدھر پھینکو، جو بھی کرو، خاموش ہی رہتی ہے۔ عالمگیر نے مٹی کی مورتی کو کبیل سمیت نرمی سے گھسیٹ کر لٹا دیا۔ مورتیاں مزاحمت نہیں کرتیں۔ کبیل کو ست کر کے باہر نکل آیا۔ کچن میں گیا۔ دودھ گرم کر کے لے آیا۔ کپ میں ڈالتے ہوئے لا۔ ”تجھے اتنی سردی میں اپنے کرنے سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ بخار بگڑ جائے تو توں اترنے کا نام نہیں لیتا۔“

وہ کپ دیکھ کر مریضوں کی طرح اٹھ بیٹھی۔ خالی خالی نگاہوں سے کپ کو گھورتی رہی۔
بذا اللہ دودھ نہیں پینا چاہتی تھی۔ وہ بولا۔ ”پکڑو ناں!“
اُس کے جسم میں کوئی جنبش دکھائی نہیں دی تو قریب بیٹھ کر اُس کے منہ سے لگاتے لگاتے بولا۔ ”تم حد سے زیادہ خوشامدیں کرانے لگی ہو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ مجھے تمہارے باپ انوکری چھوڑنا پڑ جائے۔“

وہ عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے دودھ پینے لگی۔ اپنے ہاتھ سے کھانے پینے کا توازن رہتا ہے۔ دوسرا پلائے تو کبھی گھونٹ بڑا ہو جاتا ہے کبھی چھوٹا رہ جاتا ہے۔ کبھی ہانگی ہوتا ہے کہ جام لبریز ہو کر چھلک جاتا ہے۔ دودھ پینے کے بعد وہ بھی چھلک پڑی۔
ماکے کندھے سے سر نکا کر کے اختیار رونے لگی۔ وہ خاموش بیٹھا اُس کے بولنے کا انتظار نہ کیا۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ”میں بہت بری ہوں۔ مجھے اپنے وجود سے بھی گھن لگتی ہے۔ خود کو چھوتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہاتھ گندگی کو چھو بیٹھے ہوں۔ تو ہوں تو ہاتھ خالی ہوتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ میں تم پر اعتماد نہیں کرتی۔ میں کہتی ہوں کہ اکی پر اعتماد کرنے کے قابل ہی نہیں رہی ہوں۔ تم کیا ہو چھنا چاہتے ہو، میں جانتی ہوں میری خرم میرے بولنے سے پہلے ہی میری زبان پر چھالے بنا دیتی ہے۔ تم نے واپس نہ لے کر رکھی دیتے ہوئے مجھے ایک رات کا وقت دیا تھا۔ رات ابھی باقی ہے اور میں

آتش زاد — 222

آنکھوں میں کوئی عکس نہیں لہرایا، کوئی لہر سماعت سے نہیں ٹکرائی تو وہ مایوس ہو کر سوز کی کوشش کرنے لگا۔ سوچیں لوریاں دیتے دیتے آخر کار اُسے سسلانے میں کامیاب ہو گئیں۔

رات نصف سفر طے کر چکی تھی کہ شانی کا سفر عالمگیر کے کمرے کے دروازے پر آ کر گہرا گیا۔ کھلے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ نہیں جاگا تو اندر داخل ہو کر اُس کے بیڈ کے پاس قالین پر ڈھسے سی گئی۔ سانس پھول چکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میلوں کا ابلہ پا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچی ہو۔ سونے والے کی قسمت جاگ رہی تھی۔ اُسے جھنجھوڑ کر جگاتے ہوئے سرگوشیاں کرنے لگی۔ ”اے خوش بخت! دیکھ تو کیا ہے بہر وہ بدل کر تیرے پاس آن پہنچی ہوں۔ جاگ ورنہ تمام عمر سوتا ہی رہ جائے گا۔“
وہ کسمسا کر رہ گیا۔ نہیں جاگا تو پھر قسمت نے سمجھایا۔ ”اٹھ جا ورنہ میں جس راستے آئی ہوں، اُسی راستے سے پلٹ جاؤں گی۔ تم سمجھتے ہو کہ تم اپنی تدبیر سے منزل تک پہنچنے والے ہو، میں کہتی ہوں کہ میرے التفات نے انگلی پکڑ کر تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے۔“
وہ جاگ گیا۔ آنکھیں پٹ پٹا کر ارد گرد دیکھنے لگا۔ قسمت جسے نظروں کے سامنے چاہتی تھی، وہ قدموں کے پاس فرش پر بیٹھی تھی۔ وہ اوپر دیکھ رہا تھا۔ ایسے میں پھر قسمت ٹھوکر دیا۔ ”تم تو زے احمق ہو۔ اوپر لٹکتے ہوئے میرا اپنی قوت بازو سے حاصل کئے ہو۔ میں دینے پر آتی ہوں تو تیز ہوا رواں کر دیتی ہوں جو آن کی آن میں جھولیاں بھڑکا رہے۔ تم اوپر نہیں، نیچے دیکھو۔“

اُس نے نیچے دیکھا۔ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ نائٹ بلب کی نیلی روشنی میں بیڈ کے نکائے بیٹھی وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے شادی کی دوسری رات میں بیوہ ہونے والا عورت قبر پر بیٹھی ہو۔ وہ کبیل پھینک کر نیچے اُترا اور اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ شانی کے جان وجود میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی تو وہ حیرت بھری آواز میں بولا۔ ”ٹاپا! یہاں؟ وہ بھی اس وقت؟“

اُس نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ عالمگیر نے اُسے سے پکڑ کر اٹھایا اور بیڈ پر بیٹھا دیا۔ پتہ چلا کہ اُس کا بدن نہایت سرد تھا۔ جلدی سے کبیل لپیٹتے ہوئے بولا۔ ”تم واقعی احمق لڑکی ہو۔ اتنی سردی میں آدھی رات کو یہاں آنے

تمہارے ساتھ اپنا دکھ شیر کرنے کیلئے آگئی ہوں۔“
وہ بدستور خاموش رہا۔

شانی اُس کے کندھے پر اپنے ہونٹ اور گال رگڑتے ہوئے بیجانی انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”تم مجھے محبت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ چاہتے ہو کہ میں باعزت رہوں۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ تمہیں بتانا چاہتی ہوں مگر یہ بھی جانتی ہوں کہ جو نبی میری زبان کلے، تم مجھ پر تھو تھو کرنے لگو گے اور آنکھوں پر بیٹھانے والے ہاتھوں سے دھکے دے کر باہر نکال دو گے۔“

آہستگی سے اُس کے وجود کو پرے ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔ پڑمردہ قدموں سے چلتے ہوئے کھڑکی کے پردے کے مقابل آن بھڑا۔ شانی کی طرف پیٹھ کر کے بولا۔ ”تم یہ سمجھو کہ کمرے میں تمہارے سوا کوئی نہیں۔ اپنے دکھ کو کھل کر آشکار کر دو۔ میں بغیر روکے نوکے تمہارے آخری لفظ تک خاموش رہوں گا۔“

عالمگیر نے اُس کی پریشانی کا حل ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ اطمینان کا سانس لے کر سوچنے لگا۔
’کتنا اچھا ہے۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا ہے کہ میں نظریں ملا کر کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوں۔ پیٹھ پیچھے تو کچھ بھی کہا جاسکتا ہے۔‘

وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کر کہنے لگی۔ ”محبت بھیک میں نہیں ملتی۔ محبت پھوٹک میں نہیں ملتی۔ محبت زبردستی حاصل نہیں کی جاسکتی البتہ مدد مل جاتی ہے، ہمدردی حاصل ہو جاتی ہے۔ میں اعتماد کرتے ہوئے تمہیں سب کچھ بتا دیتی ہوں۔ محبت دینا، ہمدردی یا مدد بہم پہنچانا یہ سراسر تمہاری مرضی پر موقوف ہوگا۔ تو سنو.....“

وہ بلا روکے نوکے بولتی جا رہی تھی۔ سچ بولنے سے اضطراب کم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے تھکے ہوئے بدن کو سچ کی لاشی تمہار ہی تھی۔ ایسے میں عالمگیر کھڑکی کی طرف منہ کئے سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا رہا، گہرے کش لیتا رہا۔ سسکیوں کی تال پر مچلتی داستان کے تمام ہونے تک سگریٹ کی ناگوار بو سے کمرہ رنج گیا تھا۔ لفظ ختم ہو چکے تو وہ گھٹنوں پر پیشانی ٹکا کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگ گئی۔

عالمگیر نے کھڑکی کھول دی۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوا کمرے میں داخل ہوئی تو سانس لینا قدرے آسان ہو گیا۔ مڑ کر اُس کے قریب آیا۔ چہرہ اٹھایا۔ دریا نے سیلاب کیلے زمین؟

بے دردی سے انڈیل رکھا تھا۔ انگلیوں کی پوروں سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔
”شاہانہ! تم نے جتنا رونا تھا، رولیا۔ جتنا دکھ جھیلنا تھا، جھیل لیا۔ اب میں تمہاری دنیا میں آ گیا ہوں۔ جاؤ! جا کر اطمینان سے سو جاؤ۔“

وہ سکتے ہوئے استفہامیہ لگا ہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ سمجھانے لگا۔ ”میں نے کہا تھا کہ تمہاری پریشانی ختم ہو چکی ہے۔ اگر تم پہلے دن ہی مجھے تمام صورت حال سے آگاہ کر دیتیں تو اتنا کچھ دیکھنا نہ پڑتا۔ جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ وہ واپس نہیں ہو سکتا مگر جو نہیں ہونا چاہیے، وہ کبھی نہیں ہوگا۔ تمہاری طرف آنے والے ہر دکھ کو، ہر پریشانی کو سنبھال لوں گا۔ اگر اُس کینے کا فون آئے تو تم اینڈ کر کے خاموشی اختیار کر لینا۔ اُس کی کسی بات کا جواب نہ دینا۔“

وہ بولی۔ ”بھیک، ہمدردی یا محبت؟“
وہ مسکرا کر اُس کے قریب کھسک آیا۔ آنکھوں کو دالہانہ انداز میں چومتے ہوئے بولا۔
”آئی لو پریشانی! بھیک اور ہمدردی تو رہی ایک طرف، میری نظر میں تم آج بھی اس قابل ہو کہ محبت کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکو۔“

عالمگیر نے ایک ہی جست میں برسوں کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ آنکھوں نے رسنا بند کر دیا، جھومنا شروع کر دیا۔ آنکھوں کو ملنے والے انعام پر شاید ہونٹ بھی چل گئے تھے، اس لئے بڑے دنوں کے بعد لبوں پر مسکراہٹ اتر آئی۔

کلی ہوئی کھڑکی کی بدولت فجر کی اذان سنائی دینے لگی۔ دونوں نے چونک کر دیوار گیر گھڑی کی سمت دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ شانی گھبرا سی گئی۔ بولی۔ ”رحمت بی کے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تمہارے ساتھ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔“

یہ سے اتر کر سلیم پھرتے ہوئے بولی۔ ”میں چلتی ہوں۔ پایا کا فون آئے تو انہیں کہہ دینا کہ مجھ سے بات کر لیں۔ تم میرے پاس رہو گے۔“

عالمگیر نے فس کر کہا۔ ”اب کون کا فون سے دور جانے کی سوچے گا؟“

وہ بھی فس دی۔ بلی تو چونک گئی۔ رحمت بی دونوں کو لوہوں پر ہاتھ رکھے عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھبرا کر عالمگیر کی طرف مڑی۔ وہ جناما نگے تو جہر پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”رحمت بی! یہ تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں آئی تھی۔ تم کہاں تھیں؟“

جواب نہیں ملا تو وہ بیٹھ کر بولا۔ ”تم بولتی کیوں نہیں ہو؟“
 یوں لگ رہا تھا جیسے شانی نے کال ریسیو کر کے فون کو خود سے پرے رکھ دیا تھا۔ وہ اپنا
 غصہ ظاہر کرتا رہا مگر شانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے کال منقطع کر دی۔ مسکرا نے لگا۔
 شانی اُس کی ہدایت پر پوری طرح عمل پیرا ہوئی تھی۔ اُس نے پھر نمبر بدلا۔ منیر نے قصائی
 سے رابطہ کیا اور کہا۔ ”جان عالمگیر! کس حال میں ہو؟“

منیر آہ بھر کر بولا۔ ”ہائے! کیا حال پوچھتے ہو مجھ خانہ خراب کا۔ اندھا ہوں، سرمہ
 تلاش کر رہا ہوں مگر نہ تو کوئی سوداگر ملتا ہے، نہ سرمہ دانی ملتی ہے۔ تم کہو! میرے کام کا
 کیا ہوا؟“

وہ بولا۔ ”دونوں سے تمہارے لئے خاک چھانتا پھر رہا ہوں۔ کل پتہ چلا تھا کہ بڑی
 رکارہ نے یہاں کے کسی گروہ کی خدمات حاصل کی تھیں۔ خدا خدا کر کے گروہ ٹریس ہوا
 ہے۔ امید ہے کہ کل شام تک ماسٹر کابی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ پھر بول!
 مجھے کیا انعام دیا جائے گا؟“

منیر نے خوش ہو کر کہا۔ ”ملک امجد تمہارا منہ چوم لے گا۔“

وہ ہنسا۔ ”میں نے انعام کی بات کی ہے۔“

”جو یار کے منہ سے پھوٹا، وہی ملے گا۔“

”تاکر انعام لیتا یا پوچھ کر دینا، کمینوں کا کام ہوتا ہے۔“

منیر اگلی دے کر بولا۔ ”انسان بن۔ ایسی ڈوگھٹی باتیں نہ کر میرے ساتھ۔ تو کمینہ
 مت بن، ہم بن کر پوچھ لیں گے۔“

اُس نے قہقہہ لگا کر فون بند کر دیا۔ لان میں آیا جہاں ٹھنڈی شبنم زدہ گھاس پر شانی بیٹھ
 بیٹھ چلا رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”اتنی سردی میں بیٹھ پیر چل رہی ہوا۔“

وہ ہنسی۔ ”تم نے کہا تھا ناں کہ میری طرف آنے والی ہر پریشانی کو سنبھال لو گے۔
 یار بڑی تو سنبھال لیتا۔“

وہ حیرانی سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ چند گھنٹوں میں کتنی بدل گئی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ
 محبت فائن عالم ہوتی ہے۔ بولی۔ ”اُس کا فون آیا تھا۔ میں نے وہی کیا، جو تم نے کہا تھا۔“

وہ بولا۔ ”بہت اچھا کیا۔ اس کا فون ملا کر مجھے دو۔“

وہ مصنوعی خنگی سے بولی۔ ”پھر یہاں بیٹھ کر بی بی نے دو چار گھنٹے میرے آنے کا انتظار
 کیا۔ یوں ہی سہی۔ بی بی کا انتظار ختم کرنے کیلئے میں آگئی ہوں۔“

دونوں کھسکا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ رحمت بی بی نے دونوں کے بیچ میں کمرے
 ہو کر ہاتھ بچا کر کہا۔ ”عشقاً وے چھڈ پلا، ویلے دی تروٹ وچ۔ ہولیاں وی گل کیڑی،
 بھارے ڈگ پیندے نیں۔ جو تم برے بن بیٹھے تو کیا بگڑ گیا زمانے کا؟ کچھ بھی تو نہیں۔
 غلطی کو غلطی تک محدود رکھو گے تو میری زبان بند رہے گی۔ غلطی کو گناہ بنانے کی کوشش کرو
 گے تو میں خاموش نہیں رہوں گی۔ رُب جاتے، غلطی ہوئی ہے، گناہ ہوا ہے مگر میں نے
 اندازہ لگایا ہے کہ ابھی صرف غلطی سرزد ہوئی ہے۔ گناہ کرنے والوں کے چہروں پر
 معصومیت نہیں ہوتی۔ تمہارے چہروں پر معصومیت ہے۔“

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے دونوں کے بیچ میں سے ہٹ گئی۔ دیوار فاصلے
 بڑھاتی ہے، مگر کرفاصلے مٹا دیتی ہے۔

ناشتے کی میز تک دونوں اکٹھے رہے، پھر اپنی اپنی دنیا میں لوٹ آئے۔

عالمگیر کیلئے آنے والا دن خاصا مصروف گزرنے والا تھا۔ اُس نے مطلوبہ اشیاء کا پیکٹ
 بنا کر ڈرائیور کے ہاتھ سردار کے پاس بھجوا دیا۔ فون کر کے بتلایا۔ ”سردار! میں نے کہا تھا
 ناں کہ تمہاری شامت آنے والی ہے۔ اُن کم بختوں نے تمہیں پھانسی پر لٹکانے کا مکمل
 بندوبست کر رکھا ہے۔ پیکٹ ڈرائیور کے ہاتھ تمہیں شام تک مل جائے گا۔ کسی کی موجودگی
 میں کھول کر مت دیکھنا۔“

سردار نے کہا۔ ”تم خود کیوں نہیں آئے؟“

وہ بولا۔ ”میں نہیں آ سکتا۔ شانی بی بی کے ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔ اُسے یہاں اکیلا نہیں
 چھوڑا جا سکتا۔“

سردار نے پوچھا۔ ”کیا ہے اُس پیکٹ میں؟“

”تم خود دیکھ لو گے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ شام کو بات ہوگی۔“

فون بند ہو گیا۔ اُس نے نمبر بدل کر شانی سے رابطہ کیا۔ وہ اس وقت لان میں چل
 قدمی کر رہی تھی۔ کال ملا کر اُس نے کہا۔ ”شاہانہ فضل! کیسی ہو؟“

نفی میں سرگھا کر، خاموش رہ کر سوچنے لگی۔ ”پاپا سخت ضرور ہیں مگر ایسے بھی نہیں کہ میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری کرنے کی بجائے رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ وہ میری بات مان جائیں گے۔“

پھر اچانک سوچ میں پڑ گئی۔ ”میں نے ابھی تک عالمگیر کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ یہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے؟ کیا شادی کیلئے پروپوز کر رہا ہے۔ شاید ایسا ہی ہے۔“
اُسے نظروں ہی نظروں میں جا چکی تھی، پھر شرما کر نظریں پھرانے لگی۔ عاشق کے ہاتھ میں رسی کا ایک سرا آ گیا تھا۔ محبت کے ساتھ ہاتھوں پر لپٹنے لگا۔ فریڈ شوق سے اپنے قدم کے برابر تک اترے ہوئے چاند کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”لاکھ رستے میں اڑتی رہے، زور لگواتی رہے، ایک نہ ایک دن تو رسی اپنا دوسرا سرا میری تحویل میں دینے پر مجبور ہو جائے گی۔“



وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”کوئی فائدہ نہیں۔ وہ فون بند رکھتا ہے یا سیلولر ماڈیول فون سیٹ سے باہر نکال دیتا ہے۔“
وہ تھپیسی انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”کوئی بات نہیں۔ کہاں تک بھاگے گا، آخر ہاتھ لگ جائے گا۔“

اُس کے قدموں کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ مایوسی سے بولی۔ ”آج شہر میں گھونسنے کوئی چاہ رہا تھا مگر تم نے مزہ ہی کر کر کر دیا۔ ڈرائیور کو گاڑی دینے کی کیا تک تھی؟ وہ بس پرچی جاسکتا تھا۔“
وہ بولا۔ ”کہو تو ٹیکسی منگو لیتا ہوں۔“
وہ بولی۔ ”نہیں!“

عالمگیر بھی اُس کے مقابل گھاس پر پسر کر بیٹھ گیا۔ شانی نے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلاتے ہوئے کہا۔ ”پتہ ہے، پاپا تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔“
”ہاں! جانتا ہوں۔ گھوڑا اچھا دوڑتا ہو، کتا اچھا لڑتا ہو، مالک پیار کرتا ہے۔ لنگڑے گھوڑے اور پھدے گتے کو گولی مار کر نئے خرید لیتا ہے۔“ اُس کا لہجہ بظاہر عام سا تھا مگر ایک ایک لفظ میں زہر بھرا ہوا تھا۔

شانی نے جلدی سے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ تڑپ کر بولی۔ ”تم غلط کہتے ہو۔ تم انسان ہو، گھوڑا یا کتا نہیں ہو۔ پاپا بھی ایسے نہیں ہیں، وہ واقعی تم سے محبت کرتے ہیں، تم پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔“

وہ بے دلی سے مسکرایا۔ ”شانی! جب تم اُس سے اپنی اور میری شادی کی اجازت مانگو تب تمہیں پتہ چلے گا کہ نوکر اور ہم پلہ میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ وہ مر جائے، زمین میں گڑ جائے گا مگر تمہیں ایسا نہیں کرنے دے گا۔“

وہ شادی کے تذکرے پر شرمائی، باپ کی بد خوئی پر تلملائی۔ عالمگیر کو تاثرات کی غیر معمولی آمیزش بھلی گئی۔ یوں لگا جیسے کڑکتی دھوپ میں بارش برسنے لگی ہو۔ جیسے چولے پر پتے ہوئے توے پر برف کی ڈلی رکھ دی گئی ہو۔ جیسے سمندر کے پانی پر تیرتے ہوئے تیل نے آگ پکڑ لی ہو۔ وہ اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا میری بات بُری لگی؟“

نہ۔ اگر میں اپنی بہو کو بیاہ کر یہاں لے آؤں گا تو اُس کی ماں اور جوان بہن کا کیا ہے
 ۴۴؟ کیا وہ تنہا رہیں گی؟“
 سبھی کو جھٹکا سا لگا۔ اس رخ پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ ماں بولی۔ ”تو کیا اب وہ
 اکیلی نہیں ہیں؟“
 امجد نے کہا۔ ”سب کو یہاں لے آئیں گے۔“

ارشاد نے کہا۔ ”سب کو یہاں لانے سے بہتر یہ ہے کہ بھائی کی رخصتی کی بجائے تمہاری
 رخصتی کر دی جائے۔ وہیں بیٹھ کر عدالت لگا لینا۔ کیا جاتا ہے ایسا کرنے میں؟“
 سبھی نے اپنے اپنے طور پر سوچا۔ سبھی اس پر متفق ہو گئے کہ امجد کو اپنی ساس کے گھر
 میں شادی کے بعد منتقل ہونا چاہیے۔ امجد اڑ گیا۔ وہ اپنے گھر کو چھوڑنے کے خیال پر گھبرا
 گیا۔ قطعی لہجے میں بولا۔ ”گستاخی شمار کی جائے، ضد قرار پائے یا کچھ بھی ہو، میں اپنا گھر
 نہیں چھوڑ دوں گا۔ ساس کے گھر میں داماد، بہن کے گھر میں بھائی، دونوں کو معاشرہ کتا کہتا
 ہے۔ میں باپ کے در کا کتا بننا پسند کروں گا، کسی اور در کا نہیں۔“

بھائیوں اور باپ کے اصرار پر وہ روٹھ کر گھر سے نکل آیا۔ نور پور کی دیکھی بھالی گلیوں
 میں آوارہ پھرتا رہا۔ ہر گھر سے اُس کی بچپن کی شناسائی تھی۔ ہر چہرہ اُس کا اپنا تھا۔ کئی
 گھروں میں گیا۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد پھر بے چینی ہونے لگتی تو اُٹھ کر باہر نکل آتا۔
 ایسے میں خیال آیا کہ دنیا میں دل کے درد کو سمجھنے والا ایک ہی سمجھا ہوتا ہے۔ باقی سب وقتی
 اور عارضی بہلاوا ہوتے ہیں۔ کیوں نہ اپنے مہربان کے پاس جایا جائے۔

ریش دکان والے سے موٹر سائیکل لی اور محبت کے راستے پر چل پڑا۔ ہوا سامنے سے
 آ رہی تھی۔ بالوں کو اڑاتے ہوئے اُس سے انگیلیاں کرتے ہوئے شرارت سے بولی۔
 ”میں کچھ دیر پہلے تمہاری محبوبہ کے پہلو سے نکل کر آئی ہوں۔ تم مل گئے، اچھا ہوا۔ تمہیں
 بتاتی ہوں کہ جس طرح تم بے چین ہو، ویسے ہی وہ بھی بے قرار ہے۔ ملاقات کر کے تم
 چین حاصل کرو، وہ قرار حاصل کرتی ہے۔ واپس آؤ گے تو حال پوچھوں گی۔“

وہ ہونٹ سیڑ کر سیٹی بجانے لگا۔ تیز ہوا کے باعث اپنے ہونٹوں سے نکلتی ہوئی آواز
 سنانے نہیں دے رہی تھی مگر محسوس ہو رہا تھا جیسے روح کی ترنگ سے نکلتے ہوئے سر ہوا میں
 بکھر کر اُس کے محبوب تک پہنچ رہے ہیں۔

ملک فرید نے فون کر پڈل پر بیٹھتے ہوئے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ بڑا بیٹا باپ کے
 قریب کھڑا تھا۔ بولا۔ ”ابا جی! چاچا کیا کہتا ہے؟“

باپ نے غصے بھری نظر بیٹے پر ڈالی۔ ایسے جیسے بیٹے نے کوئی سنگین غلطی کر لی ہو۔ پل
 کر ٹی وی لاؤنچ کے آخری سرے پر پہنچ کر کہا۔ ”وہ اس قابل تھا کہ اُسے ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیا
 جاتا۔ میں نے اُس کے گھر میں جا کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔“
 امجد قریب آیا۔ ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے بولا۔ ”آپ باپ ہیں، ہم آپ کے بیٹے
 ہیں۔ اپنے بھائی کا غصہ ہم پر اتار لیں مگر دل پر نہ لیں۔ ہم تینوں بھائیوں کو اندازہ تھا کہ
 چاچا جی نہیں مانیں گے۔ رئیس پڑھا لکھا اور لاہور کی بڑی سوسائٹی کا دلدادہ لڑکا ہے۔ وہ کئی
 طرح بھی ہمارے علاقے کی پسماندگی میں اپنے ارتقائی بیج بونے پر قائل نہیں ہوگا۔ کیا اب
 ہی ہوا ہے؟“

باپ کا غصہ اتر گیا۔ چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر بڑے بیٹوں کی طرف فاتحانہ نظروں
 سے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ”یہ ہوتا ہے پوچھنے کا طریقہ! وہ کہتا ہے کہ میرا بیٹا نہیں مانتا۔“
 امجد جھپٹ کر سامنے آ گیا۔ ”ابا جی! یہ طریقہ تو بڑے بھائی نے ہی مجھے سکھایا ہے۔
 ویسے چاچا کے انکار پر آپ کو خفا ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہیے تھا کیونکہ زینہ بھی تو
 شادی پر رضامند نہیں ہے۔ چاچا نے انکار کر کے آپ کو شرمندگی سے بچا لیا ہے۔“

تینوں ہنسنے لگ گئے۔ ماں بولی۔ ”یہ سوچو کہ اب کرنا کیا ہے؟“
 امجد نے لا پرواہی سے کہا۔ ”یہ سوچنے کی بات نہیں ہے۔ زری کے نصیب میں جس گھر
 کی راجدھانی لکھی ہے، وہ اُسی گھر میں پہنچے گی۔ ویسے بھی ابھی بہت وقت پڑا ہے۔“
 باپ نے فکر و تردید میں پڑ کر کہا۔ ”ملک زادو! ایک پہلو تشنہ ہے۔ تم نے سوچا نہیں اب

چمٹنے لگا۔ وہ بے خود ہونے لگی۔ شرماتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”بڑے ظالم ہو امجد! خود کو اس گنہگار میں ڈھال کر غضب ڈھاتے رہتے ہو۔ جب سونے لگتی ہوں تو یہ میرے ہونٹوں سے چٹتا ہے، میری آنکھوں پر براجمان ہوتا ہے، میرے دل کی دھڑکن سنتا ہے۔ جانتی ہوں کہ یہ بے جان پتھر نہیں، تم ہو۔ پھر بھی سینے سے لگائے رکھنے کو جی چاہتا رہتا ہے۔ اے بے جان کس! کبھی تم جان کھینچنے لگتے ہو، کبھی تمہیں مجھ پر مسلط کرنے والا دھڑکنیں بڑانے لگتا ہے اور کبھی میں آپوں آپ خود سپردگی پر مائل ہو جاتی ہوں۔ کیا ایسے میں زندہ رہ پاؤں گی؟“

سوال اپنے آپ سے کیا تھا۔ جواب دیئے کیلئے امجد صحن سے اٹھ کر کچن میں چلا آیا۔ چائے سے لبریز ٹرے کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ بولا۔ ”میرے ساتھ بھی ایسا ہونے لگا ہے۔ عید اللہ سے ملنے کیلئے نکلتا ہوں اور اُس کے دروازے سے گزر کر خالد کی بیٹھک میں پہنچ جاتا ہوں۔ ماں کہتی ہے کہ بھائی کو فون کر کے کہہ دو کہ واپسی پر ترکاری لئے آئے، میں پایا کوٹن پر پیغام دیتا ہوں کہ ماں کہتی ہے جلد لوٹ آئیے۔“

وہ چونک گئی۔ اپنی حماقت پر شرمندگی ہوئی۔ دل سمجھانے لگا۔ ”فکر نہ کرو۔ جو کام تم بڑی آسودگی کیلئے نہیں کر سکتی تھیں، میں نے خود کر لیا ہے۔ چاہنے والے کو اپنے جنوں سے آگاہ کر دیا ہے۔“

اُس پر جھک کر امجد نے بڑے میں رکھا ہوا کپ اٹھایا۔ اُسے شیلف پر رکھے ہوئے ٹیپن پر رگڑ کر پینڈا صاف کیا اور لبوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”اباجی چاہتے ہیں کہ میں ٹائلی کے بعد گھر داماد بن کر یہاں آ جاؤں۔ میں ایسا نہیں چاہتا۔ تم سے پوچھا جائے تو برسے کاڑ کی حمایت کر کے میرا دل رکھ لینا۔“

دوپہر کی پڑھائی ہو لے ہو لے لرز رہی تھی۔ چولھے میں جلتی آگ کی تپش چہرے پر ثبت ہو چکی تھی۔ ہو لے سے بولی۔ ”میں وہاں جاؤں گی جہاں آپ لے جائیں گے۔“

دو خیرہ لگا ہوں سے قدموں میں بیٹھی بتول کے ادھ ننگے کندھے کو دیکھ رہا تھا۔ ایک لڑکھڑکائے چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کے برسے کو دیکھ رہی تھی۔ امجد نے دیکھی جانے والی دونوں چیزوں کا موازنہ کیا۔ بولا۔ ”تم بڑا کوڑکھ رہی ہو، پتھر میں دھڑکن نہیں ہوتی، گداز نہیں ہوتا۔ میں پُر دھڑکن اور پُر گداز

موٹر سائیکل ڈیرے کے برآمدے میں کھڑی کر کے زنان خانے کی طرف بڑھ گیا۔ قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ بتول صحن میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ قریب آ کر اُس نے کہا۔ ”دوسرے لوگ دکھائی نہیں دے رہے، کہاں گئے ہیں؟“

وہ کھڑی ہو کر بولی۔ ”ایک مزارعے کی بیٹی کی منگنی ہو رہی ہے، دونوں ماں بیٹی اُن کے گھر میں پہنچی بیٹھی ہیں۔“

آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ”اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ کیا تمہیں مجھ پر اعتقاد نہیں رہا؟“

وہ گڑبڑا اٹھی۔ ”نن..... نہیں تو..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

وہ اُس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا تمہائی سے ڈر رہی ہو؟ سوچ رہی ہو کہ ایسے میں کوئی آ گیا تو کیا سمجھے گا۔ ہے نا؟“

وہ شرما کر، ہنس کر، دوپٹے کے پلو سے کھیلنے لگی۔ امجد چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ جہاں تھی، وہیں کھڑی رہی۔ دل اُس کے پاس رہنے کو بے تاب تھا، لجاجت بھاگ اٹھنے پر اُسکائے جارہی تھی۔ کبھی دُعا کرتی کہ زرینہ اور اماں فوراً واپس پہنچ جائیں۔ کبھی دل میں آرزو بک جاتی کہ عمر بھر کوئی نہ آئے، دونوں کے بیچ میں ہوائیکوں کو بھی معلق نہ کرے۔

امجد کی شرارت اور چاہت سے معمور نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے کچن کی طرف بھاگ گئی۔ وہ جان بوجھ کر چائے بنانے میں تاخیر برتتے ہوئے کن اکھوں سے کلمے دروازے سے باہر جھانک کر اُسے دیکھ لیتی۔ دکھائی نہیں دیتا تھا تو مَن میں بے چینی بھری رہتی تھی۔ سامنے آتا تھا تو دل بے طرح دھڑکنے لگتا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹ کے غلوٹے پھونٹنے لگے۔ کلیوں کو کھلنے سے روکنے کیلئے لبوں پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی۔ ”ہائے امجد! کیا ہو؟ پاس ہوتے ہو تو دنیا جہان کی خبر نہیں رہتی۔ دور ہوتے ہو تو اپنی پہنائی ہوئی انگوٹھی کے ٹکینے میں سمائے رہتے ہو۔ یہ تمہاری محبت کا اعجاز ہے یا میری روح تک اُڑ جانے والے کیف کا کمال ہے کہ ہر سسے جی چاہتا ہے کہ میں، میں نہ رہوں، تم ہو جاؤں۔ تم نہ رہو، میں ہو جاؤں۔ ملاپ کی یہ گھڑیاں اسی لمحے پر کیوں ٹوک نہیں جاتیں؟“

چائے کپ میں ڈال رہی تھی۔ کپ بھر گیا۔ ٹرے چائے سے بھرنے لگی۔ بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں جگمگانے والی انگوٹھی کو دیکھنے لگی۔ ننھا سا ڈائمنڈ امجد کی آنکھ بن کر آئے

تمہارا ہمارے بڑوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔“
 وہ ہنسا۔ ”کیسی بچوں جیسی باتیں کرنے لگے ہو سردار! میں تھرڑ میں ہوں، تمہارا دشمن نہیں یا انڈورلڈ کا کوئی بڑا نہیں ہوں۔ میرا کام صرف رابطہ کرنا ہے۔ ادھر کی بات ادھر، ادھر کا پیغام ادھر پہنچانا ہوں اور بس..... کس نے کیا کیا ہے؟ میں کچھ نہیں جانتا۔“
 سردار کا لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس نے پہلے وار میں ہی گردن جھکا لینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ کیا اس وقت دوسری پارٹی کا پیغام مجھ تک پہنچانے کیلئے فون کر رہے ہو؟“
 ”تم ٹھیک سمجھے ہو۔ سیٹھ سجانی چاہتا ہے کہ تم سیاست کے ریس کورس میں دوڑنے کے لئے نہیں رہے ہو، ریٹائرمنٹ لے لو۔ تمہارے اسٹینڈ پر وہ کسی اور کو کھڑا کرنا چاہتا ہے۔“
 ”ہائیں..... یہ کیسے ممکن ہے؟ بھلا کوئی سیاستدان بھی ریٹائرمنٹ لیتا ہے؟“ سردار غل کادل بری طرح دھڑک اٹھا۔

”کوئی ریٹائرمنٹ لیتا ہے یا نہیں، تمہیں لینا پڑے گی۔ یہ سیٹھ کا فیصلہ ہے۔ اگر تمہیں اس فیصلے سے اختلاف ہے تو کھل کر بات کرو۔ اس صورت میں تمہیں کیا اختیار ہ بھگتا پڑے گا، یہ ذہن میں ضرور رکھنا۔“

سردار کنگش میں پڑ گیا۔ متذبذب لہجے میں بولا۔ ”میں فوری طور پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ مجھے کچھ وقت چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔ تمہیں کل تک سوچنے کا وقت دیتا ہوں۔ ہاں یا نہ۔ جو جی میں آئے۔ لکھنے کی صورت میں تمہیں فوری طور پر اپنی نشست سے استعفیٰ دینا پڑے گا۔ نہ کرنے کی صورت میں تمہیں عدالت میں گھسیٹ لیا جائے گا۔ اوکے! پھر ملیں گے۔“
 عالمگیر نے فون بند کر کے سوچنے لگا۔ ”کیا سردار مستعفی ہو جائے گا؟“

اپنی سوچ پر ہنسی آ گئی۔ سردار کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بھیجی گئی فائیلوں میں ایک فائل ایسی تھی جس پر ملک کی ہر عدالت اُسے سزائے موت سے کم سزا نہیں دے سکتی تھی۔ اُس کے جرائم کی فہرست بہت طویل تھی۔ ثبوت ایسے تھے جنہیں کسی فورم پر رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اُس نے قاتلین پر یوں پاؤں جما کر سختی سے رگڑا جیسے پاؤں کے نیچے دارا کی ڈم آگئی ہو جسے رگڑ کر پیس دینا اُس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش رہی تھی۔

قدرت کے تراشیدہ ہیرے کو دیکھ رہا ہوں۔ تم بے قابو ہو کر پتھر کو چوم نہیں سکتے ہو، میں چوم سکتا ہوں۔“

اُس کے سنہلنے سے پہلے ہی اُس نے جھک کر کندھے اور گردن کی درمیانی دل آویز پستی کو چوم لیا۔ وہ۔ ”ہائے اللہ“ کہہ کر مزید جھک گئی۔ وہ پلٹ کر بچکن کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ خمار آلود آواز میں بولا۔ ”چائے کا پہلا گھونٹ بہت گرم لگا۔ جھکے کے سیدھا ہوا کہ دوسرا گھونٹ پیا تو یوں لگا جیسے چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔“

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی تو وہ کپ تھا جسے صحن میں آ بیٹھا۔ اُسے خبر نہیں تھی کہ وہ گھنٹوں میں سر ڈالے پتھر کو دیوانہ وار چومے جارہی تھی اور دل ہی دل میں کہتی جارہی تھی۔ ”تم پر ہو کہ پتھر میں دھڑکن نہیں ہوتی، بے گداز ہوتا ہے۔ اسے بے قابو ہو کر چومنا نہیں جاسکتا انجان ہو۔ تم اپنے ہیرے کو ایک بار چوم کر شانت ہو جاتے ہو، میں دن میں ہزاروں بار اس پتھر کو چومنے کے باوجود پرسکون نہیں ہو پاتی۔“

وہ بچکن میں ہی تھی کہ اماں اور زری آن پہنچیں۔ اماں نے حسبِ عادت بلائیں لیں زری نے چمک کر کہا۔ ”ہائے باجی! مجھے فون کر دیا ہوتا تو ہمیں کچھ دیر ہو ہی جاتی.....“
 وہ شرما کر مسکرانے لگی۔

امجد نے زریہ کو مخاطب کر کے کہا۔ ”مبارک ہو زری! انکل ظہور تمہیں دیکھنے کیلئے نہیں آرہے۔ تمہاری دعا قبول ہو گئی ہے۔“

چند ساعتوں تک اُسے امجد کی کہی ہوئی بات کی سمجھ نہ آئی۔ جب سمجھی تو منہ ہا کر بولا۔ ”اگر وہ آ بھی جاتے تو بھی میری دعا قبول ہو جاتا تھی۔ میں شاید زندگی بھر اُن لوگوں۔ نباہ نہ کر پاتی۔“



عالمگیر اپنے کمرے میں لیٹا کافی دیر سے سردار سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ٹیٹ ورک بڑی ہونے کی وجہ سے ناکام ہو رہا تھا۔ اچانک کال مل گئی۔ وہ لہجہ بدل کر بولا۔ ”ہاں سردار فضل خان! تحفے وصول کرنے کے بعد کیا محسوس کر رہے ہو؟“
 دوسری طرف سے کافی دیر تک آواز نہیں آئی تو اُس نے اپنی بات دہرائی۔ سردار نے تحفے انداز میں بولا۔ ”ہاں ہاں سن رہا ہوں۔ یہ تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ میں نے بھی“

”تم اس سلسلے کو ختم کیوں نہیں کر دیتے؟“

”اماں! صرف چند دن اور.....“

اماں نے رُخ پھیر لیا۔ ننھے سے شعلے میں ماں کا دوپٹے میں ڈھکا ہوا سر عقب سے دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”ماں! یوں منہ پھیر کر نہ جاؤ۔ میں تمہاری ہر بات مان لوں گا۔ بتیں مانو! میں برائیاں نہیں ہوں۔ میں بے ضمیر نہیں ہوں۔ میں تمہارا خون ہوں، تمہارا دودھ پی کر بڑھا ہوں، تمہاری دعائیں لے کر جوان ہوا ہوں۔ تمہارے پڑھائے ہوئے تمام سبق مجھے آج بھی اچھی طرح آزر ہیں۔ خدا کیلئے اپنے خون اور دودھ پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے چند دن کی مہلت دے دے۔“

اماں کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ آنسوؤں سے رُندھی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”تم وہی کچھ کر رہے ہو جو کل تک سردار فضل خان کرتا رہا ہے۔ تم میں اور اُس میں کیا فرق ہے؟ اُس نے تمہارے باپ کو مارا، تم نے اُس کی بیٹی کو جیتے جی مار دیا۔ اُس نے تمہاری ماں کو در در کی ٹوکروں کے سپرد کیا، تم اُسے در بدر کرنے والے ہو۔ نہ اُس نے عورت کے تقدس کی (ت) کی، نہ تم کر رہے ہو۔ میری نظروں میں تم دونوں کی شکلیں ایک سی ہیں، قد ایک سے بلا ہونپ ایک سا ہے۔“

اماں ہاتھ لہرا کر اوجھل ہو گئی۔ اُس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو محسوس ہوا کہ وہ مسلسل دے جا رہا ہے۔ آنسو پونچھ کر سوچنے لگا۔ ”شاید ماں ٹھیک کہتی ہے۔ میں نے غلط کیا ہے مگر اب کیا کر سکتا ہوں۔ پیچھے ہٹتا ہوں تو بن موت کے مارا جاؤں گا۔ آگے بڑھتا ہوں تو لانا راض ہوتی ہے، ماں کا خدا ناراض ہوتا ہے۔“

بند کرے میں ہوا کا جھونکا داخل نہیں ہو سکتا۔ موم بتی کے بجھنے کا کوئی جواز نہیں تھا مگر وہ بلکہ بچھ کر گئی۔ وہ حیران ہوا۔ حیرانی اپنی ہیئت بدلنے لگی۔ میز پر پڑی موم بتی کے بجھنے پر اُس تصور میں ایک سکرین روشن ہو گئی۔ وہ گردن تکتے بازو رکھ کر ہونٹ کاٹنے لگا۔ اضطراب بڑھتا ہوا تھا جوں جوں سکرین پر دکھائی دینے والا منظر ایک واضح شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ ایک جواں سال گہری اور لمبی مونچھوں والے شخص اچھڑا ہوا ہنسنے سے نکل آیا۔ سرخ و سپید رنگت، اونچا لانا بقا، علاقائی روایتی لباس.....

..... ہونٹوں پر تشنگی آمیز پڑیاں.....

آتش زاد 236

جب بھی وہ تھرڈ مین بن کر قہر کے تنور میں سردار کے طعنائی کو ڈال کر آگ دہکاتا تھا، سردار اور کیف کی عجیب و جلدانی کیفیت اُس پر طاری ہو جایا کرتی تھی۔ وہ چشم تصور میں اسے بھیگی بلی بنا دیکھ کر لطف لینے لگتا تھا۔

رات سمٹ کر کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ جانے کیوں غرور اور تمکنت سے بھری جوانی میں دھڑکتا ہوا دل بیٹھنے لگا ہو۔ وہ الماری تک گیا۔ ایک موم بتی نکال کر لائٹر سے روشن کرنے لگا۔ روشن ہونے پر موم کے چند پچھلے ہوئے قطرے میز پر پڑ گئے، اُن پر موم بتی ٹکایا اور خود بند پر آ کر دراز ہو گیا۔ لو پر نظریں جمائے ہوئے بڑبڑایا۔ ”اماں! بہت دن ہوئے، تم نے میرا پیہ نہیں لیا۔ چاہے مجھ سے جھگڑو، برا بھلا کہو، مگر یوں زیادہ دیر کیلئے تہاہ چھوڑا کرو۔ دیکھو! میں کتنا تنہا ہوں، دیکھو! میں کتنا اداس ہوں، دیکھو! شیر جیسی طاق رکھنے والے کے اندر کتنی کمزوریاں بھری ہوئی ہیں۔ چلی آؤ اماں!“

پہلے ماں کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا، آج ملنے کی آرزو کر رہا تھا۔ ماما کا دل بچ گیا۔ لو میں سفید آنچل لہرایا تو آنچل کر بولا۔ ”ہائے اماں! تم کتنی اچھی ہو۔“

اماں کے چہرے کے جھریوں بھرے خطوط واضح ہونے لگے۔ ہونٹ دکھائی دیے، بچ ہونٹوں سے نکلنے والی آواز سماعت سے نکلرائی۔ ”میں سوہنے رب سے تیری سلامتی کی دعا مانگتی ہوں تو تیرے اندر چھپے ہوئے شیطان کی عمر دراز ہو جاتی ہے۔ شیطان کو بد عادتوں ہوں تو میری ماما کا پیہ لگتی ہے۔ تم نے علم دین سے عالمگیر بن کر مجھے کس عذاب میں ڈال دیا ہے۔ جیسے تم میری بیٹے ہو، ایسے ہی بتول اور شاہانہ بھی میری بیٹیاں ہیں۔ دنیا کی تمام مظلوم لڑکیاں میرے جیسی ماؤں کے بطن سے نکلی ہیں۔ تم اُن کا دل کیوں دکھاتے ہو؟ تم نے تو بار بار مجھ سے کہا تھا کہ تم صرف سردار فضل کو عذاب مسلسل میں رکھنا چاہتے ہو، مجھ سے سب کچھ کیا کرتے پھر رہے ہو۔“

وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔ ”اماں! بس کر۔ ایک دو ماہ کی بات ہے۔ پھر دیکھنا، مانگیر پھر سے تمہارا علم دین بن جائے گا۔“

”تب تک تم جو کچھ کر چکے ہو گے، اُس کا حساب کون دے گا؟“

”جیسے میں حساب لے رہا ہوں، ایسے ہی کوئی اور میرا حساب لینے کیلئے کسی نہ کسی دن پہنچ جائے گا۔“

”اگر کہا کرتا تھا۔“ ”تو جو! دیکھنا ایک دن میرا بیٹا بہت بڑا افسر بن کر بستی میں آئے گا۔ ہر دن حیرت بھری نظروں سے اُسے دیکھے گا، یوں جیسے رمضان کے چاند کو نظریں اٹھا کر لگا جاتا ہے۔“

زوجہ کی آنکھوں میں تفاخر اور احساس مسرت بھر جاتا۔ آسمان پر بڑھ کر چمکنے والا اُسی کے سامنے نکلا تھا، چمک کو دیکھنے والا سر کا سائیں تھا۔

سردار فضل اور محمد خان کے دلوں میں کدورتیں اور نفرتیں بڑھتی گئیں۔ ایسے میں بہانے ہاں آپ بنے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ سردار فضل کی پانی کی باری میں مشترکہ کھال محمد خان زمین کی طرف ٹوٹ گیا۔ شگاف پڑ گیا۔ پانی ایک مرتبہ گزر جائے تو پتہ نہیں چلتا کہ پانی اٹھا توڑا گیا تھا۔ سردار کے نوکر نے فوری طور پر سردار کو اطلاع دی۔ وہ بھاگا چلا آیا۔

اُسے شک گزرا کہ محمد خان نے جان بوجھ کر کھال توڑا ہوگا۔ وہ محمد خان کے ڈیرے پر اُسے بلا کر کہنے لگا۔ ”تم نے آج میرا پانی توڑ کر دو گھنٹے ضائع کر دیے ہیں۔ بتا! ایسا کیا تم نے؟“

محمد خان نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ”زبان سنبھال کر بات کر فضل خان! میں نے کبھی ہاتھ حرکت نہیں کی اور نہ ہی میرے رقبے کو چوری کے پانی کی ضرورت ہے۔ تمہارے دل کی غفلت سے کھال ٹوٹ گیا ہوگا۔ میری طرف دالنا بنا کر رو رہے۔ کچھیلی باری پر دو مرتبہ خود بخود ٹوٹ گیا تھا۔ جنگلی چوہوں نے کھال کے بنے میں بل کھود رکھے ہیں۔“

سردار کی موٹی عقل میں یہ توجیہ نہ اُتری۔ دھمکیاں دینے پر اُتر آیا۔ محمد خان بات کو ماننے کے حق میں نہیں تھا۔ خاموشی سے گھر چلا گیا۔ اُس نے اپنے تئیں یہ سوچ لیا کہ ”خیر ہوگی اور فضل خان بکلا جھکتا اپنے گھر چلا جائے گا مگر یہ اُس کی خام خیالی تھی۔“

اگلے دن شام کو وہ دو چار بندوں کے ساتھ اُس کے ڈیرے پر آ گیا۔ چار پانی پر بیٹھ کر ”محمد خان! میں تمہارا رقبہ خریدنا چاہتا ہوں۔ مل جگ چار بندے ملے کر دیں گے۔“

”مگر میں تو اسے بیچنا ہی نہیں چاہتا۔ میرے پاس پچیس ایکڑ ہیں، تمہارے پاس تیس ایکڑ ہیں جبکہ دوسرے رقبہ نور پور میں ہے۔ اپنی ہوس پر قابو پاؤ ورنہ لالچ تمہیں کہیں بے کمال نہیں چھوڑے گا۔“

”میں تمہاری نصیحتیں سننے نہیں، رقبہ خریدنے کیلئے آیا ہوں۔ اگر بیچ دو تو تمہارے حق

وہ کوئی اور نہیں، اُس کا باپ محمد خان تھا۔

باپ کی یہی تصویر اُس کی نظروں میں ثبت رہتی تھی۔ شاید آخری بار دیکھا تھا۔ شاید اُس وقت کا دیکھا یاد رہا تھا جب وہ آخری مرتبہ اپنے بیٹے کو دیوانہ وار چوم کر زمین کی طرف گرا تھا۔ شاید اُس وقت کا دیکھا یادداشت میں نقش ہو گیا تھا جب آخری مرتبہ سکول میں اُسے لینے کیلئے پہنچا تھا۔ باپ کے خیال نے اُسے ماضی کی پر آشوب گہرائیوں میں گھسٹ لیا۔ جس یاد کو کھرچنا چاہتا تھا، وہ پوری انگینی کے ساتھ ابھر کر سامنے آ گئی تھی۔

برسوں پرانے واقعات کو اپنے شعور میں ایک خاص ترتیب دینے لگا۔ کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو، کوئی سقم باقی نہ ہو، کہیں کوئی فائل چرائی نہ گئی ہو۔ کچھ باتیں اُسے یاد تھیں، مگر ماں نے اُن گنت مرتبہ بتلا کر نقش کر دی تھیں۔ وہ دونوں کے امتزاج سے اپنا ماضی کو اُکرنے لگا۔

محمد خان، علم دین یا عالمگیر کا باپ، اپنی پسند کی شادی کرنے کے بعد بھری دنیا میں تھرا گیا تھا۔ اُس کے باپ نے اتنی بڑی حسرت پر اُسے اور اُس کی بیوی کو ایک مربع زمین وے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ بہن کوئی تھی نہیں۔ چھوٹا بھائی، فضل خان، باپ کے ناجائز اور پیار میں حد درجہ شدت پسند اور خود غرض بن چکا تھا۔ اُس نے غلی ذات سے تعلق رکھنے والی بھابی کو قبول نہیں کیا تھا۔ بھابی کو اتنا بڑا قدم اٹھانے پر ایک آنکھ دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ باپ کی شہہ پا کر اُس نے کچھ زیادہ ہی پر پر زے نکال لئے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد اُسے بستی کی نمبرداری مل گئی اور باپ کی کمزور روک ٹوک بھی ختم ہو گئی تو اُس کی شدت پسندی اور مغرور طبیعت میں استرااد پیدا ہو گیا۔ وہ فضل خان سے سردار فضل خان بن گیا۔

محمد خان اور اُس کی بیوی رضیہ عرف رجا اپنے بیٹے علم دین کے ساتھ مطمئن اور پرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ پچیس ایکڑ زرعی اراضی کے عین وسط میں چھوٹا سا گھر واقع تھا جہاں وہ زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مہر کے عین کنارے پر واقع محمد خان کی زرعی اراضی نمبردار فضل خان کی آنکھوں میں کھٹکتی رہتی تھی۔ محمد خان کی زمین سے متعلق ایکڑ رقبہ سردار فضل کی ملکیت تھے۔ اُس نے بار بار خریدنے کی کوشش کی مگر محمد خان اپنی آبائی زمین کو بیچنے پر تیار نہیں تھا۔ اُن پڑھ ہونے کی وجہ سے کاشتکاری کے علاوہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا علم دین پڑھ لکھ کر بڑا سرکاری افسر بنے۔ رقبہ

محمد خان اُس کی دھمکیوں سے قطعاً نہیں گھبرایا تھا۔ بچپن سے اُس کی گرم طبیعت سے بڑی واقف چلا آ رہا تھا۔ خون کا رشتہ سمجھاتا رہتا تھا۔ ”جو بھی ہو، جتنا برا اور ظالم فطرت بھی ہو، تم پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔“

یہ خوش فہمی چند دن قائم رہی۔ ٹوٹی تو سب کچھ بکھر گیا۔ ایک رات گیارہ کے آریب قریب سردار پانچ چھ غنڈوں کے ہمراہ اُس پر حملہ آور ہو گیا۔ دونوں میاں بیوی صحن میں پار پائیاں بچھائے سو رہے تھے۔ علم دین اپنے باپ کی بغل میں گھسا نھنے نھنے خراٹے لے رہا تھا۔ محمد خان اور رجو ہڑبڑا کر اٹھے۔ آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگے۔ چند ساعتوں تک تو دونوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ کیا ہوا ہے؟ جب پتہ چلا تو خون خشک ہو گیا۔ سردار فضل اپنے گروں کے ہمراہ اُن کے سر پر سوار ہو چکا تھا۔

محمد خان نے خود پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا تمیزی ہے فضل خان؟“
فضل خان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں پانچ چھ سالوں سے سمجھانے کی کوشش کرنا چلا آ رہا ہوں مگر تم جیسے بے وقوف سمجھتے نہیں، بھگتے ہیں۔ آج بھگتو۔“

حملہ آوروں نے دونوں کو لاتوں ٹھڈوں پر رکھ لیا۔ محمد خان نے چیخ و پکار مچائی مگر کوئی مدد نہ پہنچی۔ چونکہ گھر بستی سے دو تین میل کے فاصلے پر واقع تھا اور قریب ترین ذریعہ بھی دو تین فرلانگ دور تھا، اس لئے کوئی بھی اُن کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ علم دین شور سن کر جاگا اور پلٹی پلٹی نگاہوں سے اندھیرے میں متحرک ہولوں کو دیکھنے لگا۔ نھنے سے دماغ میں سوائے جتنے چلانے کے کوئی خیال نہیں آیا۔

محمد خان اور رجو آدھ موئے ہو کر صحن کے وسط میں گر پڑے۔ رجو دہائیاں دیتے ہوئے پلاری تھی۔ ”کینو! میرے خان کو کچھ نہ کہو۔ ہم یہ زمین تمہیں سچ دیں گے۔ خدا کے واسطے ہم پر ظلم مت کرو۔“

ظلم امت ساجت سے ختم نہیں ہوتا۔ ظالم کا ہاتھ کاٹنا پڑتا ہے۔ وہاں اتنی سکت کوئی نہیں رکھتا تھا۔ سردار فضل خان کی فرعونیت انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھی۔ وہ اپنے گروں سے غائب ہو کر بولا۔ ”دونوں کو باندھ دو۔“

اُس کا اشارہ رجو اور علم دین کی طرف تھا۔ چند ہی منٹوں میں شیطانی بساط بچھ گئی۔ لڑاکے غنڈوں نے ایک سلاخوں والی کھڑکی سے علم دین کو باندھ دیا۔ دوسری کھڑکی میں

آنکھ زاد — 240
میں بھلا ہوگا۔ اڑ جاؤ گے تو اپنا اور اپنے خاندان کا نقصان کرو گے۔ زمین پر لڑائیاں ہونے لگیں۔
خونیں ہوتی ہیں۔“

محمد خان نے آستین چڑھاتے ہوئے تیوریاں بھی چڑھالیں۔ دنگ لے لے کر بولا۔
”فضل خان! مجھے دھمکیاں مت دو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ باپ اور بھائی سے دست و گریباں ہوؤں اس لئے میں نے ایک مربع لے کر دل کو مطمئن کر لیا۔ اپنا حق چھوڑ کر لوگوں سے دور ہو بیٹھا۔ تم سمجھ رہے ہو کہ میں بزدل ہوں، کمزور ہوں۔ یہ تمہاری خام خرابی ہے۔ میں نے کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں جن کے ٹوٹنے کا مجھے خدشہ ہو۔ جاؤ! جو کرنا ہو، کر لو۔ زمین ماں کے جیسی ہوتی ہے۔ میری ماں بکاؤ نہیں ہے۔“

سردار اُسے کافی دیر تک بیٹھا سمجھاتا رہا۔ بیٹھک کے دروازے کی جھریوں سے زور آنکھ لگا کر دیکھتی رہی۔ اُس کے جانے پر بیٹھک میں گھس آئی۔ گہرائے ہوئے لے لے بولی۔ ”خان! تم ہی ضد چھوڑ دو۔ ہم یہ رقبہ سچ کر کسی اور اچھے سے علاقے میں زمین فروخت لیتے ہیں۔ یہ زمین بھی فصل دیتی ہے۔ وہ زمین بھی فصل دینے لگے گی۔“

”ہونہہ!“ محمد خان نے غصہ بھری نگاہ اُس پر ڈالی۔ ”جو اپنے رقبے کی حفاظت کر سکے، وہ کہیں بھی داہی کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ میں اس کنٹے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ زبانی کلامی دھمکیاں دیتا رہتا ہے، ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں رکھتا۔“

وہ رونے لگ گئی۔ ”خان! ایک ہی پتر ہے ہمارا۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا یا اے بچہ ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ مجھے تو بھری دنیا میں کہیں سے بھی دو وقت کی روٹی نصیب ہوگی۔“

وہ اُسے بانہہ سے پکڑ کر اندر لے گیا۔ سمجھانے لگا کہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں نہ کر راستہ بدل لینے والا احق اور ڈر پوک گنا جاتا ہے۔ رجو کوئی خطرہ مول نہیں لیتا جانتی تھی۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھ رہی تھی کہ پانچ سات سالوں میں سردار کی دھمکیوں سے کچھ نہیں بگڑا تو آگے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ عورت ذات تھی۔ پیاروں کے تحفظ کیلئے زب کے آگے جھوٹی پھیلائی بیٹھی رہتی تھی۔ مزاروں پر چادریں چڑھاتی رہتی تھی۔ ہر چادر پر کواطمینان ہو جاتا تھا کہ جیسے سائیں کے مزار پر چادر تن گئی، ایسے ہی بیٹے اور شوہر کے بدلے کو زمانے کی سرودگر م سے محفوظ رکھنے کیلئے مضبوط چادر تن چکی ہے۔

”ان کی جان بچ جائے گی۔“ سردار نے کہا۔ ”اب باتیں نہ بنا۔ جلدی کر۔ تین.....“ محمد خان نے ارد گرد دیکھا۔ بیوی اور بچے کو دیکھا۔ دل بیٹھ گیا۔ جانتا تھا کہ سردار کیننگی کی اس سطح پر اتار چکا ہے جہاں سے واپسی کی کوئی راہ نہیں نکلتی۔ وہ تینوں کو مارنے کیلئے آیا تھا۔ تینوں کو مار کر ہی جائے گا۔ اُسے بخوبی علم تھا کہ تین بندوں پر مشتمل پورے خاندان کے ہمت کے منہ میں چلے جانے کے بعد وہ اس رقبے کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ بولا۔ ”نفلے! میں جانتا ہوں کہ جو بھی ہو، تم ہم تینوں کو مارنے کیلئے ہاتھ اٹھا چکے ہو۔ میرے رنے کے بعد تم ان دونوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑو گے۔ میں پھر بھی مرنا پسند کروں گا۔ میں بن پاتا کہ بیوی اور بیٹے کو مرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ تم بھی یہ سن لو۔ یہ تم پر قیامت ڈھا دیں گے۔“

سردار بیجا انداز میں ہنسنے لگا۔ ہنسنے ہنسنے بے قابو ہو گیا۔ پھر بولا۔ ”چار.....“ محمد خان نے اپنی کیننگی پر ریوالور کی نال جمانی۔ بیوی کو دیکھا۔ وہ فرط غم سے بے ہوش دکھ کر کی میں جھول رہی تھی۔ بیٹے کو دیکھا جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ بلند واز میں کلمہ پڑھا اور لیلکی پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی وہ لہرا گیا۔ نفلے! کھڑا لگا تار با، پھر ایک طرف کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر کر ترپنے لگا۔

سردار نے اُسے گھسیٹ کر کمرے کے اندر پھینک دیا۔ وہ ابھی تک تڑپ رہا تھا۔ زندگی لائو رتق باقی تھی جو چند منٹوں بعد ختم ہو گئی۔ سردار نے اپنے ہاتھوں سے اُس کی نعش پر تل چڑکا۔ کھڑکی میں بندھے ہوؤں پر تیل چھڑکا۔ حویلی کے بڑے دروازے تک تیل کا بڑکاؤ کرتے ہوئے ساتھیوں سمیت باہر نکل گیا۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر سردار نے چند لمحے سوچا پھر جیب سے مایوس نکال کر دیا سلائی جلاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ”چلو گاڑی میں بیٹھو۔ میں اس گھر کو جہنم بنا کر آتا ہوں۔“

دیا سلائی سے دروازے نے آگ پکڑ لی تھی۔ محمد خان نے آگ بجھ کر مارا تھا۔ جیج جیج کر ماں کو بلارہا تھا۔ ہاتھ مضبوطی سے بندھے ہوئے نہ بھر سے مجبور تھا۔ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے آگ کی لپٹیں کمرے کی طرف بھجوت رہی تھیں۔ وہ بہت ڈر گیا تھا۔ ایسے میں خدا کی مدد آن پہنچی۔ تڑپتے چلتے اُسے اس کا ایک ہاتھ رسی سے نکل آیا۔ اُس نے پھرتی سے دوسرا ہاتھ چھڑایا۔ کمرے کے گرد

رُج کو باندھ دیا۔ دونوں کی طرح بھی اپنے آپ کو چھڑ نہیں سکتے تھے۔ پھر چلتے ہوئے خان کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ بھاگ کر بیٹے اور بیوی کی طرف جانے لگا، جانہ سکا۔ کبھی جانوروں کی طرح اُس پر پل پڑے۔ مار مار کر بھر کس نکال دیا۔

سردار کے اشارے پر ایک آدمی گاڑی سے تیل کا کین اٹھا لایا۔ پورے گھر میں چھڑکنے لگا۔ محمد خان پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی سردار کو، کبھی تیل چھڑکنے والے اسلحے ماچی کو دیکھنے لگا۔ عمر میں بڑا ہونے کے باوجود سردار کے پیروں میں گر گیا۔ عمر بھر کی محنت سے بنی ہوئی جنت میں جہنم کے شعلے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ آئی کوٹا لے کیلئے جھک گیا۔

تیل چھڑکا جا چکا تھا۔ سردار نے محمد خان کو نفرت سے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا دنیا میں کوئی نہیں۔ جو ہیں، وہ آج ہیں، کل نہیں ہوں گے۔ تم پر یہی احسان کر سکتا ہوں کہ تمہیں جان بچانے کا ایک موقع دے دوں۔“

یوں لگتا تھا جیسے محمد خان کا گھٹا ہوا بدن بے جان ہو چکا تھا۔ وہ زمین پر اوندھے سر گر گیا۔ سردار نے اپنے کارندے کے ہاتھ میں تھاما ہوا ریوالور لیا۔ حمیر کھول کر گولیاں نکالنے ہوئے بولا۔ ”اب اس میں صرف دو گولیاں ہیں۔ اگر تم اپنے ہاتھ سے بیوی اور بچے کو گولی مار دو تو تمہاری جان بخشی کی جاسکتی ہے، ورنہ نہیں۔ یہ لو! پکڑو ریوالور اور شروع ہو جاؤ۔ چاہو تو اپنے بیٹے اور بیوی کے سینے میں اُتار دو۔ چاہو تو اپنی کھوپڑی میں اُتار لو۔“

یہ کہہ کر سردار برآمدے کے ستون کے پیچھے ہو گیا۔ کارندوں نے بندوؤں کا زربہ بندھے ہوؤں کی طرف کر دیا۔ سردار کڑک کر بولا۔ ”محمد خان! اٹھالے ریوالور..... ورنہ میں پانچ تک گن کر دونوں کو گولی مار دوں گا۔ پھر تمہاری باری آ جائے گی۔“

چند لمحے توقف کے بعد اونچی آواز میں بولا۔ ”ایک.....“ محمد خان نے سر اٹھایا۔ ریوالور ہاتھ کے قریب زمین پر پڑا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ اکیلا ہوتا تو ان سے ٹکراتا مگر بیٹا اور بیوی اُس کی کمزوری بن گئے تھے۔ اُس نے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”دو.....“ سردار نے خون آشام لہجے میں دوسری تنبیہ کی۔ محمد خان نے ریوالور اٹھا لیا۔ کھڑا ہو کر بولا۔ ”اگر میں دونوں کو گولی مارنے کی بجائے خود کو مار لوں تو.....“

کمال واقع تھا جس پر بے تحاشا گھاس اُگی ہوئی تھی۔ بیٹے کو لے کر کھال میں چھپ گئی۔
 سرگوشیوں میں بیٹے سے اُس کے باپ کے بارے میں تفصیل پوچھنے لگی۔ وہ بتلانے لگا۔
 دل سے ہوک اٹھی۔ ”ہائے میرا خان! تُو اپنے بھائی کے ہاتھوں کس بے بسی سے مرا
 ہوگا۔ تم نے اُس ظالم کی بات مان لی ہوئی، اپنے ہاتھوں سے ہمیں گولی مار دیتے تو کتنا
 اچھا تھا۔“

اُس کا محبوب اُس کے بیٹے اور اُس کے تڑپتے ہوئے وجود کو دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا
 تھا، مر گیا۔ وہ رونے لگی۔ روتے روتے بڑبڑانے لگی۔ ”مجھے اور میرے علم دین کو روتے
 ہوئے دیکھ نہیں سکتا تھا، مرتے ہوئے کیسے دیکھ لیتا۔ ظالمو! تم سے اللہ میرے خان کا
 بدلہ لے اور تمہیں بوند بوند سے ترسا کر مارے اور تمہیں میرے خان کی طرح قبر بھی نصیب
 نہ۔“

روتے روتے آنکھیں خشک ہو گئیں۔ محمد خان کی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ عموماً کہا کرتا
 تھا۔ ”گتا ہے خدا نے میری زندگی مختصر رکھی ہے۔ اگر میں مر جاؤں تو رَجو! علم دینے کو رَج
 کے علم کا شربت پلاتا۔ اتنا کہ اِس کے وجود سے زیادہ ہو کر باہر چھلکنے لگے اور جگ دیکھ کر
 منہ میں انگلیاں ڈال لے۔“

آدھے گھنٹے تک کوئی نہیں پہنچا۔ آگ نے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ اُس نے
 ہمت کی اور بھانے سے گدھار بیڑی جوت لائی۔ بیٹے کو اُس پر بیٹھا کر کچے راستے پر چل
 پڑی۔ یہاں سے بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر کنبھاروں والی بستی میں اُس کی بہن کا گھر واقع
 تھا۔ اُس کے سوا دنیا میں کوئی نہیں تھا جس کے پاس جاتی۔ فجر کی اذان آرہی تھی جب وہ
 کنبھاروں والی بستی میں داخل ہوئی۔ دروازے پر پہنچی۔ دستک دی۔ بہنوئی نے باہر نکل کر
 لُٹا بٹا حالت میں اپنی سالی کو دیکھا تو سشدر رہ گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”خیر تو
 ہے رَجو! محمد خان کہاں ہے؟ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟“

دل ہی دل میں ڈر گیا اور سوچنے لگا۔ ”اِس وقت کوئی ملنے کیلئے نہیں آیا کرتا۔ جو آتا ہے
 دُشمنیت سے نہیں ہوتا۔“

بناہ لینے کیلئے آنے والے کو وقت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ وہ روتے ہوئے اپنے بیٹے
 کو سینے سے لگا کر بھینچنے لگی۔ لکڑی کا چھانک نما دروازہ دھکیل کر کھولتے ہوئے بولا۔ ”رَجو!

آتش زاد۔
 لپٹی ہوئی رسی سے چھنکارا پایا۔ آگ کے شعلوں پر نظریں جمائے ہوئے پیروں کو دیکھ کر
 الجھاؤں سے آزاد کر کر ماں کی طرف بھاگا۔ قریب پہنچ کر توازن برقرار نہ رکھ کر
 پیروں پر گر گیا۔ بیٹا دیوانہ وار آ کر پیروں میں گرا تھا۔ مانتا چونک کر جاگ گئی۔ آنکھیں
 کھول کر ارد گرد دیکھنے لگی۔ آگ پر نظر پڑی تو چیخ پڑی۔ ”علم دینے! اُٹھ جلدی سے۔“
 کھول دے۔“

بیٹا جلدی سے اُٹھا۔ رسی کھولنے لگا۔ گرہ ہاتھ نہ آئی۔ بے بسی سے بولا۔ ”اماں! اگر
 نہیں کھل رہی۔“

ماں چیخنی۔ ”وہ جائے نماز پر چھری پڑی ہوئی ہے۔ بھاگ کر جا اور اُسے اُٹھا۔“
 بیٹا چھری اُٹھا لایا۔ ماں بتلاتی گئی۔ بیٹا رسیاں کاٹا گیا۔ جب برآمدے میں لگی ہوئی
 چک نے آگ پکڑ لی، وہ اپنے بیٹے کو بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے برآمدے سے باہر نکل
 گئی۔ دونوں بُری طرح کھائیں رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پھپھروں میں ہوا کی جگہ
 دھواں بھر گیا ہو۔ رَجو کھلے صحن میں پہنچ کر سانس لینے کیلئے رُکی۔ بیٹے سے پوچھا۔ ”تمہارا بابا
 کہاں ہے؟“

آگ نے باپ بھلا دیا تھا۔ یاد آنے پر رونے لگا۔ روتے روتے بتلانے لگا۔ ”چاچے
 نے اُبا کو پستول دیا اور کہا کہ ہم دونوں کو گولی مار دے۔ اُبا نے ہمیں گولی نہیں ماری، اپنے
 یہاں رکھ کر کھٹاں کر دی۔“ وہ روتے ہوئے انگلی سے کپٹنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
 بولا۔ ”اُبا لم لیٹ ہو گیا۔ چاچے نے اُبا کو ٹانگوں سے پکڑا اور گھسیٹ کر کمرے میں
 پھینک دیا۔“

رَجو نے دیوانہ وار کمرے کی طرف دیکھا۔ شعلوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تو ڈسے
 سی گئی۔ دل کو گھونسا لگا، سر کا تاج گر گیا تھا۔ قدم گھسیٹتے ہوئے برآمدے تک آئی۔ آگ کی
 تپش آگے نہیں بڑھنے دے رہی تھی۔ ہر طرف دھواں پھیل گیا تھا۔ کھاستی ہوئی پلٹ آئی۔
 بیٹے کو سینے سے لگا کر بھیج کر زمین پر بیٹھ گئی۔ ایسے میں مٹی کے تیل کی بوتلتوں میں ٹھس گئی۔
 پتہ چلا کہ دونوں کے کپڑے تیل سے تر ہو چکے ہیں۔

بیٹے کو دیوار پر چڑھا کر بولی۔ ”دوسری طرف کو دو جاؤ۔“
 وہ کود گیا۔ وہ بھی دیوار کو دکر باہر آ گئی۔ عقبی دیوار سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک

پہنچی۔ وہ کہاروں کی بستی کی خبر لینے لگا۔

اُس کے ہرکارے اطراف میں دکھائی دیے تو رَجو کے بہنوئی کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے اپنی سالی سے کہا۔ ”رَجو! میں نے تمہاری گدھار بیڑی فروخت کر دی ہے۔ رقم تمہاری بہن کے پاس ہے، لے لو۔ زمین کے ساتھ ساتھ مال و نگر پر بھی سردار فضل نے قبضہ جمالیا ہے۔ تم خالی ہاتھ ہو۔ اپنا آپ سنبھال لو۔ رات کو میں تمہیں چھپا کر شہر لے جاؤں گا۔ وہاں سے کہیں دور نکل جانا ورنہ تمہاری اور تمہارے علم دینے کی خیر نہیں۔ سردار کے کتے تمہاری بو سونگھتے پھرتے ہیں۔“

وہ دلی گئی۔ علم دین پر کوئی آئینہ نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔ راج کرنے والی کورات کی علت نمایاں میں چوروں کی طرح گاؤں سے نکل کر شہر جانا پڑا جہاں لاہور جانے والی بس پر سوار کر کے اُس کا بہنوئی واپس پلٹ گیا۔ جاتے ہوئے ہاتھ لہراتا ہوا بڑبڑایا۔ ”جا رَجو! تیرا رب راکھا۔ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا، مجھے معاف کر دینا۔“

بس چل پڑی تو وہ علم دین کے سوا پوری دنیا کو بھول گئی۔ وہ کون تھی؟ اُس کا کون کون تھا؟ کس نے کیا کیا؟ وہ سب کچھ فراموش کرتے ہوئے علم دین پر آس کا چراغ روشن کئے لاہور پہنچ گئی۔ اجنبی شہر میں کوئی بھی اپنا نہیں تھا۔ کوئی واقف کار نہیں تھا۔ ایسے میں ایک بڑا فضل مل گیا۔ اُس نے پوچھا۔ ”بیٹی! تمہارے ساتھ سفر کرتا آیا ہوں۔ گاڑی میں بیٹھنے سے لے کر اترنے تک تمہارے آنسو خشک نہیں ہوئے۔ کیا بات ہے؟“

لاہور کے ہجوم میں اپنی تنہائی کو دیکھ کر وہ لرزیدہ تھی۔ غمگسار ملا تو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اُسے اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔ وہ بھلا مانس شخص اُسے اپنے ساتھ اپنے چھوٹے سے گھر میں لے گیا۔ اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ ”دیکھ فاطمہ! آج قدرت نے ہم غریبوں کے گھر کو بھی پناہ مانگنے والا اتار دیا ہے۔ لے ماں بیٹے کو سنبھال لے۔“

بوڑھا کو جوان تھا۔ روز صبح تا نگہ جوڑ کر نکل جاتا۔ شام کو چند روپے ڈب میں ڈال کر لاتا جسے دو خاندان بانٹ کر دو وقت کی روٹی حلق میں اتار لیتے۔ ایک دو ماہ ایسے ہی گزر گئے۔ ایک دن رَجو نے بوڑھے سے کہا۔ ”چاچا! اس طرح کب تک گزارا چلے گا۔ تم اپنے پتر کو پڑھانا چاہتی ہوں۔ میں کوئی ایسا کام کرتا چاہتی ہوں جس سے کچھ رقم مل جائے۔ میرا بیٹا پڑھ سکے۔“

آتش زاد — 246

اندرا آجا۔ آرام سے بیٹھ کر بتا۔“

گدھار بیڑی صحن میں پہنچی تو تمام گھروالے جاگ گئے۔ اُس کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ بہن نے پوچھا۔ ”باجی رَجو! یہ تو اس طرح یہاں کیوں آئی ہے؟ بھائی محمد خان کدھر ہے؟“ وہ بین کرنے لگی۔ سینے پر دو تھڑ مارتے ہوئے چیختی لگی۔ ”ہائے! میرا خان مر گیا۔ ہائے میرے علم دینے کا شیر جیسا باپ مر گیا!“

آن کی آن میں گھر میں کہرام مچ گیا۔ صبح ہونے تک پوری بستی کو علم ہو گیا۔ وہ تھا نے جا کر سردار فضل خان کی رپورٹ درج کرانا چاہتی تھی مگر بہن نے سمجھایا۔ ”تم جانتی ہو کہ وہ کتنا ظالم اور کمینہ بندہ ہے۔ جو محمد خان کو مار سکتا ہے، اُس کے سامنے تم کیا ہو؟ تمہارا علم دین کیا ہے؟ ہم کیا ہیں؟..... وہ تم دونوں کو تھانے میں پہنچنے سے پہلے قتل کر دے گا۔ تم اپنے پتر کی جان بچاؤ اور تھانے کچہری کے چکر میں مت پڑو۔ خدا ایسے ظالموں کا حساب خود کرتا ہے۔ تم بھی اپنا مقدمہ خدا کی عدالت میں دائر کر دو۔“

وہ ٹھیک کہتی تھی۔ رَجو نے چند دن تک سوچا۔ کبھی سوچتی کہ واپس لوٹ جائے۔ کبھی سوچتی کہ اتنی دور چلی جائے جہاں سے اُس کی خبر بھی سردار فضل تک نہ پہنچے۔ بہنوئی نے اُسے بتلایا کہ سردار فضل خان نے زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ محمد خان کی جلی ہوئی لاش کو نکال کر دفن کر دیا گیا ہے۔“

وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں اُس کے اور اُس کے بیٹے کے ٹا جانے کی خبر اُس فرعون تک نہ پہنچ جائے۔ اُس نے اپنی بہن سے بات کی تو وہ بولی۔ ”بہن ہو، بہن کو گھر سے نکالتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے مگر کیا کروں؟ تم بڑے گھر میں بیانی گئی تھیں، اُجڑ کر نکلیں۔ میری اوقات کیا ہے؟..... میں تو کہاروں کے چھوٹے سے گھر کی بو ہوں۔ تمہاری طرف بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو روکنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ سچ کہتی ہوں کہیں دور نکل جاؤ۔ اتنی دور، جہاں سے مجھ تک بھی تمہاری کوئی خبر نہ پہنچے۔“

موت چھپائے نہیں چھپتی۔ زندگی بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جتنا چھپایا جائے، اتنی ہی ظاہر ہوتی ہے۔ سردار کو اُس کے زندہ بچ جانے کی خبر ملی تو وہ لوٹ لوٹ ہو کر رہ گیا۔ ہاتھی نکل گیا تھا، دُمرہ گئی تھی۔ جانتا تھا کہ یہ دُمرہ اُس کی گردن کو کسی نہ کسی دن ناپنے کیلئے آنا

میں شامل تھا۔ اس شمولیت نے دو طلباء کی جان فگلی اور وہ دوسرے قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر جیل پہنچ گیا۔

رجو کا علم دین گھر سے پڑھنے کیلئے کالج گیا تھا، قاتل بن کر جیل پہنچ گیا تو وہ ڈھسے گئی۔ دونوں ہاتھ اوپر کی جانب دراز کرتے ہوئے نالہ کنال ہوئی۔ ”اے پروردگار! مجھ سے سر کی چادر چھین کر بیٹے سے گود آباد کرنے والے! ایسے ہی اگر دے کر لینا تھا تو دیا ہی کیوں تھا؟ تو جانتا ہے کہ میں اُسے علم دین بنانے کیلئے اپنی جوانی کو تچ چکی ہوں۔ اُس کیلئے دنیا جہان سے بے خبر ہو چکی ہوں۔ تمہیں مجھ پر پھر بھی ذرہ بھر ترس نہیں آیا؟“

اُس نے پس انداز کی ہوئی رقم بیٹے کی رہائی کیلئے خرچ کر دی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اتنی رقم سے چوری چکاری کا کیس نہیں نیتا، قتل کا کیس کیسے جان چھوڑتا۔ کوئی پرسان حال نہیں رہا۔ دامن خالی ہو گیا تو عدالت نے علم دین کو ثابت شدہ دوسرے قتل کی پاداش میں سزائے موت سنائی۔

اُس کی سزا کا سن کر ماں کی مامتا بیٹے کے لٹکنے سے قبل ہی سولی پر لٹک گئی۔ رات کو روتے روتے سو گئی تھی۔ ادھ رات کو خواب میں بیٹے کو سولی پر لٹکتے ہوئے دیکھ کر جان ہار گئی۔ عمر بھر مامتا کا تھکا ہارا غمزدہ دل بیٹے کی سلامتی کیلئے لرزتے ڈرتے تھک گیا تھا۔ سلامتی خطرے میں پڑی تو دل کا جان لیوا دورہ پڑ گیا۔

اُسے ماں کی موت کی خبر ملی تو سلاخوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر رویا۔ اپنی بدبختی اور بے راہ روی کو جی بھر کر کوسا مگر باپ کی طرح ماں کو واپس لانے پر قدرت حاصل نہ کر سکا۔ جانے والے کبھی کوٹھے نہیں مگر ماں چند دنوں کے بعد ایک رات کو لوٹ آئی۔ اُس کی کال کوٹھڑی کے ساتھ واٹ کے ریتان زدہ بلب میں سمٹ آئی۔ کوسے ہوئے بولی۔ ”اے ہمارا! تو نے اتنا مل ہی نہ پایا اپنی ماں کی قربانیوں کا۔ تجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میرے تمہیں جانے کیلئے کیا کچھ داؤ پر لگایا؟ اگر پیٹہ ہوتا کہ تم نے ایسے حرام موت مرنا تھا تو تیرے خود کشی کرنے والے باپ سے کہہ دیتی، وہ تجھے اپنے ہاتھ سے مار دیتا۔“

وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ اُس کے پاس بولنے کیلئے کچھ رہا ہی نہیں تھا۔

تین سال جیل میں قید رہا۔ اس دوران میں اُس کا واسطہ بہت سے ہنرمند لوگوں سے رہا جنہوں نے اُس کے ہنر کو بھلا بخشی۔ جب اُس کے بلیک وارنٹ جاری ہوئے، تب تک

بوڑھا اچھنبھے سے بولا۔ ”تمہیں بیٹی سمجھتا ہوں۔ بیٹی سے کچھ چھپانا کفر ہوتا ہے۔ اس طرح بیٹی باپ سے کچھ چھپائے تو اللہ ناراض ہو جاتا ہے۔ سچے دل سے بول! تمہیں یہاں کوئی تکلیف پہنچی ہے؟ کسی نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟“

وہ بولی۔ ”نہیں چاچا! ایسی کوئی بات نہیں مگر.....“

بوڑھا سر دست نہیں مانا۔ آنے والے چند دنوں میں اُس کی ضد پر ہتھیار ڈالنے ہوئے بولا۔ ”اچھا پتر! میں کچھ کرتا ہوں۔ ایک گارمنٹس فیکٹری میں میرا یار کام کرتا ہے۔ اُس فیکٹری میں بہت سی عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ میں اپنے یار سے کہہ دیتا ہوں، وہ تمہیں وہاں کام دلوا دے گا۔ سلائی کڑھائی کا کام جانتی ہو نا؟“

وہ بولی۔ ”تھوڑا بہت جانتی ہوں۔ چند دن کام کروں گی تو سب پتہ چل جائے گا۔“

جب کام کرنے لگی تو بہت کچھ کا پتہ چل گیا۔ بیٹے کو سکول میں داخلہ دلوا کر اپنے کام میں جُت گئی۔ جانتی تھی کہ ابھی وہ چھوٹی کلاسوں میں پڑھتا ہے، خرچ کم ہوتا ہے۔ جوں جوں کلاسیں آگے بڑھتی جائیں گی، اخراجات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ کمائی میں سے کچھ خرچ کر لیتی، کچھ بچا لیتی۔ چاچا کے انتقال پر وہ اُس کے بڑے بیٹے کے گھر میں منتقل ہو گئی۔ وہ بھی کوچوان تھا۔ باپ کی طرح غریب پرور تھا۔ اکثر کہا کرتا تھا کہ غریبوں کے در کو غریب ہی سمجھنا بند کر دے تو پھر دنیا، دنیا نہ رہے، جہنم کدہ بن کر سب کچھ جلادے۔

بیٹے نے میٹرک اچھے نمبروں میں پاس کر لیا تو اُس نے پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ دلوا دیا۔ اُسے اور گھر میں کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ پولی ٹیکنیکل کالج کا ماحول کتنا خراب ہے۔ دو سال پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ کچھ سمسٹر پاس کئے، کچھ میں فیل ہوا۔ قد کاٹھ اچھا نکالا تھا، ہر آنکھ میں کھٹکنے لگا۔ بچپن سے شخصیت کا حصہ بننے والی محرومیوں نے اُسے جوالہ کبھی بنا دیا تھا۔ کالج کے طلباء سیاسی نظریات پر لائبر کا شکار تھے۔ کوئی کسی کا آلہ کار تھا، کوئی کسی کا۔ ایسے میں اُس پر بھی کالج کے باہر بیٹھے ہوئے مفاد پرست بڑوں کی نگاہ پڑ گئی۔ اس نگاہ التفات سے دل و دماغ کی دنیا الٹ پلٹ ہو گئی۔ وہ جو بننے کیلئے کالج میں آیا تھا، وہ نہ بن سکا، ایک سال میں کالج کی سیاست کا اہم مہرہ بن گیا۔

تھرڈ اَر میں پہنچا تو تین سمسٹر شارٹ ہو چکے تھے۔ اُسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ہوٹل میں طلباء کے دونوں بڑے گروہوں میں فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ وہ بھی اس آگ کے کھیل

ہاکاروں نے گیت بلا چون و چرا کھول دیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ جیلر کے ڈرائنگ روم میں حیران و پریشان بیٹھا اس کھیل کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا وہ حصہ بن کر یہاں پہنچا تھا۔ سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

جب سردار فضل خان ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ اُسے دیکھ کر چونک گیا۔ ہاتھ ملا کر دونوں آنے سامنے بیٹھ گئے۔ جیلر کے آنے پر سردار نے اُسے کہا۔ ”یہ کیسے ممکن ہوا؟“

وہ بولا۔ ”قسمت ساتھ دے گئی۔ آج ہی چند قیدیوں نے جیل توڑی اور فرار ہو گئے۔ سرکاری کھاتے میں جہاں وہ گئے، وہیں علم دین بھی چلا گیا۔ مجھے اسے نکال کر لانے کا موقع مل گیا، لے آیا۔ اب تم اسے وصول کر سکتے ہو۔“

اُسے تب پتہ چلا کہ وہ ایک بریف کیس کے عوض فروخت ہو چکا تھا۔ خریدنے والے سے آشنائیں تھا۔ دونوں کارپورج میں آئے۔ سردار کی نئی فورویل جیب میں بیٹھ کر اُسے آزادی کا یقین ہوا۔ وہ آزاد تھا۔ اپنے محسن کی طرف دیکھ رہا تھا اور جی ہی جی میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا جس نے اُس کی سن لی تھی۔

رخصت ہوتے ہوئے جیلر نے کہا۔ ”سردار صاحب! بڑی سرکار تک میرا سلام پہنچا دیجئے گا اور انہیں بتلا دیجئے گا کہ میں نے اُن کے کہنے پر کس طرح جان پر کھیل کر بچے کو جیل سے باہر نکالا ہے۔“

سردار نے سر ہلا کر اُس کا شکریہ ادا کیا۔ گاڑی لاہور سے نکلی تو اُس نے پوچھا۔ ”آپ نے مجھے کیوں جیل سے نکلوایا ہے حالانکہ میں آپ کیلئے اجنبی ہوں؟“

سردار نے لا پرواہی سے کہا۔ ”مجھے تم جیسے جی دار آدمی کی ضرورت ہے۔ میرا ایک شیر مارا گیا ہے۔ اُس کی جگہ پُر کرنے کیلئے دوسرے شیر کی تلاش میں تم تک پہنچا ہوں۔ پرنٹنڈنٹ نے مجھے بتلایا تھا کہ تم بڑے جی دار اور وفادار بندے ہو۔“

”سوچنے لگا۔ سردار کا کہنا کس حد تک سچ تھا؟ اس بارے میں وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ سردار اُسے لے کر اپنی کوٹھی میں آیا۔ وہاں چند دن مقیم رہا۔ یہاں اُسے علم دین سے کام لے کر بتا دیا گیا۔ اُس کے کاغذات تیار کرائے گئے۔ اب وہ آزادانہ طور پر پورے ملک میں گھوم پھر سکتا تھا۔ سردار نے ہر کام فول پروف انداز میں سرانجام دیا تھا۔ یہیں اُسے پتہ چلا کہ کماؤ سردار فضل خان تھا جس نے اُس کے باپ کو اُس کی نگاہوں کے سامنے خود کشی پر

وہ عام اور جذباتی انسان نہیں رہا تھا بلکہ جیل کی بھٹی میں جل کر کندن ہو گیا تھا۔ پہلے ماہ کی زنجیر پاؤں میں بندھی رہتی تھی، اب پاؤں ننگے ہو چکے تھے۔ برہنہ پائی میں دوڑنے کی رفتار دگنی ہو جاتی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار جیل سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے تو اپنے باپ کے قاتل کو تلاش کرے اور اُسے بھی ابدی نیند سلا دے۔ اُس کے بعد خواہ اُسے چاہی گھاٹ تک پہنچا کیوں نہ دیا جائے۔

پھر قسمت کی دیوی اُس پر مہربان ہو گئی۔ وہ جو سوچتا تھا، وہ ہونے چلا تھا۔ ایک دن انڈر ورلڈ کے متفید کل پرزوں نے جیل توڑنے کا پروگرام بنالیا۔ وہ علیحدہ بیرک میں تھے۔ علم دین کو پتہ نہ چلا ورنہ اُن کے پروگرام میں شامل ہو جاتا۔ ایک رات جیل توڑ دی گئی۔ پانچ چھ قیدی بھاگ گئے۔ شہر بھر میں ہا ہا کار مچ گئی۔ نیلی بتیاں چاروں اطراف میں کیڑے مکوڑوں کی طرح پھیل گئیں۔ وہ جیل میں مچ جانے والی غیر معمولی ہنگامہ زدگیاں کے پیچھے بیٹھ کر بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ ایک سنتری نے پوچھنے پر اُسے بتا دیا کہ چند قیدی جیل توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اوپر منہ کر کے فریاد کرنے لگا۔ ”اے پیدا کرنے والے! اُن پانچوں کے ساتھ میرا نام بھی لکھ دینا تو تمہاری خدائی میں کیا بالکل مچ جاتی!“

قسمت اُس پر ہنسنے لگی۔ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”فکر نہ کر۔ بھاگنے والوں کی کچھ ہی دنوں کے بعد یہاں نشیں پہنچ جائیں گی۔ تو زندہ سلامت جیل سے باہر پہنچ جائے گا۔“

جیلر اُس کے قریب آیا۔ آہنی گیٹ کا بڑا سائیکل کھولتے ہوئے اُسے باہر آنے کا اشارہ کرنے لگا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے باہر نکل آیا۔ جیلر نے دروازہ بند کیا اور اُس کا بازو پکڑ لیا۔ برابر چلتے ہوئے دونوں دفتر میں آئے۔ اُس نے پوچھا۔ ”صاحب جی! میں کچھ سمجھا نہیں۔“ وہ ایک الماری سے کیڑے نکالتے ہوئے بولا۔ ”سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ جلدی کرو اور یہ کیڑے پکڑے پکڑے لو۔“

اُس نے کیڑے پکڑے۔ پرنٹنڈنٹ نے اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے پورج میں آیا۔ اُسے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”گاڑی چلاؤ۔ ہوئے آن کر دو۔“

اُس نے بلا سوچے سمجھے قہقہہ کی۔ گاڑی جیل کے گیٹ پر پہنچی۔ پرنٹنڈنٹ کو دیکھ کر

”ایک بات یاد آگئی تھی۔“ وہ نظریں نیچے کئے ہوئے بولی۔

وہ خاموشی سے اُس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ چند لمحے ناخنوں سے کھینچتی رہی۔ پھر سر اٹھا کر اُس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اپنا دایاں ہاتھ پیٹ پر پھرتے ہوئے آنکھوں سے بولی۔ ”اِس کم بخت کا کیا کرتا ہے جس نے گناہ کو اپنے دامن میں جگہ دے رکھی ہے؟“

وہ بولا۔ ”اِس کا بھی کچھ کر لیتے ہیں۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم نے پریشان نہیں ہونا۔ میں سنبال لوں گا۔ پھر؟“

اُس کا چہرہ فکر و تردد اور اندامت کا مظہر بنا ہوا تھا۔ آہستگی سے بولی۔ ”مجھے بڑی شرم آتی ہے۔“

عالمگیر نے ایک عجیب سی تجویز پیش کی۔ ”اگر ہم دونوں شادی کر لیں تو تم شرم سے چمک اُپا لو گی۔ ہم کسی بھی ہسپتال میں جا کر اِبارشن کروا سکتے ہیں۔“

وہ چونک پڑی۔ سوچنے لگی۔ عالمگیر کی بات دل کو لگتی تھی۔ باپ سے بھی ڈر لگتا تھا۔ خیال آیا۔ پاپا کو جب میری پامالی اور اُس کے نتیجے کا علم ہوا تو وہ مجھے زندہ زمین میں گاڑ دے گا۔ اُس کی اجازت کے بغیر شادی کروں گی تو وہ زیادہ سے زیادہ برا بھلا کہہ کر کچھ عرصہ کیلئے بلانا ترک کر دے گا۔ پھر مان بھی جائے گا۔

بولی۔ ”تمہاری بات ٹھیک ہے مگر پاپا سے ڈر لگتا ہے۔ کوئی اور طریقہ سوچو۔“

وہ لا پرواہی سے بولا۔ ”ڈاکٹر کا منہ نوٹوں سے بند کر دیا جائے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، وہ کتنے پیسے مانگے گی؟“

”یہی کوئی بیس تیس ہزار روپے اور کیا!“

”یہ تو کوئی بڑی رقم نہیں ہے مگر.....“

”مگر کیا؟“

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”اگر وقت پر یہ سب کچھ نہیں کیا گیا تو پھر زیادہ ڈراؤنی صورت حال درپیش ہوگی۔“ عالمگیر نے کہا۔

”میں پاپا سے شادی کی اجازت مانگوں؟“

مجبور کیا تھا۔ یہی وہ انسان تھا جس نے اُسے اور اُس کی ماں کو کھڑکیوں کی سلاخوں سے باندھ کر تیل چھڑکا تھا۔

ماں بتلاتی تھی کہ وہ نمبردار تھا۔ تیس چوبیس سالوں میں وہ نمبردار سے ترقی پا کر اسمبلی ممبر بن کر فرعون بن چکا تھا۔ گاؤں سے شہر چلا آیا تھا۔ ماں اُس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں اتنا محتاط رہتی تھی کہ اُسے بھول کر بھی گاؤں، سردار فضل اور رشتے داروں کی تفصیلات سے آگاہ نہیں کرتی تھی۔ اُس نے تو علم دین کو یہ تک نہیں بتلایا تھا کہ سردار فضل خان اُس کا حقیقی چچا ہے۔ اُسے بڑا تعجب ہوتا تھا جب وہ سردار کو دیکھتا۔ چھوٹا بھائی پچیس ایکڑ کیلئے کس دل سے بڑے بھائی اور اُس کے خاندان پر موت مسلط کر سکتا ہے۔ اگر وہ یعنی شاہد نہ ہوتا تو شاید کبھی بھی سردار کے ہاتھوں باپ کے قتل کے واقعے کو دل سے تسلیم نہ کرتا۔

سردار نے چند ہی دنوں میں اُسے اپنا معتمد خاص بنا لیا۔ اُس کے پاس سردار کے بعد سب سے زیادہ اختیارات تھے۔ وہ جو بھی کر دیتا، سردار رد نہیں کرتا تھا۔ دل ہی دل میں شکر ادا کرتا تھا کہ اُس نے بغیر سوچے سمجھے سردار پر ہاتھ نہیں اٹھایا ورنہ بے طرح مسل دیا جاتا۔ سردار بہت طاقتور تھا۔ عالمگیر نے اُسے زمین دکھانے کے لئے اُس نے تین سال شانہ روز محنت کی تھی۔ ایک طرف اُس کا اعتماد حاصل کرنے کیلئے آگ کا دریا عبور کرنا گیا، دوسری طرف اُس کی ٹانگ کھینچنے کیلئے بازوؤں میں طاقت بھرتا رہا۔ آج وہ اِس قابل ہو گیا تھا کہ سردار کی نیند حرام کرنے لگا تھا۔

سردار کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اُس کی حقیقت سے آگاہ نہیں تھا ورنہ سانپ کا سر کچلنے میں کوئی دیر نہ لگاتا۔ آستین میں پلنے والے سانپ نے بازو اور گردن کا ناپ لے لیا تھا۔



شانی کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ چہرہ بھی متورم دکھائی دیتا تھا۔ عالمگیر نے دریافت کیا۔ ”کیا پھر رات بھر جاگتی رہی ہو؟“

اُس نے کمال معصومیت سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

وہ مسکرایا۔ ”کیوں؟“

جاسکتا ہے۔ ویسے بھی فرد واحد کی بات اور ہے، کسی منظم تنظیم کا چلن اور ہے۔ ایک کے مرنے کے بعد دوسرا تمام امور کو سنبھال لیتا ہے۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”تم اُن کی بات مان لو۔“

”مان لینے سے میری بنی بنائی خاک میں مل جائے گی۔“

”نہیں مانو گے تو سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔“ عالمگیر نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ ”تم انہیں چکر دو۔ سیاست کو خیر باد کہہ دو۔ اعلان کردو۔ سیٹ پر ضمنی انتخابات ہوں گے۔ اُس وقت تم اپنا کوئی بندہ کھڑا کر دینا۔ یوں اُن کی فرمائش بھی پوری ہو جائے گی، تمہارے اختیارات بھی بالواسطہ طور پر تمہارے پاس رہیں گے۔“

سردار نے کہا۔ ”میرا بیٹا تو کوئی ہے نہیں جسے میں کھڑا کروں تاکہ میری طاقت میرے گھر میں ہی رہے۔“

دو بولا۔ ”شانی بی بی ایکشن لڑ سکتی ہے۔ اگر تم اُسے سیاست میں نہیں لانا چاہتے تو اُس کی شادی کر کے اپنے داماد کو اُس نشست کا امیدوار بنا دینا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”کیوں؟“

”اُس کی شادی میں ابھی بہت دیر ہے۔“ سردار نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے اب بھی کوئی دکھائی نہیں دیتا جس کے ساتھ اُس کی شادی کروں۔ اسی لئے تو میں نے اُسے ٹریک سر کے انتخاب کی مکمل آزادی دے رکھی ہے۔“

”سردار! تم ریزائن دو گے تو فوری طور پر ایکشن کا انعقاد عمل پذیر نہیں ہوگا۔ تین چار ماہ ڈکڑا کر تم لگ ہی جائیں گے۔ اتنی دیر میں کچھ نہ کچھ کیا جاسکتا ہے۔“ عالمگیر نے تسلی دی۔

سردار رنجِ صدی پر محیط پُر تشدد محنت کے ثمر سے الگ ہونے پر راضی ہو گیا۔ بولا۔

”یہاں رفیع اللہ نے بھی خاصا پریشان کر رکھا ہے۔ بشیر خان اور فقیر محمد کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ دونوں دریا پار کر کے اُس کی دسترس سے نکل گئے ہیں مگر کب تک؟ ایک نہ ایک تو اُس کے ہاتھ لگ جائیں گے۔ اُن کی عدم موجودگی میں رخ میں خود کو بے دست و پا ڈال کر نہ لگا ہوں۔“

”پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ عالمگیر نے ہنس کر کہا۔ ”وہ تمہیں کچا چاؤ اُلے گا۔“

”مگر مجھے یقین ہے کہ جب میں انہیں بتاؤں گی کہ میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں تو وہ بغیر کسی خفگی کے مان جائیں گے۔“

”اِس یقین کی وجہ؟“

”تم!“ وہ اُس کے سینے پر شہادت کی انگلی رکھتے ہوئے بولی۔

”میں کیوں؟“

”وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں۔“

”ہونہہ!“ وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ”پیار کرنا اور ہے، پیاری چیز سونپنا اور ہے۔ تم اِس غلط فہمی کو دل سے نکال دو۔“

”تو ٹھیک ہے۔ جیسا کہو گے، میں ویسا ہی کروں گی۔“ شانی نے کندھے اُچکا کر ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”گاڑی آجائے، پھر بازار کی طرف نکلیں گے۔ آج شام کا کھانا باہر کھائیں گے۔ پیٹ بھرے گا تو عقل کی رگیں کھل کر راستہ دکھادیں گی۔“ عالمگیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر سردار سے رابطہ کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ ”سردار! کیا انڈر ورلڈ کے ایجنٹ نے تمہارے ساتھ رابطہ کیا ہے؟“

سردار کی آواز سنائی دی۔ ”ہاں! تھرڈ مین کہہ رہا تھا کہ داؤد سبحانی مجھے ہٹا کر کسی اور کو سامنے لانا چاہتا ہے۔ اُس نے مطالبہ میرے سامنے رکھا ہے کہ میں سیاست سے ریٹائرمنٹ لے لوں۔“

”اوہ نو!“ عالمگیر نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔ تم نے اُسے ردیوں پیسوں کی پیشکش کرنا تھی۔ نہیں کی؟“

سردار نے کہا۔ ”مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ تم کہتے ہو تو یہ بھی کوشش کر دیکھتا ہوں۔ کیا تم اُن لوگوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے؟ انہیں اُن کے ارادوں سے کسی طرح باز نہیں رکھ سکتے؟“

وہ بے بسی سے بولا۔ ”سردار! ہمارے علاقے میں اور یہاں کے ماحول میں بہت فرق ہے۔ ویسے بھی داؤد سبحانی تین چار سالوں سے چھپا ہوا ہے۔ خدا جانے ملک میں ہے بھی یا نہیں۔ اُس کا نام اور حکم چلتا ہے۔ جو دکھائی ہی نہیں دیتا ہو، اُس سے مقابلہ کس طرح کیا

وہ گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ تمہارا ڈرائیور نے کیلئے ضروری ہے کہ یہاں شاپنگ کی جائے۔ کم آن!“

دہائی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”نہیں پلیز! کہیں اور چلتے ہیں۔“

اُس نے دروازہ کھول کر اُسے ہاتھ سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے بولا۔ ”کہاناں پیاری! یہیں شاپنگ کی جائے گی۔“

وہ ڈرتے ڈرتے اُتری۔ اُس سے چٹ کر چلنے لگی۔ وہ مسکرایا۔ ”دل چاہتا ہے کہ تم ایسے ہی عمر بھر پہلو سے لگ کر چلتی رہو۔“

وہ جھپک پڑے ہوئی۔ پھر قریب ہو آئی۔ میڑھیاں چڑھتے ہوئے ارد گرد بغور دیکھ رہی تھی۔ اُسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ ہم کس جگہ پر پھنسا تھا۔ بھگدڑ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک

دکان سے نکل کر دوسری میں گھستے ہوئے رُک گئی۔ مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ”کیا ہوا؟“

”تم بہت اچھے ہو۔“

”اور تم؟“

”میں تو بس یونہی سی ہوں۔ تمہارے ساتھ چلتی رہوں تو خوفزدہ نہیں ہوتی۔ تم اوجھل ہو جاؤ تو ہر چیز سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ کیا محبت ایسی ہی ہوتی ہے؟“ اُسے شاید لوگوں کی کوئی

براہ نہیں رہی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر بولی۔ ”میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔ خدا سے دعا کرتی ہوں کہ مجھے بس اتنی ہی زندگی دینا، جو تمہارے ساتھ گزر جائے۔“

وہ بولا۔ ”یہ باتیں گھر میں بھی ہو سکتی ہیں۔ چلو شاپنگ کرو۔“

وہ بولی۔ ”کیا نال رہے ہو؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں ٹلنے یا ٹالنے والا نہیں ہوں۔“

والہانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دکان میں گھس گئی۔ باہر نکلے۔ میڑھیاں اُتر رہے تھے جب شانی کے فون کا بزر بجنے لگا۔ سکرین کو دیکھ کر بولی۔ ”پاپا فون کر رہے ہیں۔“

فون اُن کے کان سے لگایا۔ بولی۔ ”ہائے پاپا! کیسے ہیں آپ؟ ماما کیسی ہیں؟“

”سہری طرف سے باپ کی آواز سنتی رہی۔ ہنستے ہوئے بولی۔ ”ایک بات بتاؤں پاپا!“

ایسے میں عالمگیر نے دوسرے فون پر سردار سے کال ملانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سردار نے کہا۔ ”عالمگیر! تھرڈ مین مجھے کال کر رہا ہے۔ تم فون بند کرو۔ اُس سے بات چیت کے بعد میں تم سے رابطہ کرتا ہوں۔“

عالمگیر نے ایک فون رکھ دیا۔ دوسرا اٹھالیا۔ بولا۔ ”ہیلو سردار فضل! میں تھرڈ مین بول رہا ہوں۔ تم نے کیا فیصلہ کیا؟“

”میں نے تمہاری بات ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آنے والے چند دنوں میں ہی قیامت تک میرا استعفیٰ پہنچ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں سیٹھ سبحانی کو مطلع کر دیتا ہوں۔ تم زندگی میں کبھی بھی سیار سرگرمیوں میں حصہ نہیں لو گے۔ بلدیاتی انتخابات میں بھی۔“

وہ بولا۔ ”شیر کا شکار کرنے والا کتوں کے پیچھے نہیں دوڑتا۔ فکر نہ کرو۔“ سردار نے کہا۔ عالمگیر نے۔ ”او۔ کے“ کہہ کر کال منقطع کر دی۔ چند لمحوں کے بعد اُس کے دوسرے

فون پر سردار کی کال آ گئی۔ فون کان سے لگا کر بولا۔ ”ہاں سردار! کیا رہا؟ وہ الوکا پٹھا کا کہتا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں سیاست سے قدم کھینچنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ وہ خوش ہو کر بولا کہ میں بلدیاتی اکھاڑے میں بھی نہ اُتروں۔ اجیت آدمی کو اتنا بھی علم نہیں

کہ سردار فضل خان صوبائی اسمبلی کو چھوڑ کر ضلعی اسمبلی میں کیسے بیٹھ سکتا ہے۔“ سردار خاصا

تلملایا ہوا تھا۔ ظاہر ہے، تازہ تازہ زخم تھا، جیہن ناگزیر تھی۔

عالمگیر نے بشیر خان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ناکام ہونے پر شرعی کے نمبر کو نال کرنے لگا۔ وہ بھی بند تھا۔ سوچنے لگا۔ ”شیر کے آنے پر رن کانپ اٹھا ہے، یوں لگتا ہے کہ

رفیع اللہ کی آمد پر سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔“

دوپہر تک ڈرائیور گاڑی لے کر پہنچ گیا۔ شانی نے بازار جانے کی ضد پکڑ لی۔ دونوں تیار ہو کر شاپنگ کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔ بارہا کے دیکھے ہوئے شاپنگ پلازے کو گہرائی

ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ گاڑی روک کر بولا۔ ”ہم دھماکے والی جگہ دیکھ کر ڈرنے لگی ہو؟“

”ہاں!“ وہ بولی۔

میں اُس جگہ پر کھڑی ہوں جہاں ہم بیٹھا تھا۔

عالمگیر اُس کے چہرے کے پل پل بدلتے تاثرات کو بخور دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”نہیں پایا! مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔ عالمگیر میرے ساتھ ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ بہت اچھا ہے۔ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔“

پاپا نے کچھ ایسا کہہ دیا تھا کہ وہ شرمناک مسکرا نے لگی۔ کن اکھیوں سے عالمگیر کو دیکھا، ہر آنکھیں چرانے لگی۔ فون بند کر کے بولی۔ ”پاپا بعض اوقات بات کرتے ہوئے سوچتے نہیں ہیں۔“

”کیا کہہ رہا تھا تمہارا باپ؟“ وہ مسکرایا۔ ”کیسی بات کہہ دی اُس نے جس پر اتنے پیارے چہرے پر قوس قزح پھوٹ پڑی۔“

مصنوعی خفگی سے اُسے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

والپسی پر ریڈ سگنل پر رکتے ہوئے عالمگیر نے اُسے بتایا۔ ”تمہارے باپ کے پیچھے انڈر ورلڈ کا بڑا سیٹھ داؤد سبحانی پڑ گیا ہے۔ اُس کے کہنے پر تمہارے باپ نے سیاست سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔“

وہ چونکی پھر خوشی سے بولی۔ ”ہائے عالمگیر! تم سچ کہہ رہے ہو؟“
وہ استعجاب آمیز لہجے میں بولا۔ ”تمہیں یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے، حیرت ہے!“
”ہاں!“ وہ قطعیت سے بولی۔ ”میں اُن کا سیاست میں رہنا پسند نہیں کرتی۔“
”کیوں؟“

”سیاست مردہ ضمیری کا پیشہ ہے۔“

وہ سوچنے لگا۔ شانی نے بہت بڑا سچ اگلا تھا۔ سگنل کے گرین ہونے پر گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”واقعی! تم نے ٹھیک کہا۔“

وہ مستفسر ہوئی۔ ”یہ انڈر ورلڈ کیا شے ہے؟“

اُس نے اُس کی ذہنی سطح کے مطابق سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ”اتنے ظالم اور با اختیار ہیں یہ لوگ؟“

”ہاں!“ وہ بولا۔ ”وہ تمہارے باپ کو بلیک میل کر رہے ہیں۔ ایک حکم مان لینے کے بعد دوسرا ماننا پڑتا ہے۔ یہ سلسلہ بندے کے مرنے پر ہی ختم ہوتا ہے۔ خدا جانے وہ اگلا حکم

کیا دیتے ہیں؟“

وہ متفکر ہو گئی۔ سوچنے لگی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ ایک طرف مجھے رئیس کا خاندان نیچا دکھانے کی کوشش میں بٹھا ہوا ہے، دوسری طرف پاپا کے پیچھے چیتے لپک رہے ہیں، یہ سب کچھ کیا ہے؟ کس جرم کی سزا ہے؟“

اُس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ باپ کے جرائم کی فہرست طویل تھی۔ کتابوں میں پڑھتی آئی تھی کہ کسی کے گناہوں کا بوجھ اُسی کے کندھوں پر ہی لاداجاتا ہے، کسی بے قصور پر حرف نہیں آتا۔ یہاں خود کو بے قصور سمجھتے ہوئے سولی پر لٹتا دیکھ رہی تھی۔ کارپورچ میں رُکی۔ وہ گارڈ کو بلا کر کہنے لگی۔ ”سامان میرے کمرے میں رکھ دو۔“

گارڈ شاپنگ بیگ اٹھانے لگا۔ وہ عالمگیر کے پیچھے پیچھے اُس کے کمرے میں آ گئی۔ عالمگیر کی سوالیہ نظروں پر سر جھکا کر بولی۔ ”تم سے کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔“

وہ کچھ نہیں بولا۔ وہ سانس ہموار کر کے بولی۔ ”پاپا کی طرف سے دل کو پریشانی ہو رہی ہے۔“

وہ بولا۔ ”یہ تمہارے سوچنے کا کام نہیں ہے اور نہ ہی پہلی مرتبہ ایسا ہو رہا ہے۔ سیاست میں یہ سب کچھ چلتا رہتا ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ تمہارے باپ کو سیاست سے ریٹائرمنٹ لے کر آرام کرنا چاہیے۔ وہ مسلسل میرے رابطے میں ہے۔ تم اپنی فکر کرو، مجھے سردار فضل کی پریشانیوں کی فکر کرنے دو۔“

ایسے میں سردار فضل نے عالمگیر سے رابطہ کیا۔ وہ فون کان سے لگا کر بولا۔ ”ہاں سردار! کیا بات ہے؟“

”بات لمبی ہے، کیا کر رہے ہو؟“

”میں اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھا ہوں۔ کہو!“

سردار نے متفکر لہجے میں کہا۔ ”بڑی سرکار میرے مستعفی ہونے کے فیصلے پر بہت جزبہ ڈال۔ قیادت پر بھی یہ فیصلہ بہت گراں گزر رہا ہے۔ اب بتاؤ، میں کیا کروں؟“

”تم بڑی سرکار کی فکر نہ کرو۔ وہ تمہیں نہیں بچا سکتا۔ تمہاری گرنے والی ساکھ کو کندھا نہیں دے سکتا۔ اس لئے جو تمہیں داؤد سبحانی نے کہا ہے، اُسی پر عمل کرو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ضمنی انتخابات میں تمہیں کھڑا کروں۔“ سردار

نے کہا۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔ حیرت آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں..... میں کیوں؟“

”میں تمہارے علاوہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔ میرا کوئی سگا تو ہے نہیں، سرکاری رشتہ داروں کی فطرت کو بخوبی جانتا ہوں۔ سانپ کی طرح دودھ ڈکار کر ڈسنے پر آ جاتے ہیں۔“ سردار نے کہا۔

”نہیں سردار!“ وہ قطعیت سے بولا۔ ”میں ایکشن نہیں لڑ سکتا۔ ویسے بھی میں نے سوچ رکھا ہے کہ جو بھی تم پریشانیوں سے نکلو گے، میں اپنا بوریا بستر باندھ لوں گا۔“

سردار چیخا۔ ”کیوں؟ تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاؤ گے؟“

شانی غور سے اُس کی باتیں سن رہی تھی۔ بوریا بستر باندھنے کی بات پر چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ دل پر گھونسا لگا۔ کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا تو عالمگیر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کرادیا۔ فون پر سردار سے مخاطب ہوا۔ ”تم نے اپنی سیاسی بساط کو دسترس میں رکھنے کیلئے میری خدمات حاصل کی تھیں۔ بساط پلٹ گئی۔ اب تم بھی آرام کرو، مجھے بھی کرنے دو۔ رہی بات کہ کہاں جاؤں گا تو اس بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں بتا سکتا۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ سر چھپانے کی جگہ مل جائے گی۔“

سردار کا لہجہ بدستور استعجاب آمیز اور خفگی آلود تھا۔ ”تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔“

عالمگیر نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں سردار! تمہاری دنیا سے میرا دل اُوب گیا ہے۔“

شانی سے نہ رہا گیا۔ اُس کے ہاتھ سے فون جھپٹ کر پاپا سے مخاطب ہوئی۔ ”پاپا! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ عالمگیر کہہ رہا ہے کہ وہ کہیں چلا جائے گا..... یہ سب کیا ہے؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی۔“

سردار کا لہجہ متغیر ہو گیا۔ ”شانی بیٹا! کیا تم عالمگیر کے کمرے میں ہو؟“

شانی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سمجھ میں آیا کہ عالمگیر نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کیوں خاموش کر لیا تھا۔ مگر اب تیرکمان سے نکل چکا تھا۔ بولی۔ ”ہاں پاپا! ہم ابھی شاپنگ کر کے گھر پہنچے ہی تھے کہ آپ کا فون آ گیا۔“

”عالمگیر کو فون دو۔“

”نہیں دوں گی پاپا!“ شانی غصے سے بولی۔ ”جو میں پوچھتی ہوں، اُس کا جواب دیں۔“ باپ نے بیٹی کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ جھنجھلا کر سکرین کو مھرنے لگی۔ فون کو بیڈ پر پٹخ دیا۔ عالمگیر کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ ”یہ کیا بد تمیزی ہے؟ تم نے جانے کی بات کیوں کی ہے؟“

وہ بت بنا بیٹھا رہا۔ حسن مشتعل تھا۔ گرم لوہا چوٹ مانگنے لگا تھا۔ اشتعال دلانے کیلئے بولا۔ ”تمہارے باپ نے مجھے اپنے اقتدار کو دائمی طاقت دینے کیلئے لاکھوں میں خریدا تھا۔ اب اُسے میری ضرورت نہیں رہے گی۔ ویسے بھی میں نے سوچا ہے کہ میں کہاں ہوں؟ میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں کسی کا کچھ نہیں ہوں۔ تمہارے باپ کیلئے کشت و خون کرتا رہا، تمہارے لئے تمہاری باتیں سناتا رہا، اپنے لئے آج تک کچھ بھی نہیں کر پایا ہوں۔ اب کہیں دور جا کر اپنی زندگی کے بارے میں سوچوں گا۔“

وہ چند لمحے جلتی نظروں سے اُسے گھورتی رہی پھر بولی۔ ”میں تمہاری کچھ بھی نہیں ہوں؟“ وہ سر جھکا کر بولا۔ ”تم امیر زادی ہو، بڑے باپ کی ناز و نعم میں پلی ہوئی بیٹی ہو۔ میرا اور تمہارا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ نمل پر ٹاٹ کا پیوند ہر نظر کو چھینے لگتا ہے۔“

وہ غصے میں لرزنے لگی۔ ہونٹ کپکانے لگے۔ جنونی انداز میں عالمگیر کی آستین کھینچ کر اوپر چڑھا دی۔ عالمگیر حیرت سے اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اُس نے دانت کپکپاتے ہوئے اُس کے بازو کے گوشت میں دانت گاڑ دیے۔ اُس نے بازو کھینچنے کی کوشش کی تو درد کی کیٹلی لہر پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ شانی نے اُسے کانٹے پر اپنی پوری قوت صرف کر ڈالی تھی۔

عالمگیر نے مٹھی بھینچ لی، جبراً بھینچ لیا۔ درد کو ضبط کرتا رہا۔ پندرہ بیس سیکنڈ گزر گئے۔ شانی کو ہوش آیا تو اُس نے منہ کھولا اور سر اٹھا لیا۔ عالمگیر کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ گیانیوں کی طرح آنکھیں بند کر کے منہ اٹھائے بیٹھا تھا۔ دیوانگی کم ہوئی، بازو پر نظر پڑی تو چونک اٹھی۔ بازو کے اندرونی سائڈ کے نرم گوشت میں اُس کے دانت دائروں کی شکل میں ثبت ہو چکے تھے۔ ننھے ننھے گڑھوں سے خون رسنے لگا تھا۔

اپنے کئے پر ندامت ہونے لگی۔ یہ اُس نے کیا کر دیا تھا؟

بغیر سوچے سمجھے قدم اٹھایا جائے تو ندامت دامن گیر ہو جاتی ہے۔ وہ گھبرا کر دیوانوں

کی طرح خون میں چھپنے والے دانتوں کے نشانات کو چوسنے لگی، ہونٹ رگڑنے لگی۔ ایسے میں آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ خون، لعاب اور آب چشم..... خون زندگی کی ایک جاندار علامت، لعاب زندگی کے پریچ راستوں میں لڑھکتے وجود کو سنبھالا دینے والا ایک سیال مادہ، آب چشم زندگی کے بدن پر لگے زخموں پر مرہم نما ایک مداوا۔ جنوں نے خود کو مٹی میں لیتے ہوئے سب کو باہم شیر و شکر کر دیا تو وہ سبک پڑی۔

سانپ پہلے اپنے دانتوں سے کاٹتا ہے، پھر اپنے کالے پر زہر پٹکتا ہے۔ زخم خوردہ کا دم گھٹنے لگتا ہے، سانس رکنے لگتی ہے۔ وہ بھی زخم پر کچھ ٹپکا رہی تھی۔ جانے کیا تھا کہ زہر وصول کرنے والا بدن تپنے لگا۔ دم گھٹنے کی بجائے مشتعل ہوتا جا رہا تھا۔ سانس رکنے کی بجائے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ بند آنکھیں نشے سے معمور ہونے لگیں۔ خود کو ہواؤں کے دوش پر اڑتا محسوس کرتے ہوئے دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگنے لگا۔ ”ہائے! یہ لمحہ نہیں ٹھہر جائے۔ کوئی جگائے نہ آکر سو جائیں۔ یونہی بدن پر جنوں کے عالم میں چر کے لگاتی رہے، یونہی اپنے کالے پر شراب اندیلتی رہے، میں مر بھی جاؤں تو غم نہیں، خستہ زندگی سے ایسی موت بھلی ہے۔“

ایسے میں شانی کے فون کا بزر بجا۔ اُس نے جھپٹ کر فون اٹھایا۔ سکرین پر پاپا کا نمبر دیکھا تو جھنجھلا کر پوری قوت سے فون سیٹ دیوار پر دے مارا۔ فون ٹوٹ کر بکھر گیا۔ دیوار پر تنہا سا نشان پڑ گیا۔

عالمگیر نے زدہ نگاہوں سے اُس کی ہجانی شکل کو دیکھ رہا تھا۔ ہجانی کیفیت کو ہجانی رومل سے ختم کیا جاسکتا تھا۔ اُس نے شانی کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ دل سسکیاں سننے لگا، شانی کی سماعت میں عالمگیر کے سینے میں اُس کیلئے دھڑکنے والے دل کی دھڑکن..... دھک..... دھک..... کر کے اترنے لگی۔ وہ بولی۔ ”جانا ہے تو میرا گلا گھونٹ کر چلے جاؤ۔ جیتے جی تمہیں نہیں جانے دوں گی۔“

وہ اُس کی زلفوں میں کھو گیا۔ ایسے کوئی رو کے تو کون نہ تھم جائے؟ عالمگیر نے آہستگی سے اُسے پکارا۔ ”شانی! میری جان!“

”ہوں.....“

”تم مجھے دل سے روکنا چاہتی ہو؟“

وہ کہنا چاہتی تھی کہ اگر تمہیں روکنا نہیں چاہتی تو جانے کاسن کر اپنی دھڑکنیں کیوں روکنے لگتی ہوں؟ کہہ نہ پائی تو عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ بولی۔ ”ہاں!“

”تو پھر مجھے اپنے پیار کی زنجیر میں باندھ لو۔ مجھ سے شادی کر لو۔“

اُس نے یکبارگی چونک کر سر اٹھایا۔ اُس کی آنکھوں میں بے باکی سے جھانکا۔ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ ”بس.....“

لوٹنے کیلئے آنے والا خود لٹ کر سرنگوں بیٹھ گیا۔ شانی بایاں ہاتھ اُس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولی۔ ”وہی طور پر بہت پہلے سے تمہیں اپنا سب کچھ مان چکی ہوں، خود کو تہارے سپرد کر چکی ہوں۔ جسم پر اختیار چاہتے ہو۔ لو تھام لو۔ جب جی چاہے، کورٹ میں لے جاؤ اور مجھے اپنا بنا لو۔ میں نے تمہیں اپنا مان لیا ہے۔“

عالمگیر کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے لہراتے بازو کو دیکھا۔ بازو اوپر کی جانب اٹھنے کی وجہ سے کف نیچے کہنی کی جانب کھسک گیا تھا۔ کلائی سے کچھ اوپر ننھا سا سیاہ تل پندلم کی طرح ادھر ادھر ہو رہا تھا۔ اُس نے بازو پکڑ لیا اور تل پر اپنے عمر بھر کے تشنہ ہونٹ ثبت کر دیے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ تجربہ ہوا تھا کہ اُبلتے تن پر سیاہ دھبہ بن کر کھلنے والا تل بے جان نہیں ہوا کرتا۔

ٹوٹاں تھمتے تھمتے پھر شدت اختیار کرنے لگا تھا۔



وہ بدقت تمام ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز کئے بیٹھا رہا۔ دل میں سوچنے لگا۔ ”ہر دم محبت کا دم بھرنے والی کو جب پتہ چلے گا کہ میں کوئی غیر نہیں، اس کا حقیقی چچا زاد ہوں تو اس کے محبت کی پھونکوں سے پھلائے گئے غباروں سے ہوا نکل جائے گی۔“

دل میں خیال آیا۔ ”مجھے اس طرح اپنا مشن مکمل کرنا چاہیے کہ باپ پر ٹوٹ پڑنے والی قیامت سے بیٹی بالکل بے خبر رہتے ہوئے میری محبت میں سر تا پا غرق رہے۔ باپ بیٹی کے دل میں ہونے والی انتہائی انتہائی سے بے خبر رہے۔ پھر زندگی کا مزہ آئے گا۔“

وہ اُسے سوچ میں گم دیکھ کر بولی۔ ”اے! کیا اکیلے اکیلے سوچے جا رہے ہو؟ میں کوئی اور نہیں، تمہاری وہ ہوں۔ مجھ سے کچھ چھپاؤ گے تو میں تمہاری نظروں سے چھپ جاؤں گی۔“

وہ بولا۔ ”تمہارے باپ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ دنیا بھر کی دولت پر ناگ بن کر بیٹھا ہے مگر بھری دنیا میں کوئی بھی اُس کا اپنا نہیں ہے جسے وہ اپنی جگہ پر کھڑا کر سکے۔“ وہ بولی۔ ”میں کچھ سمجھتی نہیں۔“

”محبوبہ اُن کہی سمجھتی ہے، بیوی سمجھانے پر بھی سمجھ نہیں پاتی۔“ وہ ہنسا۔ ”میں سردار کا کچھ نہیں لگتا۔ اُس سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ اُسے ابھی تک یہ علم نہیں ہے کہ میں چور راستے سے گزر کر اُس کا داماد بن چکا ہوں۔ اپنی نشست پر مجھے کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ بیٹا، بھتیجا یا بھانجا کوئی ہوتا تو وہ پکی ہوئی کھیر میری پلیٹ میں کبھی میں نہ ڈالتا۔ اب اُسے میرے سوا دنیا میں کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔ اُس نے رقم سے محل خریدے ہیں، اپنا کسی کو نہیں بنایا۔“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ سوچنے لگی۔ ”کتنا اچھا ہے کہ عالمگیر اسمبلی کا ممبر بن جائے۔ میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں۔ بڑے آدمی کی بیوی بن جاؤں گی۔ میرے شخصی وقار میں اضافہ ہو جائے گا۔ یہ فائدہ بھی ہو گا کہ کسی کو ہم دونوں کے بیچ میں حائل طبقاتی فرق دکھائی نہیں دے گا۔“

امید بھرے لہجے میں بولی۔ ”پاپا پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ میں خود بھی چاہتی ہوں کہ وہ سیاست ترک کر کے مکمل آرام کریں۔ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ایسے میں تمہیں اُن کی بات مان لینا چاہیے۔ مان لینے والا پیارا لگتا ہے۔ پیارے کو پیاری چیز سونپتے ہوئے دل کو دکھ نہیں ہوتا۔“

کورٹ سے باہر نکلنے پر شانی نے نظریں نیچے کئے ہوئے سے کہا۔ ”میں نے تمہیں ہمیشہ کیلئے روک لینے کی خاطر اپنے بدن کو زنجیر بنا کر تمہارے قدموں سے لپیٹ دیا ہے۔ چاہوں گی کہ تم کبھی بھی اس زنجیر کو نہ توڑو۔“

وارفتہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”زنجیر پیروں کو نہیں، دل کو پوری طرح جکڑ چکی ہے۔ بھاگ کر کہاں جاؤں گا؟“

وہ گاڑی میں بیٹھ کر بولی۔ ”ایک بات اور.....“

”کہو!“

”مانو گے؟“

”نہ ماننے کی ہوئی تب بھی مان لوں گا۔“

”میں نے پاپا اور ماما سے اجازت لئے بغیر شادی کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے یہ قدم نہایت مجبوری کی حالت میں اٹھایا ہے۔ تمہیں بھی اس مجبوری کا علم ہے۔ میں چاہوں گی کہ میں خود کو تمہارے سپرد اُس وقت کروں جب کوئی مجبوری حائل نہ رہے ورنہ میں ساری عمر ندامت محسوس کرتی رہوں گی۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ اور کہو!“

وہ تشکرانہ نگاہوں سے اپنے محبوب کو دیکھنے لگی۔ ”رحمت بی سمیت کسی کو ہماری شادی کا پتہ نہ چلے۔“

”یہ حکم بھی مان لیا۔ اور کہو.....“

”میں ایسے کبھی جاؤں، تم ماننے جاؤ۔ ہائے اللہ! اس سے زیادہ خوبصورت زندگی بھی کوئی ہوگی۔“

اُس نے سوچنے کا وقت لیتے ہوئے کہا۔ ”میں اس انداز سے اپنے ذہن کو ڈھالنے کی کوشش کروں گا۔“

مارکٹ سے نکل کر لیڈی ڈاکٹر کے کلینک میں پہنچے۔ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ شانی اندر چلی گئی۔ دوسریوں کے بعد اُس کا نمبر لگا۔ ڈاکٹر اُسے دیکھتے ہی مسکرا کر بولی۔ ”آؤ مس شانی! کیا تمہاری میڈیسن ختم ہو گئی ہے؟“

وہ پورے اعتماد سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ بولی۔ ”دوائی ابھی چل رہی ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ بغیر کسی نقصان کے میرا وزن ہلکا ہو جائے گا؟“

ڈاکٹر اچھے سے بولی۔ ”تو کیا تم نقصان کے ڈر سے وزن اٹھائے رکھنے کی تحمل ہو؟“
”تحمل تو نہیں ہوں مگر پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ نہ مانے تو انہیں آپ کے پاس لے آؤں گی۔ آپ سمجھائیں گے تو وہ سمجھ جائیں گے۔“ شانی نے کہا۔
”وہ کون؟“ ڈاکٹر بھونچکی رہ گئی۔

”میرے شوہر اور کون!“ وہ بے ساختگی سے بولی۔
”تو کیا واقعی تمہاری شادی ہو چکی ہے؟“ ڈاکٹر کی آنکھیں پھٹ پڑنے کو تھیں۔
”تو کیا میں آپ سے جھوٹ بولتی ہوں۔“

ڈاکٹر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ سوچنے لگی کہ کل کی چھو کری اُسے چکر دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ چکر دینے والی کو چکر میں ڈالنے کیلئے بولی۔ ”وہ اس وقت کہاں ہیں؟“
”ویٹنگ لابی میں بیٹھے ہیں۔“

”انہیں بلا کر لاؤ۔“
وہ اٹھی۔ باہر آئی اور عالمگیر کو اشارے سے اٹھا کر واپس آفس میں آ گئی۔ عالمگیر سے غائب ہو کر بولی۔ ”ڈاکٹر صاحبہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

ڈاکٹر تعجب آمیز نگاہوں سے عالمگیر کو دیکھ کر بولی۔ ”میں نے سمجھا تھا کہ آپ کی مسز غیر ملکی شدہ ہیں۔ دراصل یہاں ایسے کئی لوگ آتے رہتے ہیں۔ غلط فہمی ہو گئی۔ مگر مجھے سمجھ نہیں آیا کہ آپ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اولاد اللہ کی نعمت ہے۔ نعمت کو یوں ٹھکرایا جائے تو اللہ روٹھ جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ رحمت کا چشمہ ہمیشہ کیلئے سوکھ کر خاموش ہو جاتا ہے، اپنا بہاؤ کھو دیتا ہے۔ تب انسان رہ جاتا ہے، تشنگی رہ جاتی ہے اور منتوں مُرادوں

وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ ”وہ اپنی جان سے پیاری چیز مجھے دینے پر رضامند نہیں ہوگا۔ میرے بازوؤں میں دم ہے۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آنکھ کا سرمہ چڑھا لیا ہے۔“ شانی کے عریاں بازو پر چٹکی کاٹتے ہوئے بولا۔ ”اب دل دکھے یا نہ دکھے، پیاری چیز تو زندگی بھر کیلئے میری ہو چکی ہے۔“

وہ شرارت سے بولی۔ ”ابھی پاپا کو پتہ نہیں ہے۔ پتہ چلنے پر وہ تمہیں گولی بھی مار سکتے ہیں۔“

مارکٹ سے نیا موبائل فون سیٹ خریدا۔ شانی نے سم فٹ کر کے اپنے باپ کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر بولی۔ ”پاپا! کیا ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں؟“

پاپا کی بات سنتی رہی۔ چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے۔ عالمگیر کو کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ اب بھی میرے ساتھ ہے۔ آپ نے ہی تو اُس کا خیال رکھنے کا حکم دیا تھا۔ اب خیال رکھتی ہوں تو آپ کو.....“

عالمگیر کان لگا کر سردار کی بات سننے کی کوشش کر رہا تھا مگر ناکام ہو رہا تھا۔ شانی بولی۔ ”پاپا! وہ بہت اچھا ہے۔ آپ کے بارے میں بہت پریشان رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ آپ کو اُس کی ضرورت ہے۔“

پاپا کی بات سن کر بولی۔ ”ہاں ہاں! میں اُسے کہیں نہیں جانے دوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ ماما کو سلام دیجئے گا۔ اوکے!“

عالمگیر سے مخاطب ہوئی۔ ”پاپا کہتے ہیں کہ تم واقعی بہت اچھے ہو۔ وہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اگر تم ممبر منتخب ہو جاتے ہو تو پھر.....“
”پھر کیا؟“

”کہہ رہے تھے کہ پھر.....“
”تجسس پیدا کئے جاتی ہو۔ بتاؤ ناں کہ پھر کیا؟“

”پھر تمہاری اور میری شادی کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔“ وہ شرما کر بولی۔ ”میں تبھی تو کہتی ہوں کہ پاپا کی بات مان کر اُن کے دل میں اپنی جگہ بنا لو۔ انہیں واقعی سہارے کی ضرورت ہے۔ سہارا بیٹا ہی دے سکتا ہے۔ بیٹی کا شوہر بیٹے کا نعم البدل ہوتا ہے، سہارا دے سکتا ہے۔ تم یہ کر سکتے ہو، میری مان کر ایکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ سنا دو۔“

انہوں نے کل شام کو مجھ تک ایک ڈسک پہنچائی ہے۔ پیغام دیا ہے کہ یہ وڈیو ڈسک تم تک پہنچا دی جائے۔ میں نے تمہاری اجازت کے بغیر اسے دیکھا ہے۔ وہی فلم ہے جو بڑی سرکار کے بندوں نے شہر والی کوشی میں چوہدری باسط کی بیٹی پر بنائی تھی۔ اگر کہو تو میں اس ڈسک کو بھیج دوں۔“

سردار نے استعجاب آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”اُس فلم کو بھیجے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟“ عالمگیر نے کہا۔ ”یہ بعد کی بات ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ فلم اُن تک پہنچی کیسے؟“ سردار سوچ میں پڑ گیا۔ بولا۔ ”تمہارے اور بڑی سرکار کے علاوہ کسی کو فلم کے بارے میں پتہ ہی نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بڑی سرکار کو استعمال کیا گیا ہے۔“

وہ فکر انگیز لہجے میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ بڑی سرکار کے آس پاس سیٹھ سحانی کے بارے میں موجود ہیں جو نہ صرف بڑی سرکار بلکہ تمہیں بھی نگاہوں میں رکھتے ہیں۔“

سردار نے کچھ غیر متعلقہ باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ عالمگیر کے جال میں مچھلی بھس چکی تھی۔ اب اُسے پوری مہارت سے پانی سے باہر لانا تھا۔ ایسے کہ جال بھی ملامت رہے، مچھلی بھی کنارے پر آ جائے۔ شام کو دوسرے نمبر سے سردار کو کال کی۔ ”سردار فضل خان! میں تھرڈ مین بول رہا ہوں۔ ایک اور تحفہ تمہارے کارندے تک پہنچا دیا گیا ہے۔ کیا تمہیں مل چکا ہے؟“

سردار نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ ”ہاں! مل چکا ہے۔ مگر سمجھ نہیں آئی کہ ایسی فحش فلم ہمارے پاس بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟“

عالمگیر تہہ لب لگا کر ہنسا۔ ”کیا ہمیں احمق سمجھ رکھا ہے تم نے؟ وہ فلم تم نے اور تمہاری بڑی سرکار نے چوہدری باسط کو بلیک میل کرنے کیلئے بنوائی تھی۔ اس بات کو چھوڑو، یہ سوچو کہ اگر چوہدری باسط کے بننے والے داماد ملک امجد تک پہنچا دی جائے اور اُسے بتا دیا جائے کہ اس کے ہاتھوں کا ہنر ہے تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔“

سردار کی حالت غیر ہونے لگی۔ بولا۔ ”مگر ایسا کرنے سے تمہیں کیا ملے گا؟“ ”مجھے جو مل رہا ہے، وہی کافی ہے۔ ایسا کرنے سے انڈر ورلڈ کے سیٹھ کو کیا ملے گا، یہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ ملا تو ضرور پوچھوں گا۔“ وہ بولا۔ ”ابھی تم ہمارے چھوٹے پتے دیکھ رہے ہو۔ بڑے پتے وقت آنے پر شو کرائے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لئے

کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ رہ جاتا ہے۔“

عالمگیر نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحبہ! میری مسز بھی یہی چاہتی ہے مگر ہماری کچھ پرالٹرنیٹس پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ جن دنوں میں ڈیوری متوقع ہے، ان دنوں میں اس کے فائل ایگزامز ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم ابھی چند سال اپنی محنت میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتے۔ آپ کے پاس اپنے مسئلے کے حل کیلئے آئے ہیں۔ آپ کی جو بھی فیس ہوگی، دوگنی کر کے چکانیں گے۔ ورنہ کسی اور در پر دستک دینے کیلئے یہاں سے اٹھ جائیں گے۔“

ڈاکٹر پیڈر پر آڑی ترچھی لکیریں ڈالتی رہی، سوچتی رہی۔ ہزاروں روپوں کے عوض وہ ان دیکھاقتل کرتی تھی۔ یہاں روپے دکھائی نہیں دیے تو نصیحتوں کی پٹاری کھول کر بیچ گئی۔ عالمگیر نے کہا۔ ”اگر آپ ہماری مدد نہیں کریں گی تو ہم کسی اور ڈاکٹر سے رجوع کر لیں گے۔“

یہ کہہ کر اُس نے جیب سے بڑے نوٹوں کی گڈی نکالی اور میز پر رکھ دی۔ بولا۔ ”میرے نزدیک پیسہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میری بیوی کی صحت پر کوئی آج نہ آئے۔ اس لئے میں احتیاط کی بڑی سے بڑی قیمت چکانے کو تیار ہوں۔“ ڈاکٹر کبھی رقم کو دیکھتی، کبھی دونوں میاں بیوی کو دیکھتی۔ سوچنے لگی۔ ”جائز کام کے اتنے پیسے نہیں دیے جاتے۔ اگر یہ غلط نہیں کہہ رہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ شاہانہ کا چاہنے والا بہت امیر آدمی ہے۔“

چند لمحے سوچنے کے بعد اُس نے حامی بھری۔ مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تم دونوں کی جوڑی کے سدا سلامت رہنے کی دعا کرتی ہوں۔“

پیڈر پر کچھ لکھ کر کاغذ پھاڑ کر شاہانہ کو تھماتے ہوئے بولی۔ ”میں نے ڈیٹ لکھ دی ہے۔ اس دن یہاں آ جانا۔ تب تک پرچی پر لکھی ہوئی دوائیاں باقاعدگی سے کھاتی رہنا اور ہاں! اس دوران احتیاط بھی کرنا۔“

دونوں کلینک سے باہر آئے۔ ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اگلے دن دوپہر کو سردار فضل خان نے فون پر عالمگیر کو بتایا کہ اُس کا استعفیٰ قبول کر لیا گیا ہے۔ عالمگیر نے اُسے بتایا۔ ”سردار! انڈر ورلڈ کے لئے مجھ کچھ خطرناک لگتے ہیں۔“

تمام راستے میرے ہیں۔ میں کسی بھی سڑک پر کسی بھی وقت گاڑی چلا سکتا ہوں۔ تم بھی ایسا کر سکتے ہو۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟“

شاہانہ گاڑی سے اتر کر قریب آ گئی۔ بولی۔ ”رئیس! یہ کیا بد تمیزی ہے؟“

وہ بولا۔ ”مجھے واقعی سمجھ نہیں آرہی کہ میں کونسا جرم کر بیٹھا ہوں۔“

شاہانہ نے غصیلی نگاہ اُس پر ڈالی اور عالمگیر کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ ”کم آن عالمگیر! ہمیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ رئیس واقعی ایسا انسان نہیں ہے۔ میں اسے بخوبی جانتی ہوں۔“

عالمگیر گاڑی میں بیٹھ کر اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ رہ رہ کر جھلاہٹ ہو رہی تھی۔ کبھی کوئی اُس کے سامنے یوں ٹھہرا نہیں تھا۔ رئیس گاڑی آگے نکال لے گیا۔ شاہانہ نے کہا۔ ”پلیز عالمگیر! اپنا موڈ درست کرو۔ غلطی میری تھی۔ میں نے خواہ مخواہ ہی اُس بے چارے پر شک کیا۔“

وہ نفرت آگئیں لہجے میں بولا۔ ”میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اُس حرامی کا گلا گھونٹ دوں۔“

گاڑی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے سے گزرنے لگی تو شاہانہ نے ہاتھ سے رُکنے کا اشارہ کیا۔ وہ کار روک کر استغہامیہ نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”اپنا موڈ نارمل کرو۔ میں ہوٹل میں ریفریشنمنٹ لینے کے خوشگوار موڈ میں ہوں۔“

عالمگیر نے کار پارکنگ کا رخ کیا۔ گاڑی روک کر دونوں اتر کر ہوٹل میں داخل ہو گئے۔



جس دن لیڈی ڈاکٹر نے اُسے مکمل طور پر روبرو صحت ہونے کی نوید سنائی، اُس نے فوری طور پر پاپا کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔ عالمگیر نے بہتری کوشش کی کہ وہ اپنے ارادے سے باز آ جائے مگر وہ ڈنٹ گئی۔ عالمگیر کو ہار ماننا پڑی۔ سردار کو اپنے آنے کی اطلاع دے کر تیاری کرنے لگا۔ اگلے دن علی الصبح دونوں لاہور سے نکل کھڑے ہوئے۔

سہ پہر میں وہ حویلی پہنچے۔ پاپا کے گلے لگ کر رونے لگ گئی۔ سردار فضل خان نے چونک کر عالمگیر کی طرف دیکھا۔ پھر شاہانہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”کیا بات

یہی کافی ہیں۔“

سردار فضل نے کہا۔ ”میں نے تم لوگوں کا مطالبہ مان کر اسمبلی میں اپنا استعفیٰ بھیج دیا ہے۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟“

”علم نہیں۔ سیٹھ بتائے گا تو تمہیں بتا دوں گا۔ جلد ملاقات ہوگی۔ گلدبائی!“ عالمگیر نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ سردار کی راتوں کی نیند حرام کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ چاہتا تھا کہ آنے والے چند دنوں میں سردار اپنا سر نوچنے پر مجبور ہو جائے گا۔

شانی نے کلاس جان کر لی۔ پہلے اُس کا ارادہ تھا کہ تعلیم کو خیر باد کہہ دے گی۔ عالمگیر نے اُسے سمجھا بجا کر یونیورسٹی جانے پر تیار کر لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے اپنی تعلیم کو ادھر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ اپنے ماحول کو فیس کرنے کی بھرپور کوشش کرے اور خود اعتمادی کو تقویت دے۔

واپسی پر شانی نے اُسے کہا۔ ”رئیس کی گاڑی مسلسل ہمارے پیچھے چلی آرہی ہے۔“ عالمگیر نے بیک مرر میں جھانکا۔ رئیس کی نئی کار کو پہچانتا تھا۔ پارکنگ میں اُس کی گاڑی کے قریب ہی پارک کی گئی تھی۔ بولا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں۔“

وہ گھبرا سی گئی۔ عالمگیر نے مسکرا کر گاڑی روڈ سائیڈ پر کھڑی کر دی۔ جلدی سے اتر کر رئیس کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ رئیس نے ہنگامی طور پر بیک لگائے اور گردن باہر نکال کر کہا۔ ”اے مسٹر! کیا تمہیں اپنی زندگی سے پیار نہیں رہا؟ اگر ایسا ہی ہے تو کوئی اور طریقہ ڈھونڈ نکالو خود کشی کا۔“

وہ اُس کے قریب آ کر بولا۔ ”مجھے واقعی زندگی سے پیار نہیں ہے۔ تم بتاؤ! ہمارا تعاقب کیوں کر رہے ہو؟“

وہ ہنسا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مس شاہانہ میری کلاس فیلو ہے۔ جب وہ ہر روز آ رہا ہوں میرے ساتھ گزرتی ہے تو مجھے کیا پڑی تعاقب کرنے کی۔“

عالمگیر نے لہجہ سخت کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنا راستہ بدل کر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے ہو۔ باتیں نہ بناؤ اور جو تمہارے دل میں ہے، وہ بتاؤ۔“

رئیس پر اُس کے دہنگ لہجے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بدستور ہنستے ہوئے بولا۔ ”یہ الزام تو میں بھی دے سکتا ہوں کہ تم لوگ میرے آگے آگے چل رہے ہو۔ رہی بات راستے کی، شہر کے

احوال کرید کرید کر دریافت کیا۔ بولا۔ ”یار! تمہارے مزے ہیں۔ دوہرے قتل پر سزائے موت ہونے کے باوجود آزادی سے گھومتے پھرتے ہو۔ ایک ہم ہیں کہ معمولی سی ڈکیتوں پر اشتہاری قرار دیے گئے اور اب تک قانون کے آگے دوڑے پھرتے ہیں۔ اب رفیع اللہ کو ہی دیکھ لو۔ آتے ہی اُس نے میرے بارے میں دریافت کیا۔ یوں جیسے میں کوئی بہت بڑے گینگ کا سربراہ ہوں۔ یوں جیسے مجھے پکڑے بغیر علاقے میں امن و امان کی فضا قائم نہیں کی جاسکتی۔“

فقیر محمد ہنسنے لگا۔ ”دھت تیرے کی بشیریا! تو خود کو کیا سمجھتا ہے؟ تیرے چہرے پر اگر کبڑا ڈال دیا جائے تو شاید کوئی کتیا چوہا بھی تجھ سے نہ ڈرے۔ تیری آنکھوں اور مونچھوں کی تو علاقے میں دہشت ہے۔“

بشیر خان کھیانی ہلسی ہنستا ہوا روٹی پانی کا بندوبست کرنے لگا۔
فقیر محمد کو شہر علی کی طرف روانہ کر کے دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ کافی دیر گزر گئی۔ نہ ہی فقیر محمد شہر کو لے کر واپس پہنچا اور نہ ہی دونوں کی باتوں نے ختم ہونے کا نام لیا۔
پھر صلاح و مشورہ ختم ہو گیا۔ بات کو ختم کرتے ہوئے بشیر خان نے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”یار عالمگیر! میں خود بھی اس زندگی سے عاجز آچکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا بھی ایک چھوٹا سا گھر ہو، بہت پیار کرنے والی بیوی ہو، بچے ہوں، سکون ہی سکون ہو۔ یہ تو کوئی زندگی نہیں کہ سردار جیسے فرعون کے ٹکڑوں پر پلٹے رہو، جو وہ چاہے، کرتے رہو اور کسی دن پولیس کی گولی کی بھیٹ چڑھ جاؤ۔ اپنی نہ کوئی مرضی اور نہ کوئی مستقبل!“

عالمگیر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ مصمم ارادے کو ظاہر کرنے والی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر تیر گئی۔ ”بشیر خان! بس تھوڑا سا وقت اور۔ ہماری مشکلیں حل ہونے والی ہیں۔ ہمارے راستوں کے اخیر میں منزلیں منتظر کھڑی ہیں۔ بس چند دن اور!“

بشیر خان نے سر ہلایا۔ اُسے عالمگیر کے کہے ہوئے لفظوں پر اعتبار تھا، اپنی گھوڑی قسمت پر بخیر و بد نہیں تھا۔ قدرے مایوسی سے بولا۔ ”تم حوصلہ دیتے ہو، تمہارا بھلا ہو مگر مقدر کیا کھیل کھیلتا ہے، علم نہیں۔“

ایسے وقت میں فقیر محمد اور شہر علی کچے گھر کے دروازے کو عبور کر کے صحن میں داخل ہو گئے۔

ہے بیٹا؟ خیریت تو ہے نا؟“
وہ بولی۔ ”پاپا! میں آپ کو بہت مس کرتی تھی۔ عالمگیر کے وہاں پہنچنے سے پہلے مجھے بہت ڈر لگتا تھا۔“

سردار کو تسلی ہوئی۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ عالمگیر کو مہمان خانے میں بھیج کر دونوں باپ بیٹی اندرون خانہ چلے گئے۔ شانی ماما سے ملنے کیلئے بے تاب تھی۔ کافی عرصہ بعد ماں سے مل رہی تھی۔

ماں نے اُس کی شکل پر چھائی نقاہت کو بھانپتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے شانی؟ پیار رہی ہو کیا؟“

”ہاں ماما! مجھے کئی دن تک مسلسل بخار چڑھتا رہا ہے۔ ڈاکٹر سے دوائیں لیں، تب جا کے کہیں آرام آیا ہے۔“ اُس نے بات بنائی۔

رات گزار کر عالمگیر نے اپنے ساتھیوں کے پاس جانے کے ارادے سے کار باہر نکالی۔ متروک حویلی پر پہنچا۔ وہاں بشیر خان اور شہر علی موجود نہیں تھے۔ اُس نے فقیر محمد سے پوچھا۔ ”دونوں کہاں ہیں؟“

”وہ نیلے میں روپوش ہیں۔“
”کیوں؟“ وہ حیران ہوا۔

”نیا تھانیدار آیا ہے نا! وہ رفیع اللہ! فقیر محمد نے بتایا۔“ وہ دونوں کو اچھی طرح سے جانتا ہے۔ مخبر نے بتایا تھا ہمیں۔ ہم نے دونوں کو یہاں سے نکال دیا ہے۔“

”اُن کے فون بھی آف ہیں۔ کیوں؟“
”فون اس لئے بند رکھے ہیں کہ نیلے میں سیلوفون کے سنگٹل موصول ہی نہیں ہوتے۔“

فقیر محمد نے بتایا۔ عالمگیر نے اُس سے نیلے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ پھر اُسے ساتھ لے کر دریا کی طرف نکل گیا۔ وہ راستوں سے واقف نہیں تھا جبکہ فقیر محمد کئی مرتبہ نیلے تک آچکا تھا۔

دریا عبور کر کے وہ پیدل ہی نیلے کی طرف چل دیے۔ راستہ خاصا دشوار گزار تھا۔ دریا کے قریب وہ نیلے میں بنے ہوئے ایک کچے مکان میں بشیر خان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ شہر علی کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ بشیر خان نے لاہور میں گزرے ہوئے شب و روز کا

ہو۔ میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ تم بھی چپ ہو جاؤ۔ دیکھتے ہیں کون پہلے بولتا ہے؟“
دونوں اپنے اپنے فون کانوں سے لگائے خاموش ہو گئے۔ ایک دوسرے کے سانسوں کی مدھم سی آواز چکراتی رہی۔ ایک منٹ..... دو..... پھر کئی گزر گئے۔ دونوں خاموش رہے۔ دونوں ہارنا نہیں چاہتے تھے مگر مقابل آئے ہوئے کھلاڑیوں میں سے ایک کو ہارنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی قسمت ساتھ دینے لگتی ہے۔ شانی کی قسمت عروج پر تھی۔ اُس کے پری پیڈ فون میں بیلنس ختم ہو گیا۔ دونوں طرف ٹوں ٹوں کی آواز گونج اُٹھی۔ عالمگیر نے مسکرا کر فون کان سے ہٹایا۔ کال ری بیک کی۔ ریسو ہونے پر مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھا شانی! میں نہیں ہارا، تمہارے دانے ختم ہو گئے۔“

وہ بولی۔ ”تم ہار گئے ہو۔ لیکھوں کے اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ قسمت نے تمہیں بتلایا ہے کہ میرے فون کی طرح میری زندگی کا بیلنس ختم ہو سکتا ہے مگر ضد ٹوٹ نہیں سکتی۔“
وہ بولا۔ ”اور تم بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں ٹوٹنے کے بعد بھی اڑا رہے والا مرد ہوں۔“
شانی خاموش ہو گئی۔ وہ بولا۔ ”اب چپ کیوں لگ گئی؟“
”سوچ رہی ہوں۔“

”کیا؟“
”تمہیں یہاں کئی مرتبہ دیکھا تھا مگر دل کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ کیا ہوا کہ تم لاہور میں آئے اور دل و دماغ پر چھا گئے۔ کیا تم اس کی وضاحت کر سکتے ہو؟“
”ہاں!“ وہ ہنسا۔ ”وہاں تمہاری عقل پر پردے پڑ گئے تھے۔“
وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ بولی۔ ”پاپا اور ماما نے تمہیں کل ڈنر پر بلانے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ ماما تمہیں اچھی طرح دیکھنا بھالنا چاہتی ہیں۔ قربانی کیلئے بکرا ٹٹول ٹٹول کر پسند کرنے کی عادی ہیں ناں!“

وہ خاموش رہا تو بولی۔ ”اہتمام کر کے آنا پلیز!“
وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پھر ٹوں ٹوں کی آواز نے بتلا دیا کہ اُس کا بیلنس بھی اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ مسکرا کر ننھی سی سکرین کو دیکھنے لگا۔ بڑبڑایا۔ ”زندگی کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں۔ کیا سمجھو؟ اُس کے تھکنے کے چند ہی لمحوں کے بعد میں بھی بُجھ جاؤں گا؟ ہائے! کتنا اُٹا چھا ہو گا۔ محبت کے بغیر جینا فضول ہوتا ہے۔ ایسے جینے سے مر جانا بہتر کہلاتا ہے۔“

عالمگیر سہ پہر ڈھلنے پر لوٹ آیا۔ اُسے علم تھا کہ اندھیرے میں نیلے سے ٹکٹا اور دیر عبور کر کے متروک حویلی تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ بزدل آدمی نہیں تھا مگر خواہ مخواہ کے خطرات مول لینے کا روادار نہیں تھا۔ رات حویلی میں قیام کیا۔ لائٹس کی روشن لو پر نظریں جمائے لیٹا رہا۔ دل ہی دل میں ماں کو پکارتا رہا۔ ہر روز آ کر فیختوں کی پٹاریاں کھولنے والی کہیں دور جا کر چھپ گئی تھی۔ بارہا بلانے پر بھی دکھائی نہیں دی تو اُس نے تھک کر کروٹ بدل لی۔ ماں پرانے دور کی عورت تھی، بلانے پر بھی نہیں آئی۔ نئے زمانے کی عورت بن بلائے آن وارد ہوئی۔ ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی شانی کی آواز نے اُسے اپنے طلسم میں جکڑ لیا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں لیٹی ہر کروٹ پر اُسے یاد کر رہی تھی۔ اپنے چاہنے والے کو جتلا رہی تھی۔ ”عالمگیر! یہ کون سا احساس ہے؟ دن کے اُجالے میں ڈرنے والی لڑکی اب رات کے گھور گھپ اندھیرے کو بھی خاطر میں نہیں لارہی۔ کیا دو چار آدمیوں کی موجودگی میں خود کو کسی کے سپرد کر دینے سے کوئی اُلوہی طاقت مل جاتی ہے؟“

وہ بولا۔ ”یہ عجیب سا احساس ہے جو انسان کے رُگ و پے میں ایک پل کے دورانے میں سرایت کر جاتا ہے۔ تم ڈر نہیں رہی ہو۔ میں سو نہیں رہا ہوں۔ پہلے میرا سر ہانہ میرے سر تلے دبا رہتا تھا۔ آج باغی ہو کر سینے سے چمٹا ہوا ہے۔ پہلے تمہیں آزادی سے چھو سکتا تھا، تمہارے ہاتھ سہلا سکتا تھا، تمہاری زلفوں کے بل انگلیوں پر پلیٹ سکتا تھا، تمہیں ہمیشہ کیلئے حاصل کرنے کے بعد چھونے کی اجازت بھی گنوا بیٹھا ہوں۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا اسے محبت کہتے ہیں کہ جو نزدیک ہیں، اُن کی خبر نہیں۔ تم میلوں دور لیٹی ہوئی ہو، دماغ تم پر سے ہٹنے کو تیار نہیں۔“

فون میں جلتنگ بج اُٹھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ لوٹ پوٹ ہونے لگی تو اُس نے ٹوکا۔ ”میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا جو تم یوں احمقوں کی طرح ہنسنے لگ جاؤ۔“
وہ بہ دقت تمام خود پر قابو پاتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بولی۔ ”میں ہنس رہی ہو مگر تم پر نہیں، خود پر۔ تم دنیا پر چھانے والے مرد ہو۔ عالمگیر ہو۔ میں شاہانہ ہوں۔ شاہانہ دنیا پر حکومت کرنے والے کے دل پر حکومت کر رہی ہے۔ کیا یہ خوش ہونے والی بات نہیں ہے؟“
”یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔“
”میری خوش فہمی نہیں، تمہاری غلط فہمی ہے۔“ اُس نے چیلنج کیا۔ ”اگر چاہو تو آ زما سکتے

کھڑکی کی درزوں سے ٹھنڈی ہوا گزر کر چہرے پر ٹھنڈک ثبت کرنے لگی، اُسے تھپک تھپک کر سلانے لگی۔ بڑے دنوں کے بعد اس چارپائی پر، اس کھڑکی کے سامنے، یادوں دوستوں کے درمیان رات گزارنے کیلئے آیا تھا۔

مقدار اپنے کھیل کے بارے میں بیچکی اطلاع نہیں دیتا۔ انسان کو مہرہ بنائے مرضی پر مرضی کرتا چلا جاتا ہے۔ شانی کے کہنے پر اچھی طرح بن سنور کر سردار فضل خان کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوا۔ شہر میں داخل ہونے پر اچانک اُس کے اندر رفیع اللہ سے ملنے کی خواہش سر اٹھانے لگی۔ اُسے یہ خواہش کبھی بھی نہیں رہی تھی مگر اب ہونے لگی تھی۔ شہر کے وسط چوک میں رُک گیا۔ شانی کے گھر کو لے جانے والا راستہ دائیں طرف لیٹا تھا۔ پولیس اسٹیشن پہنچانے والی راہ بائیں طرف کھڑی اُسے بلارہی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ ”ایسا کیوں ہے؟ میں نے کبھی بھی رفیع اللہ سے ملنے کا نہیں سوچا، آج کیوں جی چاہ رہا ہے؟“

مقدار کے سُرور پر دل اپنا راگ الاپنے لگتا ہے تو انسان خرد و سُدھ سے یگانہ ہو جاتا ہے۔ عالمگیر نے بلا مقصد گاڑی تھانے کی طرف بڑھا دیا۔ برآمدے کے قریب کارروک کر اُترا۔ سیڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا کہ اے ایس آئی محمد بخش محرر کے دفتر سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ اُسے تھانے میں دیکھ کر حیرت بھرے انداز میں بولا۔ ”اُوئے عالمگیر! تم اور یہاں؟“ وہ بولا۔ ”میں رفیع اللہ سے ملنے کیلئے آیا ہوں۔ کیا وہ ڈیوٹی پر موجود ہے؟“

محمد بخش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو یہ کہوں گا کہ تم اُس کے سامنے مت آؤ۔ اُس نے تمہارے بارے میں کافی معلومات حاصل کر رکھی ہیں۔“ عالمگیر مسکراتے ہوئے رفیع اللہ کے آفس میں داخل ہو گیا۔ وہ ایک فائل کونے مطالعے میں مصروف تھا۔ چند لمحے دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا پھر رفیع اللہ نے کہا۔ ”تشریف رکھیں۔“

وہ ہاتھ ملا کر کرسی میں بیٹھ گیا۔ بولا۔ ”میرا نام عالمگیر ہے۔ دل میں تم سے ملنے کا اشتیاق تھا، چلا آیا۔ برا لگا ہے تو لوٹ جاتا ہوں۔“

رفیع اللہ نے تصدیق چاہی۔ ”تم سردار فضل خان کے ہاں کام کرتے ہوتا؟“ ”ہاں!“ اُس نے ایک پل کیلئے بھی رفیع اللہ کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔ رفیع اللہ کے چہرے کے تاثرات تھوڑا تغیر پذیر ہوئے، پھر اُس نے خود پر قابو پایا۔

”کہو! کیسے آتا ہوا؟“

”میں نے کہا ناں کہ ملنے کے اشتیاق میں چلا آیا ہوں۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ ”مجھے تم سے کوئی کام نہیں ہے۔“

رفیع اللہ فائل کے اوراق الٹتے پلٹتے لگا۔ عالمگیر نے دیکھا کہ وہ خاصا پریشان تھا۔ پریشانی بادی النظر میں سنجیدگی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بولا۔ ”کیا میرے دوستی کیلئے بڑے ہوئے ہاتھ کو نہیں تھا موگے؟“

رفیع اللہ چند لمحے تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ”عالمگیر! میں نہ تو امیر آدمی ہوں، نہ امیروں کا آلہ کار۔ مجھ سے دوستی کا ٹھہ کر تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔“

وہ خوش لہجے میں بولا۔ ”یہاں اب تک آنے والے تمام تھانیدار بکاؤ مال تھے۔ چارج لینے سے پہلے سردار فضل کی کوٹھی پر حاضری دیتے تھے۔ سردار نے بتایا کہ تم نے ایسا نہیں کیا۔ ہر طرف تمہاری ایمانداری کے قصے سنئے جا رہے ہیں۔ میں بہت کچھ سوچ سمجھ کر تمہارے پاس دوستی کا ہاتھ بڑھانے کیلئے آیا ہوں۔“

رفیع اللہ تنقیدی نظروں سے اُس کا احاطہ کرتا رہا۔ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”دوستی انسانی جذبات کی معراج ہوتی ہے۔ توہین کی جائے تو مَر جاتی ہے۔ خلوص کی آبیاری کا مسلسل اعادہ ہوتا رہے تو اُم ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجرم ہو۔ بڑے بڑے مجرموں کا ارتکاب کر چکے ہو لیکن تمہاری خوش قسمتی یہ ہے کہ تمہارے خلاف کوئی ایف آئی آر تھانے کے ریکارڈ پر نہیں ہے۔ اگر تم یہ وعدہ کرو کہ آئندہ کوئی جرم نہیں کرو گے، لوگوں کے جان و مال پر عاصیانہ نگاہیں نہیں گاڑو گے اور کسی کو تکلیف نہیں دو گے تو ہماری دوستی چلتی رہے گی۔ میں دشمن کی، دوست کی، اجنبی کی..... کسی کی بھی غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر ضمیر کی تسنن ہوئے تار پر قدم جما کر چلنے کی ہمت خود میں پاتے ہو تو دل کم! اگر نہ گڈ بائی!“

”نیل اچھا نہیں، برا ہوں۔ مگر وعدے کی پاسداری کرنا جانتا ہوں۔ تمہارے پاس آنے کا مقصد شاید یہ بھی رہا ہو کہ میں خود کو بدلنا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری طرح مضبوط اور تیرکی انسان بننا چاہتا ہوں۔ اس کام میں تم میری مدد کر سکتے ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ عالمگیر نے کہا۔

منقطع کر لیا تھا اس لئے اسے اپنے رشتہ داروں کا علم نہیں ہے۔“
ایسی باتوں پر عمومی طور پر یقین نہیں کیا جاتا۔ بیٹی کے یقین دلانے پر نہ چاہتے ہوئے
بھی ماں باپ نے اعتماد کر لیا۔ کچھ دیر کی نشست کے بعد سردار فضل اُسے اپنے ساتھ لے کر
لان میں آ گیا۔ اندھیرا پوری طرح ماحول پر چھا چکا تھا۔ لان میں لٹکے ہوئے بلبوں کی
منظر روشنی میں کچھ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یوں جیسے اکھاڑے میں اترنے
کے بعد پہلوان ایک دوسرے کی برداشت کا امتحان لیتے ہیں۔

سردار نے سکوت توڑتے ہوئے سلسلہ کلام کا آغاز کیا۔ ”عالمگیر! تمہیں اپنے بیٹوں کی
طرح پالنا آیا ہوں۔ یہ جتنا نا مجھے قطعاً اچھا نہیں لگتا کہ میں نے تمہیں موت کے گھاٹ
سے بڑی کوششوں سے اتارا ہے اور لاکھوں روپے خرچ کر کے تمہیں علم دین سے عالمگیر
بنایا ہے۔“

وہ سردار کے بوڑھے چہرے پر نظریں گاڑے خاموش بیٹھا رہا۔ سردار نے بات آگے
بڑھائی۔ ”میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ بیٹی، بیوی اور میں۔ بس اتنا سا ہی خاندان ہے۔ میں
چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے خاندان میں شامل کر لوں۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ تمہاری
عادت اور وفاداری بتلاتی ہے کہ تم کسی معمولی خاندان کے چشم و چراغ نہیں ہو بلکہ خاص
ہو۔ خاص لوگوں سے خاص سلوک کیا جاتا ہے۔“

عالمگیر نے سگریٹ سلگایا۔ گہرا کش لیا اور دھواں بلب والے پول کی جانب چھوڑتے
ہوئے آہستگی سے کہا۔ ”سردار! تکلفات کو چھوڑو اور سیدھی سیدھی بات کرو۔ مجھے کیا
کہنا ہے؟“

سردار نے کچھ دیر تک سوچا۔ ہمت اور الفاظ یکجا کئے اور کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ ضمنی
انتخابات میں حصہ لے کر تم اسمبلی کے ممبر منتخب ہو جاؤ اور میں تمہیں اپنا بیٹا بنالوں۔ کسی کو
اپنانے کیلئے بہت کچھ دینا پڑتا ہے۔ میرا سب کچھ شاہانہ بی بی ہے۔ میری دولت، جائیداد
اور کروڑوں کا بینک بیلنس اُسی کا ہے۔ اُسے تمہارے حوالے کر کے میں تہی دست ہو جاؤں
اگر نہیں..... میں ایک بیٹے کا باپ بن جاؤں گا۔“

عالمگیر نے دل ہی دل میں اُس پر طنز کیا۔ ”بڈھے فرعون! تجھے پتہ ہی نہیں کہ تم لاکھوں
”پہنچ کر کے چھانی گھاٹ سے چھڑا کر جسے لائے ہو وہ تمہاری زندگی نہیں، تمہاری

دونوں نے پر جوش انداز میں ہاتھ ملایا۔ فون نمبروں کا تبادلہ کیا اور چائے پی کر جدا
ہو گئے۔ عالمگیر کو وہ بہت اچھا انسان دکھائی دیا۔ اُس کی سختی اور قانون پسندی کے بارے
میں جو کچھ سُن رکھا تھا، وہ سچ محسوس ہوا۔ محمد بخش نے اُسے بتایا۔ ”اس دور میں ایسے ایچ او
کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود جس آدمی کے گھر میں ٹی وی نہ ہو، فریج، کُٹھی، کار کچھ
بھی نہ ہو تو وہ اس عہد کا ولی اللہ کہلانے کا حقدار ہوتا ہے۔ رفیع اللہ بھی ایسا ہی ہے۔ بھری
دنیا میں اُس کی دو بیگمیں زمین تک نہیں ہے۔ بیٹے کو سکول چھوڑنے کیلئے پیدل جاتا ہے۔ کبھی
سرکاری گاڑی استعمال نہیں کرتا۔“

محمد بخش نے رفیع اللہ کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتایا۔ بے دھیانی میں اپنا اور اُس
کا موازنہ کرتے ہوئے سردار کی کُٹھی پر پہنچا۔ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے لیٹ ہو چکا تھا۔ شانی نے
اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ”پہلے ہی دہائی ماما کو دو گھنٹوں کے انتظار کی کوفت میں مبتلا کر چکے ہو۔“
وہ کندھے اُچکا کر بولا۔ ”کوئی بات نہیں۔ میں تمہاری ماما سے معذرت کر لوں گا۔“

وہ بولی۔ ”وہ صرف میری ہی نہیں، اب تمہاری بھی ماما ہیں۔“
”میں تمہارا حکم مان لوں گا مگر اُس وقت جب تمہاری ماما کو پتہ چل جائے گا کہ میں
واقعی اُس کا بیٹا ہوں۔“

وہ پہلی بار ماما سے نہیں مل رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ سردار نے اُسے شانی
کی ماں سے ملوایا تھا۔ محبت آمیز رویے کے باوجود عالمگیر اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔ پسند تو وہ
پہلے شانی کو بھی نہیں کرتا تھا۔

سردار فضل اور اُس کی بیوی بڑے تپاک سے ملے۔ اُسے ڈائننگ روم تک لائے۔
کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ کھانے کے دوران شانی کی ماما نے اُس سے بہت سارے
سوالات کئے۔ باتوں کا بہاؤ ظاہر کرتا تھا کہ وہ عالمگیر سے جو گفتگو نہیں، بلکہ ہونیوالے داماد
کو جانچ رہی ہے۔ پوچھنے لگی۔ ”مجھے سردار صاحب نے بتایا ہے کہ تمہارے ماں باپ فوت
ہو چکے ہیں۔ بہن بھائی کوئی نہیں ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ تم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔“
وہ بولا۔ ”میں کسی سے نہیں، اپنے آپ سے تعلق رکھتا ہوں، اپنی ماں سے تعلق رکھتا
ہوں۔ وہ آپ لوگوں کے نقطہ نظر سے کمین ذات کی عورت تھی۔“

شانی بولی۔ ”ماما! دراصل بات یہ ہے کہ عالمگیر کی ماں نے تمام رشتہ داروں سے تعلق

موت ہے۔ تم مجھے کیا دے سکتے ہو، تم تو خود کوڑی کوڑی کے محتاج ہونے والے ہو۔ میں شاہانہ کا شوہر بن چکا ہوں مگر تم کبھی بیٹے کا باپ نہیں بن سکو گے۔

بظاہر سنجیدگی سے بولا۔ ”کیا شاہانہ بی بی مجھ سے شادی پر رضامند ہے؟“

”ہاں! اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے ساتھ مطمئن اور آسودہ حال زندگی بسر کرے گی۔ تم دونوں میری نگاہوں کے سامنے رہو گے۔ اس لئے میں بھی پرسکون رہوں گا۔ بی بی کی طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں رہے گی۔“

وہ شادی پر رضامند ہو گیا مگر سیاست میں حصہ لینے سے کتراتا رہا۔ سردار نے اسے بہتیرا سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ آخر کار سردار کو تھکایا ڈالنا پڑے۔ بولا۔ ”میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ نہ جانے تم سیاست سے اتنے الگ کیوں ہو؟ سیاست اقتدار بخش شغل ہے۔ اقتدار نہ ختم ہونے والا نشہ ہے۔ ایک بار منہ سے لگ جائے تو عمر بھر ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔“

وہ ہنسا۔ ”اسی لئے تو میں اس بوتل کو کھول کر منہ سے لگانے سے گریزاں ہوں۔“ گفتگو تمام ہو چکی تھی۔ سردار نے اسے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم چاہو تو یہ خوشخبری دونوں ماں بیٹیوں کو سناسکتے ہو۔“

وہ اٹھا اور اندرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ سیڑھیوں تک پہنچا ہی تھا کہ سردار کے فون کا بزر بولنے لگا۔ وہ رُک گیا۔ سردار نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد بولا۔ ”نمبر وہی ہے مگر تم وہی نہیں ہو۔ تم کون ہو؟“

پلٹ کر عالمگیر کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی جانب متوجہ پا کر ہاتھ کے اشارے سے بلانے لگا۔ وہ تیز قدم اٹھاتے ہوئے قریب پہنچا۔ سردار نے فون کا دائرہ پیکر آن کر دیا۔ آواز ابھری۔ ”تم خاموش کیوں ہو سردار فضل خان! میں نے تمہیں کہا ہے کہ تمہیں کال کرنے والا اب دنیا میں نہیں رہا۔ مر گیا ہے۔ اس کی جگہ پر داؤد سبحانی نے مجھے تعینات کیا ہے۔ سمجھے یا نہیں؟“

سردار نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم بھی تھرڈ مین ہو؟“

”ہاں..... تھرڈ مین کسی کا نام نہیں ہوتا۔ یہ عارضی عہدہ ہے۔ سیٹھ سبحانی کا جس پر دل آئے، اسے یہ عہدہ نواز دیتا ہے۔“

”جو کہنا چاہتے ہو جلدی سے کہہ دو۔ میں مصروف ہوں۔“ سردار نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”تمہاری مصروفیت کی ایسی کی تیس.....“ تھرڈ مین کا لہجہ خاصا غضب ناک ہو گیا۔ جڑتے ہوئے بولا۔ ”میرے ساتھ بات کرتے ہوئے احتیاط برتا کرو ورنہ میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔“

عالمگیر خود پر قابو نہ پاسکا۔ چیخ کر بولا۔ ”کتے کے پلے! ہوش میں رہ کر بات کرو۔ میں تمہارے جیسوں سے نہ بننا بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔“

دوسری طرف سے استہزائیہ انداز میں کہا گیا۔ ”ویل ڈن مسٹر عالمگیر! تم بہت اونچا اڑنے لگے ہو۔ کیا سمجھتے ہو کہ مس شاہانہ کے کندھوں پر بیٹھ کر ہمارے قد کے برابر بلند ہو گئے ہو۔ بھول ہے تمہاری۔“

عالمگیر کا چہرہ لال بھوکا ہو گیا۔ اس کے جواب دینے سے قبل ہی سردار فضل خان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے فون میں کہا۔ ”فضول باتیں نہ کرو۔ جو سبحانی کہتا ہے، وہ بتاؤ۔“

”اپنے کتے کو پٹہ ڈال کر رکھو۔ سیٹھ چند دن قبل تک تمہارے اور بڑی سرکار کے بنائے گئے شاہکار کو دیکھتا رہا۔ اب وہ تمہاری بیٹی کے لہراتے جواں اعضاء کے رقص کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا ہے۔ تم بڑے عزت دار بننے ہو۔ وضع دار بننے ہو۔ تمہاری بیٹی یہاں کیا کچھ کرتی رہی ہے، دیکھو گے تو اپنے دانتوں سے اپنی انگلیاں کاٹ پھینکو گے۔ کہو! کب اور کہاں فلم پہنچاؤں؟“

یوں لگتا تھا جیسے سردار پر فوج لگ گیا ہو۔ اس کے بدن سے تمام لہو نچر گیا ہو۔ عالمگیر غور سے سردار کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اٹھ کر سنبھالتے ہوئے تھرڈ مین سے مخاطب ہوا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم لوگ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے نہایت گھٹیا حرکتیں بھی کر سکتے ہو مگر داؤد سبحانی سے مجھے یہ توقع بہر حال نہیں تھی۔ تم وہ فلم اپنے پاس ہی رکھو۔ صرف اپنا مطالبہ پیش کرو۔ ماننے کا ہوا تو مان لیا جائے گا ورنہ میدان سجا کر ایک دوسرے کے بازوؤں کی قوت کا امتحان لیں گے۔“

تھرڈ مین کا فلک شکاف قہقہہ بلند ہوا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔ عالمگیر نے سردار کو دیکھا اور

دل ہی دل میں بشیر خان کو داد دینے لگا۔ اُس نے اپنا لہجہ اس خوبصورتی سے بدلا تھا کہ عالمگیر سے بھی پہچانا نہیں گیا۔

سردار لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ وہ شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے بولا۔ ”سردار! اپنے آپ کو سنبھالو۔ یہ احمقوں کی طرح آنکھیں بند کرنے کا وقت نہیں، کچھ کر گزرنے کا لمحہ ہے۔ یہ نہ ہو کہ ہمیں تمام عمر پچھتانا پڑ جائے۔“

سردار کے حلق سے شکست خوردہ آواز برآمد ہوئی۔ ”میری بیٹی ایسی نہیں ہو سکتی۔“

میری بیٹی ایسی نہیں ہو سکتی.....“

وہ بولا۔ ”وہ واقعی ایسی نہیں ہے سردار! تم خود پر کنٹرول کرو۔ میں جانتا ہوں کہ وہ معصوم ہے۔ میرے جانے سے پہلے اُس پر قیامت ٹوٹ چکی تھی اور دوسری قیامت یہ ڈھائی گئی کہ مرتے ہوئے ہر لمحے کو کسیرے کی آنکھ میں محفوظ کر لیا گیا۔ میں جب لاہور پہنچا تو اپنے داغدار دامن پر روتے ہوئے خودکشی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ تو میں نے اُسے زندہ رہنے کا حوصلہ دیا اور سمجھایا کہ جو تم نے نہیں کیا، اُسے تمہارے نامہ اعمال میں درج نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی تمہیں ناکردہ گناہ کی پاداش میں اپنی جان گوانے کی کوئی ضرورت ہے۔“

سردار نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا؟..... سوچنے لگا۔ ”شاید میرے سننے میں کوئی غلطی ہے؟“

بولا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو عالمگیر؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سردار!“ عالمگیر نے اُس کی جانب پیٹھ کر لی۔ وہ بیٹی کے اجڑنے کی داستان سناتے ہوئے دل گرفتہ باپ کی نگاہوں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ بولا۔ ”بم دھماکے کی جھگڈ میں تمہاری بیٹی کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ اُسے کوئی ایسی ادویات دی گئیں کہ وہ ذہنی طور پر ماؤف ہو گئی۔ اُس کی بہکی ہوئی حرکات و سکنات کو اُن اوباش لوگوں نے محفوظ کر لیا۔ فلم کی کاپی انہوں نے شانی بی بی کو بھیجی تھی۔ اُس کا تعاقب کوئی نہیں کرتا تھا، اُس فلم میں چھپی ہوئی موت اُس کے ارد گرد رہ کر ڈراتی رہتی تھی۔ اسی پریشانی میں اُس نے مجھے لاہور بلوایا تھا۔ میں نے اُن لوگوں کو دوبارہ اُس کے قریب نہیں جانے دیا مگر پھر ایک قیامت پر تو لے لگی۔ ہمیں پتہ چلا کہ گناہ کے غلیظ بچے تمہاری بیٹی کے پیٹ کے اندر

بی بی چھپ چکے ہیں۔ ہمیں ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑا۔ یہ لمبی داستان ہے، نہ سنو تو بہتر ہے۔ ہمارے لئے بھی بہتر ہوگا کہ تم اُن کے مطالبے ماننے رہو اور ٹالتے رہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

سردار کی ہمت جواب دے گئی۔ ایک ٹک عالمگیر کو دیکھتا رہا۔ ہزاروں لوگوں کے ماننے سچ پر چڑھ کر کھلے جھوٹ بولتے ہوئے کبھی اُس کی زبان لڑکھڑائی نہیں تھی۔ اپنے زرخیز کے آگے سر جھک گیا۔ زبان نے ساتھ چھوڑ دیا۔ کراہا۔ ”پپ..... پانی..... مجھے پانی پلاؤ۔“

وہ بھاگ کر اندر گیا۔ پانی کا گلاس اٹھائے باہر آیا۔ سردار نے لرزتے ہاتھوں سے گلاس اٹھا۔ ہونٹوں سے لگانے لگا تو گرفت کمزور پڑ گئی۔ گلاس الٹ گیا۔ گردن اور سینہ تر بہ تر ہو گیا۔ جلدی سے اٹھا۔ پھر جتنی تیزی سے اٹھا تھا، لہرا کر اتنی ہی تیزی سے کرسی میں گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اُسے..... وہ شانی بی بی کو..... نہیں مانی کو بلاؤ۔“

وہ شانی کو بلا لیا۔ اُسے راستے میں صورت حال سے مختصر آگاہ کر چکا تھا۔ سہی سہی گاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ”خود پر قابو پاؤ اور فیس کرنے کی کوشش کرو۔ ایک نہ ایک دن تو یہ ہوتا ہی تھا۔ فلم بنانے والوں نے دیکھنے کیلئے نہیں بنائی تھی۔ چلو شاباش! میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

ادوں کو نظروں کے سامنے برابر کھڑے دیکھ کر سردار چیخا۔ ”شانی! یہ تم نے کیا کر دیا؟ میری عمر بھر کی بی بی ہوئی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔“

وہ زمین پر نظریں گاڑے خاموش کھڑی تھی۔ سردار اٹھا۔ اُس کے مقابل آن کر کھڑا ہو گیا۔ ہنپائی انداز میں بولا۔ ”تم خاموش ہو۔ تمہاری خاموشی جرم کا اعتراف کر رہی ہے۔“

وہ پھر بھی سر جھکائے خاموش کھڑی رہی تو سردار کا ہاتھ اٹھ گیا۔ ہاتھ طمانچہ بن کر شانی کے رخسار پر لگنے سے پہلے عالمگیر کی گرفت میں آ گیا۔ عالمگیر نے کہا۔ ”جوان بیٹی پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ کولات مارنے کے برابر ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ شانی کو اغوا کیا گیا تھا۔ اس سلسلے کے بارے میں شانی کا کوئی کردار نہیں۔ اُس کی جگہ پر میں یا تم ہوتے تو کیا کر لیتے؟ خود کو سنبھالو سردار!“

موجوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ میں شانی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“
سردار کی آنکھیں پھیل گئیں۔ شانی بولی۔ ”پاپا! خود کو سنبھالیں۔ آپ ہیں تو سب کچھ ہے۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔“

”کچھ باقی رہا ہی نہیں تو غم کیسا؟“ سردار نے کہا۔ وہ باتوں باتوں میں خاصا سنبھل چکا تھا۔ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھا سوچتا رہا پھر گلا کھنکار کر بولا۔ ”آج کیا تاریخ ہے؟“
بیوی نے جھٹ سے کہا۔ ”تاریخ کا پتہ نہیں، دن کا پتہ ہے۔ آج سوموار ہے۔“
بولا۔ ”یہی کافی ہے۔ تاریخ کا پتہ کرلو۔ آنے والے سوموار کو شانی اور عالمگیر کی دھوم دھام سے شادی ہو رہی ہے۔ تم جو کرنا چاہتی ہو، کرلو۔“

تینوں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عالمگیر بولا۔
”سردار! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟“
وہ بولا۔ ”تاخیر کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہم ایک دن میں جیڑ تیار کر سکتے ہیں۔ ایک دن میں بارات کی تیاری کر سکتے ہیں۔“
وہ بولا۔ ”پھر بھی!“

سردار نے ہاتھ اٹھایا۔ ہاتھ کو پورا کھول کر پنجہ بناتے ہوئے بولا۔ ”کہہ دیا ناں! اگلے سوموار کو شادی ہوگی۔ بس!“

بیٹی اور بیوی رونے لگیں۔ جھڑک کر بولا۔ ”کوئی مر گیا ہے کیا؟“
بیٹی باپ سے دیوانہ وار چٹ گئی۔ ”پاپا! ایسے تو مرنے والے کو گھر سے نکالا جاتا ہے۔ زمین بُد کرنے میں جلدی دکھائی جاتی ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میری شادی کی نہیں، مجھے دُکھ کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔“

باپ نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ دو آنسو رخساروں پر لڑھک آئے۔ پیشانی کو چومتے ہوئے بولا۔ ”تم عالمگیر کو پسند کرتی ہو۔ وہ تمہیں چاہتا ہے۔ مجھے تم دونوں کی خوشیاں عزیز ہیں۔ آنے والے وقت سے پنجہ آزمائی کرنے کیلئے تمہیں ایک ہونا پڑے گا۔ ایک کرنے کیلئے میں نے ہنگامی طور پر یہ فیصلہ کیا ہے۔“

اُس کے فیصلے پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ سردار نے کہا۔ ”اب تم اپنے اپنے کاموں سے نرا زما ہو جاؤ اور مجھے تنہائی دے دو۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ پھر عالمگیر کی

وہ سنبھل نہ سکا اور گھاس پر گر گیا۔ دونوں نے مل کر اُسے سہارا دے کر اٹھایا اور کمرے میں لے گئے۔ ڈاکٹر کو فون کیا گیا۔ میچا کے آنے سے پہلے ہی وہ اچانک شانت ہو کر سو گیا۔ عالمگیر نے نبض اور دھڑکن چیک کی اور شانی کو تسلی دینے کے انداز میں بولا۔ ”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ صدمے سے بے ہوش ہوا ہے۔ ڈاکٹر دو اکیس دے گا تو بھلا چکا ہو جائے گا۔“

وہ اپنے بے ہوش باپ کے پیروں سے لپٹ کر رونے لگی۔ دل میں سوچنے لگی۔ ”کہتا اچھا ہے عالمگیر! اگر یہ نہ ہوتا تو پاپا مجھے جان سے مار دیتے۔ میرے لئے تو اُن کا ایک تپڑ ہی کافی ہوتا۔ سچ کہتا تھا کہ میری طرف آنے والی ہر پریشانی کو سنبھال لے گا۔ میری پریشانیوں کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی سنبھالنا پڑ رہا ہے۔“

ماما چیٹی چلاتی آندھی کی طرح کمرے میں وارد ہوئی۔ دونوں سے استفسار کرنے لگی۔ عالمگیر نے اُسے تمام رام کہانی سنا ڈالی۔ روز روز مرنے سے کہیں بہتر ایک ہی بار مر جانا ہوتا ہے۔ ماما کے دل کو جو نبی تسلی ہوئی کہ اُس کے سر کا تاج بخیریت ہے تو وہ شانی پر بھوک شیرنی کی طرح جھپٹ پڑی۔ اُس کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ روتی سسکتی پر طمانچوں کی برکھا برسانے لگی تو عالمگیر کو ڈھال بننا پڑا۔ چند ہی لمحوں میں اُس نے شانی کا چہرہ بُری طرح مسخ کر ڈالا تھا۔ ڈاکٹر کو ایک کی بجائے دو بے ہوشوں کو سُنَدھ بخشا پڑی۔

سردار کو ہوش آیا تو دیوانوں کی طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے تینوں کو باری باری دیکھنے لگا۔ بیوی سفید بالوں میں جھریوں بھری انگلیاں لہراتے ہوئے تسلی دینے لگی۔ خود کو اور اپنے بطن سے جسی بیٹی کو کو سننے لگی۔ وہ سنی ان سنی کرتا جا رہا تھا۔ جھنجھوڑے جانے پر بولا۔ ”میں وہ نہیں رہا، کوئی اور بن گیا ہوں۔ میرا نصیب میرا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔“

خالی خالی نظروں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ لہرا کر بولا۔ ”عالمگیر کہتا ہے کہ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اُس کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور میرا ہے۔ آگ لگانے والے کی انگلیاں ایک نہ ایک دن ضرور جھلس جاتی ہیں۔“ عالمگیر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”عالمگیر! کیا تم ایسی حالت میں بھی اس بے وقوف سے شادی کرنے پر تیار ہو؟“

وہ بیڈ پر سردار کی ٹانگوں کے پاس سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ آہستگی سے بولا۔ ”میں ہی ایسا شخص ہوں جو اس کی بے گناہی سے پوری طرح واقف ہوں۔ میں اسے سچ منجھتا ہوں۔“

ایک دن مٹھی میں ذبی ریت کی طرح سرکتے گئے۔ اتوار کی شام کو سردار اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا جیتے ماہ و سال کا احاطہ کر رہا تھا۔ گھر میں ڈھولک کی آوازیں بھری ہوئی تھیں۔ شور و غوغا..... ہلو بازی..... بعض اوقات تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دور پار کے رشتہ دار اکٹھے ہو چکے تھے۔ اقتدار کے دنوں کے تمام احباب اپنی فیملیوں سمیت آچکے تھے۔ وہ کبھی مسکرانے لگتا، کبھی دل ہول کھانے لگتا۔ ایسے میں اُس کے فون کا بزر ہوا۔ روشن سکرین پر دیکھا تو یکبارگی سے چہرہ تاریک ہو گیا۔ تھرڈ مین رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نفرت اور بے بسی کے ملے جلے انداز میں بولا۔ ”ہاں سن رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟“

تھرڈ مین کی آواز سنائی دی۔ ”تم پرانے سیاسی آدمی ہو۔ بساط پر پہلو بدل بدل کر پائیل چلتے رہتے ہو۔ ریس کورس میں ایک گھوڑے کے پٹ جانے پر دوسرا میدان میں اُتار لیتے ہو۔ بیٹی کے دامن پر لگے داغ کو دھونے کیلئے تم نے فوری طور پر دھوبی کا بندوبست کر لیا۔ واہ کیا کہنے!“

وہ ہیزاری سے بولا۔ ”تو تمہیں پتہ چل گیا۔ تمہیں یہ بھی پتہ ہوگا کہ اس وقت میں کتنا صرف ہوں۔ جو کہنا ہے، جلدی سے کہو اور جان چھوڑو۔“

”اوکے مسٹر فضل خان!“ تھرڈ مین نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”داؤد کہانی کے پیغام کو تم تک پہنچانے کیلئے فون کر رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ اس سوموار کو تم بیٹی کی ٹائی کر رہے ہو۔ تم پر احسان کرتے ہوئے ہم اس سوموار کیلئے جاری کئے جانے والے حکم کو اگلے سوموار پر ٹال دیتے ہیں۔ اگلے سوموار تک تم موت کو اپنے ہاتھوں گلے لگا لو۔ اگر تم ٹوٹ کر نہیں کرو گے تو تمہیں قسطوں میں قتل کر دیا جائے گا۔ پہلی قسط میں تمہیں عدالت میں لے دیا جائے گا۔ دوسری قسط میں تمہیں قتل کے الزام میں تھانے پہنچایا جائے گا۔ اسی طرح آپرٹنگ اہلک امجد کا غصے سے لبریز جام اُتار دیا جائے گا۔ آخر پر تمہاری بیٹی کے بدن کو پورے لٹکا دیا، پوری دنیا میں تمہارے حوالے سے نشر کر دیا جائے گا۔ اگر تم پھر بھی چلو میں پانی بھر کر بے غیرونی کی موت نہیں مرو گے تو تمہیں اندھی گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔“

اُس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”اُس ٹیٹ، داؤد سبحانی کو مجھ سے دشمنی کیا ہے آخر؟“

طرف بالخصوص متوجہ ہو کر بولا۔ ”شادی کے اہتمام میں کسی قسم کی کمی قابل برداشت نہیں ہوگی۔ ویسب کے تمام معززین کو دعوت دو۔ جشن کا انتظام کرو۔“

تینوں کمرے سے باہر نکلے۔ ماما دونوں پر خفا سی نگاہ ڈال کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دونوں کاریڈور میں کھڑے رہے۔ اطراف میں کسی کو نہ پا کر عالمگیر سے لپٹ کر سسکے گی۔ ”میں نے تمہارا ساتھ خدا سے مانگا تھا مگر نہیں جانتی تھی کہ تمہیں پانے کی تفتی بڑی قیمت چکانا پڑے گی۔ ہائے میرے عالمگیر! میں نہ ادھر کی رہی، نہ ادھر کی۔ میں نے کچھ نہیں کیا مگر سب لوگوں کی نظروں میں اپنے لئے طنز اور اہانت دیکھ کر جل کر کوئلہ ہو جاتی ہوں۔ کیا کل تم بھی ایسے ہی آنکھیں پھیر لو گے؟“

کورٹ میں پڑھائے جانے والے نکاح سے پہلے سوچا کرتا تھا کہ باپ کے بعد ماں بیٹی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ دونوں کو سسکا سسکا کر مارے گا۔ نکاح کے بعد اُس کی سوچ نے انقلابی انگڑائی لیتے ہوئے اُس کے ارادوں پر مٹی کا گاڑا حلیہ پھیر دیا تھا۔ سینے سے لگ کر روئی ہوئی کمزور جان کو دلا سہ دینے لگا۔ ”تمہیں میری جان! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ مجھے صرف چند دن درکار ہیں۔ پھر دنیا کا کوئی شخص تمہاری طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ تمہارے پاپا اور ماما بھی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ مجھ پر یقین رکھو۔“

”یقین ہی تو زندہ رکھے ہوئے ہے ورنہ میرے اندر بچا ہی کیا ہے؟“ وہ سسکی۔

عقب میں آہٹ ہوئی۔ عالمگیر نے گردن موڑ کر دیکھا۔ کھلے دروازے میں سردار شکست خوردہ انداز میں کھڑا دونوں کو گھور رہا تھا۔ عالمگیر نے گھبرا کر شانی کو خود سے الگ کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔ سردار نے رخ پھیر لیا اور کہا۔ ”شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں مگر یہ بوڑھی آنکھیں سوموار تک دنیا کو دیکھتے رہنا چاہتی ہیں۔ احتیاط کرو۔“

دونوں سر جھکائے سردار کے کمرے سے دور ہو گئے۔ روایات جاگ اُٹھیں۔ شانی کو سات پردوں میں چھپا دیا گیا۔ چاہنے والا انتظام انصرام میں جُٹ گیا۔ آسان دکھائی دینے والا کام نہایت مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ ایک ہفتے میں اتنی بڑی تقریب کی تیاری ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے مترادف تھی۔ اُس نے متروک حویلی سے تمام کارندوں کو بلا لیا تھا۔ نیلے سے بشیر خان اور بشیر علی بھی پہنچ گئے تھے۔

چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے گھونگھٹ اٹھائے اور آنکھوں میں جھانک کر دل کی دنیا تہہ بالا کر دے۔ کچھ دیر گزر گئی تو بے قرار ہونے لگی۔ ”ہائے اللہ! پردہ ہٹا کیوں نہیں؟ چاند کو دیکھنے والے کی آنکھیں بند کیوں ہیں؟ ہاتھ بندھے ہوئے کیوں ہیں؟ اگر وہ مجھے دیکھنے کیلئے بے قرار نہیں ہے تو مجھے ہی گھونگھٹ کو پرے پھینک کر دیدار کا جام پی لینا چاہیے۔“

ہاتھوں میں ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی۔ لاج نے ہاتھ پکڑ لیا۔ شرما کر سوچنے لگی۔ ”چاند بدلیوں کی اوٹ سے خود نہیں نکلتا، نکال کر دیکھا جاتا ہے۔ میں اپنے ہاتھوں سے پردہ کیوں ہٹاؤں؟ جسے دیکھنے کی طلب ہوگی، وہ خود ہی بدلیوں کو ہٹا دے گا۔“

مانگیر کہنی کے بل اُس کے گھٹنوں کے پاس لیٹا ہوا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اُس نے سر اٹھایا۔ بڑے سے کھگھرے میں اُس کے وجود کو تلاش کرنے کیلئے کھوجتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ ہاتھ کی حرکت سے اُس کے مقام کا پتہ چلا تو اُس نے جھٹ سے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ڈر سی گئی۔ ”ہائے! یہ کیا کر رہا ہے؟“

ڈر کی عمر سٹ گئی۔ جب چاہنے والا دیوانہ وار اُس کی کلائی کے تل کو چومنے لگا تو وہ بے خود اور سرشار سی ہو کر اُس پر کئے ہوئے شہتیر کی مانند ڈھسے گئی۔ ایسے میں اچانک بجلی چلی گئی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ بجلی غیر متوقع طور پر گئی تھی اس لئے کوئی متبادل بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔

کون گھونگھٹ اٹھاتا ہے؟ کون اپنا آپ دکھاتا ہے؟ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ان باتوں کا پتہ نہیں چلتا۔ دیوانہ کہہ رہا تھا۔ ”ابھی تو چاند بدلیوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ آج بھلک نے زمانے کی روشنیوں کو شرما کر چھپ جانے پر مجبور کر دیا۔ اگر پورا چاند نکل آتا تو کیا ہو جاتا؟ شاید سب کچھ ہی خاکستر ہو جاتا۔“

شانی کی خسار آلود آواز ابھری۔ ”کیا تم بھی؟“

”اِس نار بھری ناری کے سامنے میری اوقات ہی کیا ہے؟“

عروذی ملبوس کی سرسراہٹ ساز بن گئی۔ دھڑکنیں سر بن کر پورے کمرے کو دھڑکانے لگیں۔ دو تیشہ کام وجود گیت کی لے پر رقصاں ہو گئے۔

شب کے پچھلے پہر میں بجلی آ گئی۔ یوں لگا جیسے زندگی کے کھلونے کا بیٹن دبا دیا گیا ہو۔ لگا آنے پر آٹو میک وائر پمپ چل پڑا۔ اُس میں کوئی فنی خرابی تھی جس کی وجہ سے کافی

”اتوار کے دن، تمہاری خودکشی سے ایک دن پہلے، تمہیں دشمنی کی وجہ بھی بتلا دی جائے گی۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ تم بغیر وجہ جانے دنیا سے رخصت ہو جاؤ۔“ تھڑدھین نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ کافی دیر تک خالی خالی نگاہوں سے موبائل ہاتھ میں تھامے دیکھتا رہا۔ موبائل کی سکرین چند سیکنڈوں کے بعد بجھ گئی مگر سردار کی نظریں سکرین میں نظر آنے والی بھیا تک موت کو دیکھ سکتی تھیں۔

گزشتہ ماہ میں اُس نے بارہا سوچا تھا کہ انڈر ورلڈ کے داؤد سبحانی کو اُس سے کیا ملکہ پیدا ہو گیا تھا حالانکہ وہ اُسے جانتا ہی نہیں تھا۔ آج تک اُس سے ملاقات یا تعارف نہیں ہوا تھا۔ بیٹھے بیٹھے مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ جان بچانے کیلئے منت ساجت کا ارادہ کر کے قزوین کا نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ فون آف تھا۔ ناکامی پر بھنبھلا گیا۔ سر تمام کر بیٹھا۔ بے بسی پریشانی پر مستزاد تھی۔ کبھی موت کو یاد نہیں کیا تھا۔ جو یاد نہ آئے وہ پریشان بھی نہیں کرتا۔ پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ زندگی کتنی پیاری شے ہے۔ پھر سوچنے لگا۔ ”میں کتنا قسمت ہوں۔ جان بچا سکتا ہوں مگر بچانے کے چکر میں اپنی اور اپنی بیٹی کی عزت کو بیچ چکا ہے برہنہ کر بیٹھوں گا۔ شاید زندہ پھر بھی نہ رہ سکوں۔ جو اتنا کچھ کر سکتے ہیں، وہ ایک گولی بھی چلا سکتے ہیں۔ گولی اندھی ہوتی ہے۔ اندھے کو کیا پتہ کہ وہ کس سے ٹکرانے لگا ہے۔“

عقب میں سمندر، سامنے جنگل..... داؤد سبحانی نے زندگی میں پہلی مرتبہ اُس پر زندگی تنگ کر دی تھی۔ موت بذات خود گلا تنگ کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ کونٹھی میں گونجنے والی ڈھولک کی تھاپ بھی خال خال سنائی دیتی تھی۔ سکت نہ رہی تو بے دم سا ہو کر بیڈ میں گر گیا۔

اُن کا نکاح عدالت نے پڑھا دیا تھا۔ نکاح پر نکاح نہیں پڑھایا جاسکتا مگر بوڑھا قاضی لوگوں کو دکھانے کیلئے رجسٹر کے پرت پر پرت کالے کر رہا تھا۔ شریعت کی لاشی سے دونوں کو تین تین مرتبہ ہانک کر عشق کی چراگاہ تک لے گیا۔ مبارک باد کی صدائیں، برتنوں کی جھنجھار، بچپن کا شور و غل..... شام تک سب کچھ ماند پڑ گیا۔ کونٹھی کے گیٹ پر فری لاگ بھر گئی کاروں کی لمبی لائن غائب ہو گئی تو وہ دلہا کا مخصوص لباس پہنے اپنی رانی کے قرب میں آ کر گر سا گیا۔

دیکھی بھالی دہن تھی۔ دلہے نے بارہا مرتبہ چھو کر، چوم کر اور جھوم کر دیکھ رکھا تھا مگر بیا

وہ ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔ ”ناں بابا! تم جھوٹے نہیں ہو۔ بس کبھی کبھار اپنی بیوی کے سامنے جھوٹ بولنے کا شوق پورا کرتے ہو۔ یہ کوئی خاص بری بات بھی نہیں۔“

”میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے؟“ اُس کا غصہ بڑھ رہا تھا۔
وہ آنکھیں آدمی میچ کر اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ بولی۔ ”پچھلی باتوں کو چھوڑو۔ میں نئے سوال کرتی ہوں۔ تم نئے جھوٹ بولو۔“
وہ کہنیوں کے بل کھسک کر تھوڑا اونچا ہو کر اُسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ بولا۔ ”چلو! اپنا شوق پورا کرلو۔“

وہ بولی۔ ”میرے مرحوم چچا کا نام محمد خان تھا۔ تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟“
وہ چونک پڑا۔ دل پر گھونسا لگا۔ استعجاب آمیز لہجے میں بولا۔ ”کیا مطلب؟ یہ کیا سوال ہوا؟“

وہ جڑانے کے سے انداز میں بولی۔ ”تم اتنے بھی بے وقوف نہیں ہو کہ میرے سوال کو سمجھ ہی نہ سکو۔“

وہ طوعاً و کرہاً بولا۔ ”جب میرا نام علم دین تھا، تب میرے باپ کا نام بھی محمد خان تھا۔ جب مجھے عالمگیر بنا دیا گیا تو میرے باپ کا نام بدل گیا۔ اب اُس کا نام جہانگیر ہے۔“
وہ بولی۔ ”میری چاچی کا نام رضیہ تھا جسے گھر والے پیار سے رجو کہتے تھے۔ تمہاری ماں کا نام کیا ہے؟ علم دین کی ماں کا نام بتانا، عالمگیر کی ماں سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔“
وہ اٹھ کر اسے پریشانی کے عالم میں دیکھنے لگا۔ بولا۔ ”تم کھل کر بات کرو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”میں تمہاری بیوی ہوں۔ مجھے حق حاصل ہے کہ میں اپنے مرحوم سرور ساس کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ صبح مجھ سے ملنے جلنے والیوں نے بہت سی باتیں پوچھنی ہیں۔ جانتی ہوں گی تو بتا دوں گی۔ لاعلمی کی صورت میں جھوٹ پر جھوٹ بولتی رہوں گی۔ جھوٹ ایک نہ ایک دن چاشنی کھو بیٹھتا ہے۔“

وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ”مگر تم مجھ سے میرے ماں باپ کے بارے میں پوچھتے ہو؟ اپنے چچا چچی کا تذکرہ کیوں کرتی ہو؟“

زیادہ آواز پیدا کرتا تھا۔ رات کے سکوت میں پپ کی ڈراؤنی آواز نے دونوں کو چکا دیا۔ دونوں نے آنکھیں مل کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ شانی شرما کر ہنسنے لگی۔ وہ جی جان سے غار ہوتے ہوئے بولا۔ ”آئی لو یو شانی! آئی لو یو.....“

وہ منہ چھپا کر بولی۔ ”آج سے پہلے کبھی بھی اس پپ کی آواز اچھی نہیں لگی۔“
وہ مسکرایا۔ ”تمہارے باپ کو تو شاید آج بھی بری لگی ہوگی۔“

وہ چونک کر اُس کی جانب مڑ آئی۔ شکوہ کنٹان نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”رنگ میں بھنگ ڈالنے کی عادت بہت بری ہوتی ہے۔ وہ اب صرف میرے ہی نہیں، تمہارے بھی پایا ہیں۔ اُن کا نام ادب سے لیا کرو۔ اگر وہ نہ مانتے تو شاید.....“

وہ بولا۔ ”اُن کے نہ ماننے پر بھی میں تمہیں حاصل کر لیتا۔“
”یہ کس نے کہا ہے کہ تم نے مجھے حاصل کیا ہے؟“ وہ شرارت سے بولی۔ ”دل سے پوچھو۔ وہ بھی کہے گا کہ تم نے نہیں، میں نے تمہیں پایا ہے۔“

”اچھا بابا مان لیتا ہوں کہ تم نے ہی سب کچھ کیا ہے۔“ وہ اُس کی ننھی سی ناک کو پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایک بات تو بتاؤ۔ تم نے اپنے باپ کو شادی پر رضامند کیسے کیا؟“
وہ آنکھیں بند کئے جھوٹے جھوٹے سانس لیتی رہی۔ شاید دل میں کوئی فیصلہ کرنے لگی تھی۔ وہ بولا۔ ”اب بول بھی پڑو۔“

آنکھیں پوری کھول کر اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پہلے تم ایک سوال کا جواب دو۔ تمہیں میرے پاپا سے اتنی نفرت کیوں ہے؟“

وہ بولا۔ ”مجھے تمہارے باپ سے نہیں، اُس جیسے ہر سیاسی فرعون سے نفرت ہے۔ مجھے یہ جھوٹے لوگ اچھے نہیں لگتے۔ پیٹ پالنے کیلئے مجبوراً تمہارے باپ کے پاس کام کر رہا ہوں۔“

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ وہ غیر متوقع ردِ عمل پر حیران ہو کر بولا۔ ”کیا مصیبت ہے؟ میں نے تمہیں کوئی لطیفہ سنایا ہے جو یوں منہ پھاڑ کر ہنسنے لگی ہو؟“
وہ بدقت تمام ہنسی روک کر بولی۔ ”جھوٹے کو جھوٹ بولنے والے لوگ پسند نہیں

ہے نا؟“
”کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔ ”میں جھوٹا ہوں؟“

”تمہیں تو کسی بات کا علم نہیں ہے۔ میں اور وہ..... دونوں ہی تمہارے جھوٹ پر جھوٹ
سننے رہے اور آنکھیں بند کر کے یقین کرتے رہے۔“

یوں لگ رہا تھا جیسے عالمگیر کا اپنے قلب و بدن پر اختیار نہیں رہا تھا۔ مشینی سے انداز میں
بولاً۔ ”تم اور کیا کچھ جانتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”بتاؤں؟“

”ہاں!“

”سننے کا حوصلہ رکھتے ہو؟“

”پلیز! کہتی رہو۔ مجھ میں بڑا حوصلہ ہے۔“

”پاپا گزشتہ کئی برسوں سے تم ماں بیٹا کو تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ میں اُن کی
واحد راز دار تھی۔ ماما کو انہوں نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ جب انہیں تمہارا پتہ چلا، تم اُس
وقت دہرے قتل کے ثابت شدہ جرم پر موت کی سزا پا چکے تھے۔ انہوں نے بڑی سرکاری
منت ساجت کی۔ تمہیں چھڑانے کیلئے اپنی سیاسی پارٹی بدلی۔ بڑی سرکار نے اُن کا رابطہ
جیل سے کرایا۔ تمہیں چھڑا کر یہاں لے آئے۔ وہ دل میں ڈرتے تھے کہ اگر تمہیں اُن کی
اصلیت کا پتہ چل گیا تو تم منتقم مزاحی میں کوئی بڑا قدم اٹھا بیٹھو گے۔ اور کچھ نہ کر سکے تو دور
نکل جاؤ گے۔“

وہ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئی۔ وہ بولا۔ ”رُکومت۔ بولتی رہو۔“

”وہ اپنے بھائی کو قتل کرنے پر بہت پچھتاتے تھے۔ میں نے انہیں اپنے بھائی کی تصویر
کوینے سے لگا کر آدھی آدھی رات تک روئے دیکھا ہے۔ وقت اُن کے ہاتھ سے نکل گیا
تھا۔ نکلے ہوئے وقت پر اُن کا رونا مجھے گراں گزرتا رہا اور میں اُن کے آنسو پونجھتی رہی۔
تمہیں یہاں لے آنے کے بعد کبھی نہیں روئے۔ انہوں نے مجھے صاف صاف کہہ دیا تھا
کہ تمہاری شادی عالمگیر سے ہوگی۔ کب اور کیسے؟ یہ فیصلہ وقت اور قسمت پر چھوڑ دیا گیا
تھا۔ میں نہیں مانتی تھی۔ ماما نے بھی اِس فیصلے کی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اتنی
بڑی جائیداد کو کسی غیر کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے بھی اُن کے خیال کے مطابق اِس
تمام دولت پر تمہارا حق بنتا ہے۔“

کچھ توقف آیا۔ تھک گئی تھی۔ گلا خشک ہونے لگا تو اٹھ کر پانی پینے لگی۔ عالمگیر نے

وہ ہنسنے لگی۔ قریب ہو کر اُس کی جھولی میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ بولی۔ ”اِس لئے کرتم
میرے مرحوم چچا محمد خان کے بیٹے ہو۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارے باپ کو زمین کے
حصول کیلئے پاپا نے خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔ تم اور تمہاری ماں دونوں بھاگ جانے میں
کامیاب ہو گئے تھے۔“

وہ جھولی میں سر رکھ کر لیٹی ہوئی اُس قلبہ جاں کو دیکھنے لگا جس نے بڑے عام سے لہجے
میں اُس کو سرعام ننگا کر دیا تھا۔ وہ اب تک یہی سوچتا چلا آ رہا تھا کہ سردار فضل سمیت گھر کا
ہر فرد اُس کی اصلیت سے بے خبر ہے۔ بے خبری اُس کیلئے فائدہ مند تھی۔ خبر نقصان دہ تھی۔
وہ ہکلا کر بولا۔ ”تت..... تم اور کیا جانتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ تم جھوٹے ہو یا نہیں ہو؟“

وہ خاموش رہا تو پھر آنکھیں پوری کھول کر اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم نے کہا تھا کہ
تمہیں ہر سیاسی شخص سے نفرت ہے، صرف پاپا سے نہیں۔ اب بتاؤ ناں مجھے! کیا تم اپنے
باپ کے قاتل سے نفرت نہیں کرتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”ہاں! میں جھوٹا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”یہ اعتراف بھی کر لو کہ تمہاری محبت بھی جھوٹی ہے۔“

وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں۔ میری محبت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔“

وہ بولی۔ ”تو سنو! تم سمجھتے ہو کہ پاپا کو اپنے سیاسی حریفوں کی چالوں کا جواب دینے
کیلئے تمہاری ضرورت تھی بھی انہوں نے تیس لاکھ روپے جیلر کو دے کر تمہیں جیل سے نکالا
اور تین چار لاکھ روپے خرچ کر کے تمہارے کاغذات بنوائے۔ ہے ناں؟ تم نے یہ نہیں سوچا
کہ اتنی بڑی رقم خرچ کر کے وہ تمہارے جیسے دس بندے خرید سکتے تھے۔ تم سمجھتے ہو وہ
تمہاری قابلیت اور دلیری کے باعث تم پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ تم نے یہ خیال نہیں کیا کہ
کتنے تعلیم یافتہ جوان ہاتھوں میں بڑی بڑی ڈگریاں تھامے ہماری کوٹھی کے چکر پر چکر لگاتے
رہتے ہیں اور پاپا کے پاس اُن سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا۔“

وہ سانس لینے کیلئے رُکی پھر گیا ہوئی۔ ”تم سمجھتے ہو کہ انہیں تمہاری بہادری اور وفاداری
پر اعتماد تھا اِس لئے انہوں نے تمہیں میری حفاظت کیلئے لاہور بھیجا۔ یہ کام تو دوسرے لوگ
بھی کر سکتے تھے۔ مگر تمہیں یہ علم نہیں ہے کہ وہ سوچتے تھے کہ خون کیلئے خون ہی جوش مارنا

چپائیں مگر ایک بات ہے..... میں نے محبت میں کوئی کھوٹ نہیں رکھی۔ کوئی ملاوٹ نہیں کی۔
وہ چپ کر اُس سے لپٹ گئی۔ اُس کے برہنہ کندھے پر اپنے سرخ ہونٹ رگڑ کر لپٹا۔ ایک اتار تے ہوئے بولی۔ ”جیسے محبت کو میرے ہونٹوں پر جی ہوئی لپ اسٹک گوارا نہیں ہوتی اور اس کی تہہ کو اتار دیتی ہے ایسے ہی تم بھی خود کو جھوٹ کی لائٹوں سے پاک کر دو۔
میں جھوٹ نہیں بولتی، پرسکون رہتی ہوں۔ اپنا دکھ تمہارے حوالے کر کے مطمئن ہو جاتی ہوں۔ تم بھی ایسا ہی کیا کرو۔ اور ہاں! اگر تم جھوٹ بھی بولو تو مجھے یقین آ جائے گا۔ سچے دل سے نہ سہی، جھوٹی زبان سے ہی مجھے محبت کے اقرار کا ٹانک پلاتے رہو تو میں شانت اور فوری رہوں گی۔“

عالمگیر کے پاس کوئی دلاسہ، کوئی یقین یا کوئی سچ نہیں تھا جسے اپنی محبوبہ کی سماعت میں ابر کرتا تھی دامن کی عالم میں اپنی آنکھیں موندے لیٹا رہا۔ دل میں گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت کچھ ہو چکا تھا، بہت کچھ ہونے والا تھا۔ کیا؟ یہ پتہ نہیں چلتا تھا۔

اُس کی زلفوں سے کھیلے ہوئے بولا۔ ”تم ایک بات مانو گی؟“
”نہ ماننے کی ہوئی تب بھی مان لوں گی۔“ وہ اُس کی نقل کرتے ہوئے بولی۔
وہ مکر کیا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”تم میری اجازت کے بغیر اپنے باپ کو نہیں بتاؤ گی کہ اُسے مجھے سب کچھ بتلا دیا ہے۔“

”اُس سے کیا ہو گا؟“
”تم دیکھ لو گی۔“
”پھر بھی؟“

اُس کا ذہن بدلنے کو بولا۔ ”پرسوں لوکل باڈیز کے انتخابات ہیں۔ ملک فرید کے بیٹے کے مقابلے میں کوئی کھڑا نہیں ہوا اور وہ بلا مقابلہ جیت چکا ہے۔ سنا ہے کہ وہ اتوار کو اپنے بیلک امجد کی شادی چوہدری باسط کی بیٹی بتول سے کر رہا ہے۔ کیا اُس نے سردار فضل کو دیکھا ہے؟“

”سردار فضل نہیں۔ پاپا!“

ہاتھ کے اشارے سے پانی مانگا۔ اُس کیلئے پانی بھر لائی۔ وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گیا۔ بولا۔ ”تم بات جاری رکھو۔“

وہ اُس کے گھٹنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بولی۔ ”وہ چاہتے تھے کہ میری اور تمہاری شادی ہو جائے تو وہ سیاست سے ریٹائرمنٹ لے کر گوشہ نشین ہو جائیں۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ جوانی میں بھائی کی کمی کا احساس زیادہ قوی نہیں تھا۔ بڑھاپے اور بیڑی کی کمی میں بھائی کے قتل نے پشیمانی اور دکھ کے احساس کو حد سے متجاوز کر دیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے مجھے تاکید کرتے تھے کہ عالمگیر کو شادی پر رضامند کرو۔ میں نہیں مانتی تھی۔ تمہیں قریب سے دیکھا تو مجھے بھی اُن کا ہم خیال ہونا پڑا۔ تم محبت کرنے اور چاہے جانے کے لائق انسان ہو۔ اور ہاں! پاپا نے تمہارے باپ کی زمین اپنے نام نہیں کرائی۔ اُس زمین کی آمدنی کو جمع کرتے رہتے، پھر اُس سے زمین خرید لیتے۔ یوں تمہاری ورثاتی زمین میں تین مربعوں کا اضافہ ہو چکا ہے۔ انہوں نے تو تمہاری یہ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ تمہارے باپ کی زمین کو اپنے نام منتقل کرانے کیلئے انہیں علم دین کو پولیس مقابلے میں مردانا پڑا۔ جب اُن کے نام ہو گئی تو انہوں نے تمام اراضی تمہارے نام کرادی۔ وہ اپنے باپ کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ اب وہ مطمئن ہیں کہ انہوں نے تمہاری محرومیوں کا مداوا کر دیا ہے۔ اُن کے پاس ایک ہی قیمتی شے تھی..... میں..... مجھے تمہارے حوالے کر کے شاد اور مطمئن ہو گئے ہیں۔“

اُس کی ساری خوش فہمیاں آن کی آن میں ریت کے گھروندے کی طرح سمار ہو گئی تھیں۔ لیٹ کر آنکھیں موند کر سوچنے لگا۔ سردار فضل کا چہرہ بار بار اُس کی نظروں میں چکرانے لگا۔ وہ کیا تھا؟ وہ کیا سمجھتا رہا اور نکلا کیا؟..... جس سے سب کچھ چھین کر حساب برابر کرنا چاہتا تھا، وہ پہلے سے ہی دینے پر تیار بیٹھا تھا۔ پھر اُس کی تمام تر محنت کیا ہوئی؟ اگر وہ کچھ بھی نہ کرتا تو یہ سب کچھ اُسے ملنا ہی تھا۔ اُس نے جو کیا غلط کیا تھا۔ ساری محنت رائیگاں گئی۔ یہی سوچ اُسے پریشان کئے دے رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”کیا تمہارے باپ کو یہ ڈر نہیں تھا کہ مجھے جو نہی پتہ چلے گا، میں اُسے قتل کر دوں گا؟“

”ہاں! انہیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ تم کوئی بھی جذباتی قدم اٹھا سکتے ہو۔ میں نے بھی انہیں بار بار سمجھایا مگر وہ نہیں مانے۔“
وہ بڑبڑایا۔ ”ہاں شانی! میں جھوٹا نہیں، بہت بڑا جھوٹا ہوں۔ میں نے تم سے کئی باتیں

بیٹھا ہوا ہوں۔ میری انگلی کی ذرا سی جنبش تمہارے پورے خاندان کے پر نچے اڑا سکتی ہے۔“ تھرڈ مین نے بڑے سفاک لہجے میں کہا۔

سردار نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ گرے رنگ کی کار دو تین سو فٹ کے فاصلے پر دوڑتی آرہی تھی۔ سردار کی آنکھوں میں موت کی دشت ناچنے لگی۔ گھبرا کر باری باری نینوں کو دیکھنے لگا۔ عالمگیر نے عقب نما میں جھانک کر دیکھا۔ سردار کی متغیر حالت دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے سردار؟ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟“

سردار نے جواب دینے کی بجائے فون کا ڈائریکٹر آن کر دیا۔ تھرڈ مین کی بھاری سخت آواز گاڑی میں گونجنے لگی۔ ”سردار! تم جواب کیوں نہیں دیتے؟..... کیا موت کے خوف سے گھکی بندھ گئی ہے تمہاری؟“

چاروں فون کی طرف متوجہ تھے۔ سردار نے کہا۔ ”خدا کیلئے ایسا مت کرو۔ میں سیٹھ سبحانی کی ہدایات پر عمل کروں گا۔“

عالمگیر نے فون کے قریب منہ کر کے کہا۔ ”ابے کتے! کیا دھمکیاں دیتا ہے؟“ تھرڈ مین نے اپنے بات دہرائی۔ دھمکی دی۔ ”تم چھلانگیں لگانے کی کوشش بھی مت کرنا گاڑی میں نصب شدہ بم پچاس فٹ تک مار کرتا ہے۔ تمہارے پُرزے ہوا میں میلوں دور تک بکھر جائیں گے۔“

عالمگیر کی آنکھوں سے پریشانی مترشح ہونے لگی۔ بولا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“ ”تم گاڑی کو سردار کے خفیہ ٹھکانے پر لے چلو۔ دریا کے کنارے واقع مٹرک حویلی میں۔ باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔“ تھرڈ مین نے کہا۔ ”اس زعم میں مت رہنا کہ وہاں تمہارے ساتھی موجود ہیں۔ وہ سب ناگئیں تھوڑا کر سنور میں بند پڑے ہیں۔“

چاروں کو حالات کی سنگینی کا شدت سے احساس ہوا۔ شانی نے گھبرا کر عالمگیر کا بازو پکڑ لیا۔ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اب کیا ہوگا عالمگیر؟“ عالمگیر بولا۔ ”خاموش رہو، مجھے سوچنے دو۔“

حویلی کے مرکزی دروازے پر جونہی جیپ رُکی، تین چار گن بردار ڈھانٹا پوش بندے گاڑی کے اطراف میں کھڑے ہو گئے۔ گنوں کی ٹالیوں کا رخ جیپ سے اُترنے والوں کی طرف تھا۔ جیپ کے عقب میں گرے کار رُک گئی۔ واپسی کا راستہ مسدود ہو گیا۔ اُس میں

”چلو پاپا ہی سہی.....“

دہ بولی۔ ”ہاں! اُن کا شادی کارڈ موصول ہوا تھا۔ ماما کہہ رہی تھیں کہ امجد کی مہندی پر مجھے خصوصی طور پر اُنہوں نے بلایا ہے۔“ دہ بولی۔

”تم جاؤ گی؟“

”ہاں! اگر تمہیں برا نہ لگا تو.....“

”مجھے کیوں برا لگے گا؟“

”شوہر بہت بگڑی ہوئی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب جی چاہا، مین لگا دیا۔ جب جی چاہا نواز دیا۔“ اُس کی آواز میں شرارت، بے خودی اور دعوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔

”یہ بات ہے؟“ دہ پچل گیا۔ اُسے یکبارگی سے یاد آیا کہ وہ شوہر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کا حقیقی کزن بھی ہے۔



سردار فضل اپنی بیوی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ دیکھنے والے مُردنی کو سنجیدگی سے تعبیر کر رہے تھے۔ بڑی فور ویل جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر عالمگیر جبکہ اُس کے برابر شانی براجمان تھی۔ سبھی تیاری کر کے ملک امجد کی رسم حنا میں شرکت کیلئے جا رہے تھے۔ سردار فضل کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ صبح سے کئی مرتبہ انگلیوں پر حساب لگا کر یقین کر چکا تھا کہ آج اتوار کا دن تھا۔ سیٹھ داؤد سبحانی کی دی گئی مہلت کا آخری دن تھا۔ بڑی سڑک سے اُتر کر لنک روڈ پر چڑھے تو سردار کے فون کا بزر بول پڑا۔ سردار نے نمبر دیکھا۔ تھرڈ مین کا نمبر دیکھ کر تیوری چڑھ گئی۔ فون آن کر کے بولا۔ ”میں سردار فضل بول رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”سردار! تمہیں دی جانے والی مہلت ختم ہو چکی ہے۔ داؤد سبحانی نے اپنا پروگرام بدل دیا ہے۔“

سردار نے اطمینان کا سانس لیا، بولا۔ ”اب کیا کہتا ہے وہ؟“

”تمہاری خوبصورت چمکتی دکتی گاڑی میں بہت طاقتور بم فٹ کر دیا گیا ہے۔ اس بم کا ریموٹ میرے ہاتھ میں ہے۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے آنے والی گرے کلر کی ٹویوٹا کار میں

سے صرف ایک آدمی برآمد ہوا۔ اُس کا چہرہ کھلا تھا۔ اُسے سردار سمیت کسی نے بھی پہچانیں
دیکھا تھا۔

وہ گنوں کے سائے میں حویلی کے صحن تک پہنچے۔ سردار قطعی طور پر خاموش تھا۔ شانی
عالمگیر سے چٹ کر گھسٹ رہی تھی۔ ہر کوئی اپنے طور پر حالات کی داس کروٹ کے بارے
میں سوچ رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی سرانہیں آ رہا تھا۔ صحن میں پہنچ کر ڈھانا پوشوں
نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ دو آدمیوں نے شانی اور اُس کی ماما کو پکڑ کر ایک طرف کر لیا۔
سردار اور عالمگیر کو صحن کے وسط میں ہینڈز آپ کرادیا۔ سردار کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر
منظر دھندلایا ہوا تھا۔

شانی کو بڑے کمرے کی سلاخوں والی کھڑکی میں تائیلون کی رسی سے مضبوطی سے باندھ
دیا گیا۔ اُس کی ماما کو ستون کے ساتھ کھڑا کر کے باندھنے کے بعد ایک بندہ بڑے کمرے
میں سے مٹی کے تیل کی کین اٹھا لایا۔ بڑی سرعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس نے دونوں
کو تیل میں بھگو دیا۔ پھر ارد گرد تیل کا چھڑکاؤ کرنے لگا۔ دوسرا آدمی حویلی کے کمروں میں
تیل چھڑکنے لگا۔ سردار بھی پھٹی آنکھوں سے نہ سمجھ میں آنے والے منظر کو دیکھ رہا تھا۔

ایک ڈھانا پوش نے برآمدے میں کھڑے ہو کر اطلاع دینے کے سے انداز میں کہا۔
”ماسٹر! کام مکمل ہو چکا ہے۔ سیٹ لگا دیا گیا ہے۔ اب تم اپنی شوٹنگ مکمل کرو سکتے ہو۔“
اچانک سبھی کارندے پوزیشنیں بدل کر محفوظ ہو گئے۔ گنوں کی تالیاں دکھائی دے رہیں
تھیں۔ عالمگیر نے اونچی آواز میں کہا۔ ”میں موت سے نہیں ڈرتا۔ تمہیں ڈراتا ہوں کہ اپنی
اس اوجھی حرکت سے باز آ جاؤ ورنہ ساری عمر پچھتاتے رہو گے۔ مردوں کی لڑائی میں
عورتوں کو ریغمال بنانے والے اور اُن پر گولیاں چلانے والے بزدل ہوتے ہیں۔ تم میں
ہمت ہے تو سامنے آؤ۔ مردوں کی طرح پنجہ آزمائی کرو۔“

ایسے میں سردار کے پیروں کے قریب ایک ریوالور آن گرا۔ دونوں نے چونک کر
ریوالور کی طرف دیکھا۔ دشمن کا قہقہہ بلند ہوا۔ ”سردار فضل خان! کیا دیکھتے ہو؟ یہ ریوالور
ہے۔ اس میں صرف دو گولیاں ہیں۔ ایک گولی پر تمہاری بیٹی کا نام لکھا ہوا ہے۔ دوسری پر
تمہاری بیوی کا نام لکھا ہے۔ ریوالور اٹھاؤ اور دونوں کے سینوں میں ایک ایک گولی اتار دو۔
سینھ داؤد سبحانی کا حکم ہے کہ اگر تم دونوں کو اپنے ہاتھ سے گولی مار دو تو تمہاری جان بخشی

کر دی جائے گی۔ ورنہ تمہیں تمہارے داماد سمیت گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔“
سردار کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے عالمگیر کی طرف دیکھا۔ اُس کی
مالت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے جھک کر ریوالور اٹھایا۔ ارد گرد دیکھا۔
آنکھوں سے بے بسی مترشح تھی۔ ہولے ہولے ریوالور والا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا، نالی کا رخ
اُس کی بیوی کی طرف ہوا۔ بیوی نے چیخ کر کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو۔ میں تمہاری جان سے
پیاری بیوی ہوں۔ عمر بھر جس سینے پر کان رکھ کر دل کے نغے سنتے رہے ہو، اُسی سینے کو چھلتی
کر دے؟ کوئی بیوی کو بھی گولی مارتا ہے کیا؟“

سردار کا ہاتھ جھک گیا۔ دوسری مرتبہ بلند ہوا تو اُس کی نال کا رخ بیٹی کی طرف تھا۔ بیٹی
کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ باپ کی محبت پر یقین تھا۔ باپ کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں
ذبے ریوالور کی ہلاکت خیزی کا بھی علم تھا۔ روتے ہوئے بولی۔ ”پاپا! زندگی آپ کی دین
ہے۔ آپ کے ہاتھوں موت آئے، اس سے بڑی خوشی کی کوئی بات نہیں۔ ماما کے حصے کی
گولی بھی میرے سینے میں اتار دیجئے۔“

ہاتھ جھک گیا۔ سرب بھی جھک گیا۔ سوچنے لگا۔ ”سبحانی اتنا احمق نہیں ہے کہ مجھے زندہ چھوڑ
دے۔ خدا جانے اُسے کیا دشمنی ہے مجھ سے؟“

خاموشی طاری تھی۔ کوئی بول نہیں رہا تھا۔ سردار نے ارد گرد دیکھا۔ گنوں کی تالیاں اُس
کائنات لے دکھائی دے رہی تھیں۔ اُس نے عالمگیر سے کہا۔ ”مجھے یقین ہو گیا ہے کہ
انہوں نہیں رہوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد تمہیں زندہ چھوڑ دیا جائے۔“

عالمگیر نے کہا۔ ”اُن لوگوں نے شانی اور ماما پر تیل چھڑک دیا ہے۔ وہ اُن کی گریں
کو لے کر بجائے ایک دیا سلائی جلا کر معاملہ ختم کر دیں گے۔“

سردار کا ریوالور والا ہاتھ ایک بار پھر ہوا میں بلند ہوا۔ اپنی کپٹی پر رکھتے ہوئے بولا۔
”عالمگیر! مجھے سچے دل سے معاف کر دینا۔ اگر فوج جاؤ تو شانی کو بچانے کی کوشش کرنا۔ میں
اُس پر ہوا ہے میں شانی اور تمہاری موت کا دکھ برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تم لوگ
میں مار دیے جاؤ گے مگر میری آنکھ یہ قیامت کا منظر دیکھنے سے پہلے بند ہو جائے گی۔“

شانی اور ماما بلند آواز میں چیخنے لگیں۔ سردار نے آنکھیں بند کر لیں۔ زیر لب کچھ پڑھا

ٹریج..... ٹریج.....

ہم سکت کھڑی شانی کے پاس آیا اور بولا۔ ”جان عالمگیر! اس ڈھیر میں ہر وہ ڈسک اور قلم موجود ہے جو تمہیں ملاتی رہی ہے۔ اس میں ہر وہ فائل اور ثبوت پڑے دیاسلانی کے منظر ہیں جو تمہارے باپ کو آسمان سے زمین پر لاٹختے ہیں۔ یہ تھوڑی دیر کے بعد جل جائیں گے۔“

چھاننی کی ہوئی چیزیں ایک شاہنگ بیگ میں ٹھونٹے ہوئے وہ سب کو لے کر باہر گاڑی میں آگیا۔ گرے رنگ کی گاڑی کو اس کے ساتھیوں نے پیچھے ہٹا کر اسے راستہ دیا۔ کچھ واسطے پر پہنچ کر اس نے گاڑی روکی۔ اتر کر حویلی کی طرف گیا۔ بڑے دروازے کو دیاسلانی دکھاتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”اے تپانے والی آگ! آج سب کچھ جلا کر میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دے، میرے سر پر ٹھنڈا پانی انڈیل دے۔“

لکڑی کے مین گیٹ نے ست رفتاری سے آگ پکڑنا شروع کر دی۔ چار پانچ منٹ کے دورانے میں آگ پھر کر پوری حویلی سے لپٹ چکی تھی۔ آگ کی تپش نے اس کے چہرے کو سرخ کر دیا تھا۔ ایسے میں وہ ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہر بار آگ سے نکل آتی تھی۔ آج نکلتی ہوئی دکھائی نہیں دی تو سوچ میں پڑ گیا۔ ”کہیں کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی؟ اندر کوئی رہ تو نہیں گیا؟“

اپنے ساتھیوں کو گنا۔ کوئی بھی کم نہیں تھا۔ آگ کے سرخ اور پیلکوں شعلوں پر نظر نہائی۔ ماں دکھائی نہیں دی تو بے بسی سے دل ہی دل میں اسے پکارنے لگا۔ وہ اچانک سامنے آگئی۔ آج اس کے جھریوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے قریب آگئی۔ اس کے تپتے ہوئے رخساروں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں چومنے لگی۔ دیوانہ وار خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میرے علم دینے! اللہ کا شکر ہے کہ تو نے عالمگیر کے ہمراہ کو جلا دیا۔ میری روح کو قرار آ گیا ہے۔ تو واقعی بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ تیری لگن میں میرے خان کا خون دوڑتا ہے۔ تو حرامی نہیں، حلالی ہے۔ اپنے باپ کے قاتل کو معاف کر کے، قاتل کی بیٹی کو سینے سے لگا کر تم نے مجھے پرسکون کر دیا ہے۔ میں چلتی ہوں۔ برا کام ختم ہو گیا ہے۔ اللہ تجھے اپنی امان میں رکھے!“

وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔ وہ آتش زدہ حویلی کے بڑے گیٹ میں جا کر چند ٹانے کیلئے لگا۔ پلٹ کر ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔ ”تیرا باپ برسوں سے میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں

سردار کی آنکھیں فرط خوف سے پھیل چکی تھیں۔ اسے کافی دیر تک پتہ ہی نہیں چلا کہ ریوالور کی نال میں سے دونوں مرتبہ کوئی گولی نہیں نکلی تھی اور نہ ہی فائر کی آواز سنائی دی تھی۔ شانی اور ماما آنکھیں اور منہ پھاڑے آشفگی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھیں۔

پورا ایک منٹ گزر گیا۔ سردار کا ہاتھ اپنے سے تر تھا۔ نہایت آہستگی سے اس نے ریوالور والا ہاتھ نیچے کیا۔ ریوالور کو دیکھا۔ یقین ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ گولی نہیں چلی تھی۔ اس نے دیوانگی کے عالم میں برق رفتاری سے ریوالور اپنے سینے کی جانب سیدھا کر کے ڈیر دیا۔ کچھ نہیں ہوا۔ وہ بار بار لہلی دباتا جا رہا تھا۔ پھر ریوالور پڑے پھینک کر ارد گرد دیکھنے لگا۔ ٹانگیں جواب دے گئیں۔ ہمت ٹوٹ گئی۔ لہرا کر گھٹنوں کے بل زمین بوس ہو گیا۔ چوپائے کی طرح سر جھکا کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پھر آہستگی سے ڈھے گیا۔

ایسے میں اچانک بساط پلٹ گئی۔ ڈھانٹا بردار چھلانگیں لگا کر مورچوں سے باہر نکل آئے۔ عالمگیر کے پاس آ کر اپنے ڈھانٹے کھول کر چہرے جھنکے کرنے لگے۔ شانی اور ماما کی تحیر تا کی دیدنی تھی۔ ان کے منہ سے کچھ نکل ہی نہیں رہا تھا۔ ایک کارندہ دوڑ کر شانی کے پاس آیا۔ اس کی رسیاں کھولتے ہوئے بولا۔ ”بھائی! دونوں ہاتھ جوڑ کر گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ مجبوری تھی۔ ہم مرتے دم تک عالمگیر کی حکم عدولی نہیں کر سکتے۔“

دوسرا ماما کی طرف بڑھا۔ رسیاں کھول کر بولا۔ ”تم عالمگیر کی ساس ہو، ماں ہو، ہم سب کی ماں ہو۔ میں اپنے بھائی بندوں کی طرف سے معذرت کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ مجبوری کی حالت میں کیا گیا۔“

عالمگیر نے سردار کا معائنہ کیا۔ اطمینان سے سر ہلا کر بولا۔ ”تم دونوں انہیں اٹھا کر باہر گاڑی میں لے جاؤ۔ ہم آ رہے ہیں۔“

وہ سردار کو اٹھا کر باہر چلے گئے۔ عالمگیر کے اشارے پر ایک آدمی بڑے کمرے میں گیا اور ایک بڑا سا اٹیچی کیس اٹھائے باہر نکلا۔ عالمگیر نے برآمدے کے فرش پر اٹیچی کھول کر الٹ دیا۔ اس میں سے بہت سی فائلیں، ڈیوی کیٹیں اور ڈیوی ڈسکیں برآمد ہوئیں۔ بیروں کے بل زمین پر بیٹھ کر کچھ چیزیں چھاننی کر کے الگ کیں۔ باتوں پر تیل چھڑک دیا۔ ایک

”نہیں..... تمہارا غصہ اتر گیا؟“

”ہاں.....“

وہ رخ پھیر کر بولی۔ ”معاف کر دینے والے بڑے عظیم لوگ ہوتے ہیں۔ آج تک سنا ہے، دیکھا نہیں۔ دیکھنے کا موقع ملا تو شاید نظر ہی کچی نکلی، عین موقع پر دھندلا گئی۔“

تیزی سے اُس کی طرف پلٹ کر بولی۔ ”شاپنگ بیگ میں کس کی فلمیں ہیں؟“

وہ بولا۔ ”تول کی۔ سوچا اُسے بھی لگے ہاتھوں آزادی کا پروانہ دیے جاؤں۔ مجھ پر شک نہ کرو۔ میرے قصائی کے کہنے پر میں نے چوہدری باسط کے دشمنوں کے چنگل سے نکالی ہیں۔“

وہ جو کچھ پوچھنا چاہتی تھی، پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بدقت تمام بولی۔ ”تو کیا یہ سارا ذرا ماتم نے.....“

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ”نہیں..... صرف آج کی قسط کا سکرپٹ میں نے لکھا تھا۔ اس سے پہلے جو کچھ ہوا، اُس میں میرا کوئی کردار نہیں تھا۔“

اُس نے گاڑی روک دی۔ منہ پھیر کر بیٹھی ہوئی مہارانی سے ملتی جلتی انداز میں مخاطب ہوا۔ ”شانی! بازو ادھر کرو۔“

اُس نے بلا سوچے سمجھے بازو اُس کی طرف بڑھا دیا۔ عالمگیر نے کف ہٹانا چاہا تو چونک پڑا۔ شانی کا لباس مٹی کے تیل سے گھلا ہو چکا تھا۔ مسکرا کر کف ہٹانے لگا۔ تیل پر نظریں جمائے بے خود ہوتا گیا۔ بڑی ہی آہستگی سے اُس نے اپنے ہونٹ تیل زدہ تیل پر رکھ دیے۔

ایسے میں سردار فضل خان نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر خالی الذہنی کی کیفیت میں ڈوب رہا۔ چند لمحوں بعد ماحول سے شناسائی کی لہر آنکھوں میں ابھری۔ عالمگیر کو دیوانوں کی طرح تیل چوستے دیکھ کر بولا۔ ”عالمگیر! یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

عالمگیر نے جلدی سے شانی کا بازو چھوڑ دیا۔ سوال کرنے والے کو چند ساعتوں تک عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”زندگی میں پہلی مرتبہ تمہیں انکل کہہ کر بات کرنے چلا ہوں۔ انکل! تمہاری بیٹی نے اگر مجھے تمہاری ندامت اور پچھتاوے کے بارے میں بدوقت نہ بتایا ہوتا تو ریوا لور خالی نہ ہوتا۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔“

اُس کا سامنا کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اُسے کیا بتلاتی کہ میں نے اُس کے علم دین کو عالمگیر جیسا قاتل اور خونی بنا دیا؟ اب اُس کا سامنا کر سکتی ہوں۔ اُسے فخر سے بتلا سکتی ہوں کہ اُس کے بیٹے کو آگ کے شعلوں کے مہیب بطن سے نکال کر علم دین بنا آئی ہوں۔ میرے علم دین! میرے خان کی جان! اللہ بلی!“

وہ بلی۔ دروازہ عبور کر کے آگ میں غائب ہو گئی۔

عالمگیر نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں میں اتر آنے والے دھکے کے آنسوؤں کو صاف کیا۔ پلٹ کر گاڑی میں آ کر بیٹھا اور گردن موڑ کر حویلی کے چلے ہوئے دروازے کو دیکھنے لگا جس میں داخل ہو کر ماں ہمیشہ کیلئے اوجھل ہو گئی تھی۔ ہاتھ کے اشارے سے بشیر خان پاس بلایا۔ ”بشیر خان! تم نے مجھ پر اتنے احسانات کئے ہیں کہ میں کسی ایک کا بھی بدلہ نہیں چکا سکتا۔ تم اپنے ساتھیوں کو لے کر بیلے کی طرف نکل جاؤ۔ ایک ہفتے کے بعد کوٹھی پر آ جانا۔ میں نے تمام بندوبست کر رکھا ہے۔ کچھ کمی ہے، وہ بھی ایک ہفتے میں پوری کر لوں گا۔“

بشیر خان کے پیچھے پیچھے شریلی پہنچ گیا۔ بولا۔ ”عالمگیر! تم نے وعدہ کیا تھا کہ.....“

عالمگیر اُس کی بات رُسان سے کاٹ کر بولا۔ ”میں نے کہا ناں کہ ایک ہفتے کے بعد میرے پاس چلے آنا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے حصے کی تمام زمین تم لوگوں میں بانٹ دوں گا۔ تمہیں عزت کی روٹی چاہیے اور ایک چھوٹا سا پرسکون گھر چاہیے۔ ہے ناں؟.....“

ملے گا۔ محنت کرنا، اپنے لئے بیویاں ڈھونڈنا..... جتنا پیسہ بھی لگے گا، میں لگاؤں گا اور تمہیں حلال روزی کمانے والا کاشتکار بناؤں گا۔ او۔ کے؟“

”او کے!“

گاڑی اسٹارٹ کر کے سڑک پر ڈالتے ہوئے بیک مرر میں سردار فضل خان کو دیکھنے لگا۔ وہ بے ہوش پڑا تھا۔ بیوی اپنے شوہر کے ہاتھوں کو سہلا رہی تھی۔ زیر لب اپنے سانس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اُس نے مسکرا کر اپنی جان سے پیاری ہستی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”شانی! تکلیف دینے پر دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی طلب کرتا ہوں۔“

وہ کچھ نہیں بولی۔ سر جھکا کر انگلیاں پچھاتی رہی۔

وہ بولا۔ ”ناراض ہو؟“

سردار کی پھنسی پھنسی آواز سنائی دی۔ ”یہ تو تم نے بہت بڑا احسان کیا جو معاف کر دیا۔ جب معاف ہی کرنا تھا تو پھر یہ نالک کیوں کیا؟“

”صرف درد آشنائی کیلئے!“ عالمگیر نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تمہیں تمہاری زندگی میں اُس دُکھ اور بے بسی سے روشناس کرانا ضروری تھا جو تمہارے بڑے بھائی محمد خان نے تمہارے ہاتھوں جھیلا تھا۔ جس بے بسی اور لاچارگی کو اُس نے مرنے سے پہلے محسوس کیا تھا، تم نے بھی محسوس کر لیا ہے۔“

دیوانہ وار دیکھتی ہوئی شاہانہ پر ایک عجیب سی نگاہ ڈالی اور ایکسپلریٹر پر پاؤں کا زور بڑھا دیا۔

(تمت بالخیر)